U32678. P -

Title - CHARAGH-E-MEHFIL-E-FASAHAT 1941

Creator - Pandit Radhe Nath Kaul Gulshan.

Publisher - Maghoob Al Tabe (Allahabad).

Date - 1360 H.

Pages - 288.

Subject - Urdu Adab - Tanqeed; Hindustani culture Tanqeed; Aab-E-Hayaat - Tanqeed; Tasawwuf; Urdu Shayari; Makhloot Zuban; Shayari Allahabad Hyderabad - Urdu Adab; Asar, Nawab Jafar Ali Khan - Shayari.

Presentation Copy

رام بابو سکسینہ

بصد تسلیم

[illegible]



اعلیٰ حضرت سلطان العلوم سلطان الشعراء ہز اگزالٹڈ ہائنس لفٹننٹ جنرل مظفر الملک
والممالک نواب سر میر عثمان علی خان بہادر فتح جنگ سپہ سالار معین السلطنت برطانیہ
نظام الملک آصف جاہ - جی - سی - ایس - آئی، جی بی ای، نظام حیدر آباد دکن و
برار خلد اللہ ملکہ و دولتہٗ

بہارِ عالم حسنش دل و جاں تازہ میدارد
برنگ اربابِ صورت را ببو اربابِ معنی را

چراغِ محفلِ فصاحت

۱۹۴۱ء

یعنی

گلدستۂ افتتاحی انجمن موسومہ روحِ ادب

۱۹۴۱ء

نذرِ نظام

۱۹۴۱ء

مرتبہ

جناب دیوان پنڈت رادھے ناتھ کول صاحب المتخلص گلشن

در مطبع مرغوب الطبع "انڈین پریس لمیٹڈ" الہ آباد
۱۳۶۰ھ

باہتمام کالی ۔ کے مترا پرنٹر انڈین پریس لمیٹڈ ۔ الہ آباد

فہرست

حصۂ نثر

چمن نظم تحفۂ انجمن روح ادب ۱۹۴۱ء

گلبرگ غزلیات روح ادب ۱۹۴۱ء

غزلیات مشاعرہ

تخلص	غزلیات	صفحہ
سیماب	جناب عاشق حسین صاحب اکبرآبادی ...	۲۵۹ ..
شاہد	جناب سید محمد شاہد صاحب فاخری الہ آبادی ...	۲۶۰ ..
شفق	جناب حسن مرتضیٰ صاحب عاد پوری ...	۲۶۱ ..
شوق	جناب پنڈت جگموہن ناتھ رینہ صاحب شاہجہاں پوری	۲۶۱ ..
شوق	جناب پنڈت پرتھی ناتھ صاحب دہلوی ...	۲۶۳ ..
شوکت	جناب محمد عمر صاحب تھانوی ...	۲۶۳ ..
شیدا	جناب عبدالمجید صاحب خواجہ ...	۲۶۴ ..
شیفتہ	جناب رائے بہادر سوہن لال صاحب سریواستو	۲۶۴ ..
صفی	جناب مولانا علی نقی صاحب لکھنوی ...	۲۶۵ ..
ضامن	جناب کپتان سید محمد ضامن علی صاحب ...	۲۶۶ ..
طاہر	جناب یوسف حسین صاحب ...	۲۶۷ ..
عشرت	جناب رگھو راج بلی صاحب ...	۲۶۸ ..
فائز	جناب سید محمد حسن صاحب ...	۲۶۸ ..
فخر	جناب افتخار حسین صاحب غازی پوری ..	۲۶۹ ..
فراق	جناب رگھوپتی سہائے صاحب گورکھپوری ...	۲۶۹ ..
قامر	جناب مولوی محمد علی صاحب	۲۷۰ ..
قدسی	جناب سید محمد جعفر صاحب جائسی ...	۲۷۱ ..
کیفی	جناب پنڈت برجموہن دتاتریہ صاحب دہلوی	۲۷۱ ..
گلشن	جناب دیوان پنڈت رادھے ناتھ کول صاحب رئیس لاہور	۲۷۲ ..
مانی	جناب سید کلب احمد صاحب جائسی ...	۲۷۳ ..
متین	جناب متین الدین صاحب مچھلی شہری ...	۲۷۴ ..
محمود	جناب خانصاحب محمود علی خاں صاحب ..	۲۷۵ ..
مذاق	خان بہادر نواب احمد حسین صاحب پریانواں	۲۷۶ ..

فہرست تصاویر



شاہزادۂ والاشان پرنس نواب معظم جاہ بہادر دام اقبالہ



جناب عالیہ شاہزادی نیلوفر فرحت بیگم صاحبہ



شاہزادۂ مخفخم جاہ بہادر سلمہ اللہ تعالی

التماس

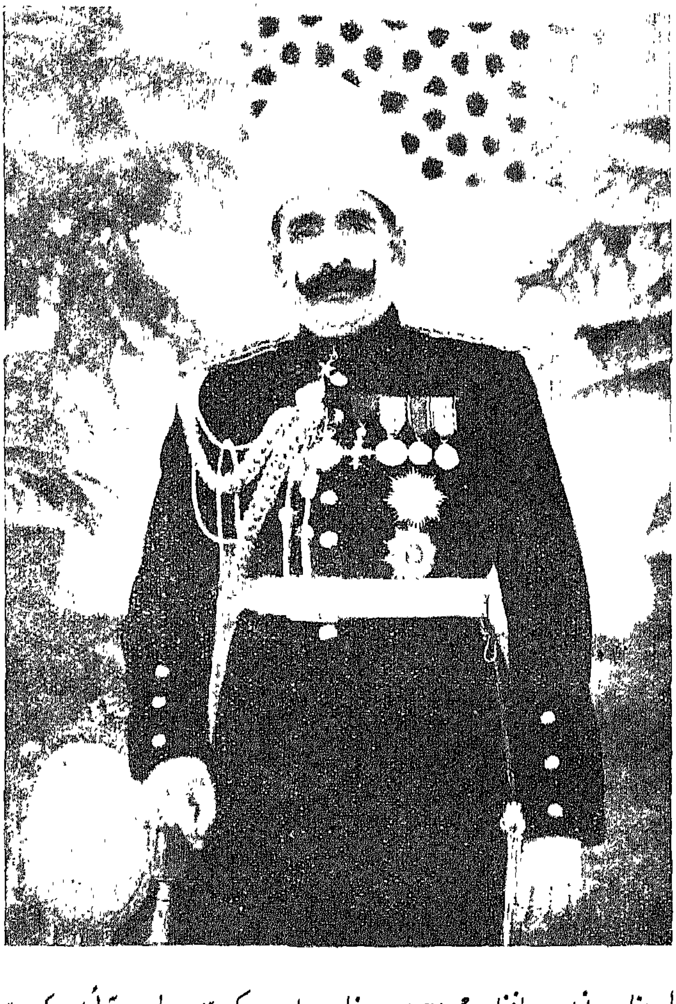
میں عرصہ دراز سے اس کا معتقد رہا ہوں کہ ہمارے ملک کی ترقی انجام کار اس بات پر منحصر ہے کہ ہم ان بیش بہا و گرانمایہ ادبی خزانوں کو جو ہم کو اپنے بزرگوں سے وراثتاً ملے ہیں محفوظ رکھیں بلکہ ان میں برابر اضافہ کرتے رہیں اسکے معنی یہ نہیں کہ انگریزی تعلیم اور موجودہ مغربی تہذیب سے مُنہ موڑ لیں ایسا کرنا تو قطعی ملک کے حق میں نہایت مُضر ہوگا مگر یہ ظاہر ہے محتاج دلیل نہیں ہے کہ انگریزی تعلیم اور تہذیب کی اشاعت تو صرف ایک محدود حلقہ میں ہو سکتی ہے۔ مغربی تہذیب ہندوستان کے ہر گروہ و فرقہ پر حاوی نہیں ہو سکتی۔

شمالی ہندوستان میں جس میں کہ میں صوبہ متحدہ و پنجاب کو شامل کرتا ہوں کم از کم دو ڈھائی سو برس سے ایک مشترکہ زبان یعنی اُردو مُروّج رہی ہے۔ ممکن ہے کہ جس زبان کو میں اُردو کہتا ہوں اُس کو بعض حضرات بلفظ ہندوستانی سے ملقب کرتے ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بعض حضرات جنکو اُردو سے کوئی خاص اُنس نہیں ہے یہ دعویٰ کریں کہ فی الحقیقت عوام کی زبان اُردو نہیں ہے بلکہ ہندی ہے اور اس پر استدلال کریں کہ دیہات میں ہندی کے الفاظ بمقابلہ دیگر الفاظ کے زیادہ مستعمل ہوتے ہیں اسکے جواب میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہر ملک میں شہری اور دیہاتی زبان میں نمایاں فرق ہوتا ہے چنانچہ ہندوستان کی بھی یہی کیفیت ہے۔ لیکن یہ کہنا بالکل صحیح نہ ہوگا کہ دیہاتی زبان میں فارسی یا عربی کے الفاظ کی کافی تعداد نہیں پائی جاتی۔ فی الحقیقت اُردو میں فارسی عربی سنسکرت۔ ہندی اور فی زمانہ انگریزی کے بہت سے الفاظ شامل ہیں اور ہوتے جاتے ہیں۔ صدہا الفاظ تو ایسے ہیں کہ جن کی نسبت ہمارے ہم ملکوں کی کثیر تعداد یہ بھی نہیں جانتی کہ وہ کس زبان سے نکلے ہیں۔ مثال کی طور پر

میں چند الفاظ لکھتا ہوں ۔ آپ کہیں چلے جائیں خواہ شہروں میں خواہ دیہات میں مدرسہ ۔ وقت ۔ خبر ۔ معلوم ۔ خیریت ۔ سلام ۔ تماشہ ۔ یہ ایسے الفاظ ہیں کہ زبان زد ہر خاص و عام ہیں ۔ ہر کس و ناکس اُن کو استعمال کرتا ہے ۔ وہ ہماری زبان کے جزو ہو گئے ہیں ۔ اُن کو ہماری زبان نے اپنا لیا ہے ۔ مگر بدنصیبی سے فرقہ وارانہ اور سیاسی اختلافات کی وجہ سے ہماری کشتی ایک عجیب بھنور میں پڑ گئی ہے ۔ میرا یہ بھی عقیدہ ہے کہ اگر یہ اختلافات رفع ہوگئے یا اِن میں تخفیف ہوگئی تو اِن کا سب میں بڑا سبب مشترکہ زبان ہوگی بغیر مشترکہ زبان کے ہم ایک دوسرے کے مذاق اور احساسات کا اندازہ نہیں کرسکتے ۔ اور اس کے بغیر ہماری نگاہ میں ایک دوسرے کی وقعت بھی نہیں ہوسکتی ۔ چنانچہ اِنھیں خیالات کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ایسے انجمن کے قایم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی کہ جو مشترکہ زبان کی اِشاعت کی ذمہ داری اپنے سر اُٹھالی ۔

انجمن روح ادب اسی خدمت کے انجام دینے کے لئے قایم کی گئی ہے ۔ اس کے استحکام کے لئے یہ مناسب سمجھا گیا کہ مطابق قانون کے اس کو رجسٹر کرا دیا جائے ۔ چنانچہ ستمبر سنہ ۴۱ء میں اس کی رجسٹری ہوگئی اور اس کے قواعد و ضوابط مُرتب ہوگئے اور اس انجمن کا افتتاحی جلسہ دسمبر سنہ ۴۱ء میں ہوا جس کی رپورٹ اب شائع کی جارہی ہے ۔ رپورٹ کے اشاعت میں جو تاخیر ہوئی اُس کی اہم وجہ کاغذ کی دِقّت تھی ۔

اس دو برس سے کم عرصہ میں چند احباب نے اس انجمن کی ہمت اولوالعزمی اور فیاضی سے بڑی مدد فرمائی ہے ۔ میرے مکرم و معظم دوست **نواب سر احمد سعید خاں صاحب رئیس چھتاری و حال صدر اعظم ریاست** حیدرآباد کی توجہ و کرم گستری کا یہ نتیجہ ہوا کہ اس انجمن کو **اعلیٰ حضرت ہز ایگزالٹڈ ہائی نس خسروِ دکن** کی گورنمنٹ سے ایک رقم دس ہزار روپیہ کی عطا ہوئی اور دو سو روپیہ ماہانہ مقرر ہوگیا جب مارچ گذشتہ میں



عالی جناب نواب حافظ سر محمد احمد سعید خان بہادر۔ کے ۔ سی ۔ ایس ۔ آئی، کے ۔ سی۔
آئی ۔ ای، ام ۔ بی ۔ ای، ال ال۔ ڈی آف چھتاری وزیر اعظم ۔ حیدر آباد (دکن)

میں حیدرآباد ایک کام کے سلسلہ سے گیا تھا تو **اعلیٰ حضرت ممدوح** کے خدمت میں حاضر ہونے کا شرف و افتخار حاصل ہوا تھا۔ ممدوح نے جو حوصلہ افزائی فرمائی اُس کا شکریہ ادا کرنا میرے امکان کے باہر ہے مگر اس سے قبل ہی یعنی افتتاحی جلسہ میں **اعلیٰ حضرت مدظلہٗ** نے ایک اپنی غزل مرحمت فرمائی تھی جو کہ جلسہ میں نہایت احترام کے ساتھ سُنی گئی۔ اس کے علاوہ **ہز ہائی نس پرنس آف برار** و **ہر ہائی نس شہزادی دُرِّ شہوار** نے پیغام بھیجے جس سے کہ انجمن کی بدرجہ غایت حوصلہ افزائی ہوئی اور شہزادہ **معظم جاہ** نے بھی اپنی دو غزلیں عنایت فرمائیں جنکو کہ افتتاحی جلسہ میں سُنایا گیا اور جن کی بدرجہ غایت قدر ہوئی۔ پس یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ الہ آباد میں اس انجمن کا قیام **دولت آصفیہ** کی فیاضی سے وابستہ ہے اس کے بعد **ہز ہائی نس نواب صاحب بھوپال** نے بھی مبلغ پانچ ہزار روپیہ کی رقم عطا فرمائی کہ جس کا شکریہ انجمن کی طرف سے ادا کیا جاتا ہے۔ علاوہ ان رقومات کے اور بھی رقومات انجمن کو چند حضرات نے عطا کی ہیں جو بنکوں میں جمع ہیں۔ اب اس بات کی کوشش ہو رہی ہے کہ ایک قطعہ زمین جلدی سے دستیاب ہو جائے تاکہ اُس میں انجمن کے جلسوں کے لئے اور کتب خانہ کے لئے ایک عمارت تیار ہو جائے۔ فارسی کتابوں کے جمع کرنے کی کوشش بھی جاری ہے۔ بغیر عمارت کے تیار ہوئے مسلسل طور پر کوئی کام نہیں ہو سکتا جب عمارت تیار ہو جائے گی اور کتب خانہ مہیا ہو جائے گا تو تالیف و تصنیف کا باقاعدہ کام شروع ہوگا۔

افتتاحی جلسہ کے متعلق مکرمی خان بہادر ابو محمد صاحب نے اپنے مضمون میں نہایت وضاحت کے ساتھ لکھا ہے۔ پہلا جلسہ تو نہایت کامیاب ہوا۔ میں صرف اس قدر اور اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ میرے دیکھتے دیکھتے الہ آباد میں اُردو اور اُردو شاعری نے کافی طور پر ترقی کی اور الہ آباد کو اِس وقت یہ فخر حاصل ہے کہ ایسے ماہران فن و استادان

کامل جیسے حضرت نوح ناروی۔ حضرت ہادی مچھلی شہری حضرت شفق عماد پوری۔ پروفیسر ضامن علی اسی شہر میں ہیں۔ ان کی ذات بابرکات سے قطعی امید ہو سکتی ہے کہ حضرات موصوف کا نیک اثر آنے والی نسلوں پر بھی ان اطراف میں پڑیگا اور اُردو کی خدمت کا سلسلہ قائم رہیگا۔

تیج بہادر سپرو

پریزیڈنٹ انجمن روح ادب، الہ آباد

تعارف

۱۲ دسمبر ۱۹۴۱ء کو انجمن روح ادب کا افتتاحی اجلاس بصدارت عالی جناب معلیٰ القاب رائٹ آنریبل ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو پی، سی۔ کے، سی، ایس، آئی۔ ایل ایل، ڈی۔ بڑی شان و شوکت کے ساتھ الہ آباد کی سب سے بڑی عمارت (یعنی زمیندار ایسوسی ایشن ہال) میں ہوا۔ اس اجلاس کی مکمل کارروائی اس گلدستہ کی شکل میں (جس کا تاریخی نام "چراغ محفل فصاحت" ۱۹۴۱ ہے) ہدیۂ ناظرین کی جاتی ہے۔

یوں تو "انجمن روح ادب" شہر الہ آباد میں کئی سال سے قائم تھی اور پروفیسر ضامن علی صاحب صدر شعبۂ اُردو، الہ آباد یونیورسٹی اور جناب آغا علی خاں صاحب رئیس دریاباد و چند دیگر اصحابِ ذوق کی توجہ سے مضامین ادبی اور مشاعرہ کے جلسے ہوتے رہتے تھے، اور سالانہ اجلاس کا جلسہ بھی قائم تھا جس میں اکثر بزرگان ملک نے صدارت فرمائی مگر ۱۹۴۱ء میں انجمن مذکور کا ستارہ چمکا کہ سر تیج بہادر سپرو بالقابہٗ نے اپنی صدارت کا فخر بخشا۔ جو لوگ سر تیج کی طبیعت سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ سر تیج جس کام میں ہاتھ ڈالتے ہیں، اس میں ان کو عجیب انہماک ہو جاتا ہے۔ ان کی عالی طبیعت نے یہ گوارا نہ کیا کہ انجمن اپنی پرانی حالت پر قائم رہے، بلکہ ان کو یہ دُھن لگ گئی کہ شہر الہ آباد میں جو صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ کا صدر مقام ہے اور جہاں گنگا اور جمنا آپس میں ملتی ہیں، اُردو زبان کے شایانِ شان ایک اعلیٰ پیمانہ پر ادارہ قائم ہو جائے اور جس طرح یہاں گنگا اور جمنا کے باہم میل سے یہ شہر تمام ہندوستان میں شہرت خاص رکھتا ہے، اسی طرح ہندو مسلمانوں کی مشترکہ دولت کو (یعنی زبان اُردو کو جو دو مختلف بڑی قوموں کے باہمی ربط و ضبط کا بہترین ثمرہ ہے) صحیح طور پر کام میں

لاکر اس شہر کو اتحاد اقوام کا مرکز بنایا جائے، نظر براں جناب ممدوح نے "انجمن روح ادب" کی اپنی دست مبارک سے تشکیل جدید فرما کر رجسٹری کرا دی اور تمام مراتب ضروری طے ہونے کے بعد ایک افتتاحی اجلاس منعقد فرمایا۔ ظاہر ہے کہ انجمن کی شان قائم کرنے کے لئے ضروری تھا کہ ملک کے ارباب دولت اور اصحاب علم کی پوری ہمدردی حاصل کی جائے اور اس مقصد کے حصول کے لئے سرپنچ نے ایک ایسی جامع ہستی سے کہ ملک اس پر بقدر ناز کرے بیجا نہ ہوگا یعنی اعلیٰ حضرت حضور نظام خلد اللہ ملکہٗ و دولتہٗ سے بتوسط عالی جناب معلی القاب صدر اعظم ڈاکٹر سر محمد احمد سعید خان بہادر (نواب صاحب چھتاری) سرپرستی انجمن کی درخواست کی اور جو مشاعرہ افتتاحی جلسہ میں ہونا قرار پایا تھا اس کی ابتدا اعلیحضرت کے کلام بلاغت نظام سے ہوئی سرکار نظام نے از راہ کرم و ادب نوازی اپنے دست مبارک سے جو غزل تحریر فرما کر مرحمت فرمائی اس سے سرپنچ نے تبرکاً و یمناً آغاز مشاعرہ کیا۔ سبحان اللہ و بحمدہ سرتاج مصنف اور سرپنچ قاری، پھر تو سامعین کی خوشی اور مباہات کی کوئی حد نہ رہی۔ علاوہ اسکے جناب والا شان پرنس معظم جاہ بہادر نے اپنا ایک دعائیہ پیغام اور بمصداق الولد سر لابیہ اپنی غزل مرحمت فرمائی اور علیا شاہزادی دُرِّ شاہوار نے ایک نصیح پیغام مسرت التیام عنایت فرمایا۔ اس طرح "انجمن روح ادب" کے چار چاند لگ گئے اور اس کی بنیاد کی مضبوطی مسلم ہو گئی۔

سرپنچ بہادر سیر د نے اُس عقیدت خاص کے اظہار کے لئے جو اُن کو اعلیحضرت سرکار نظام خلد اللہ ملکہٗ سے ہے طے کر دیا کہ یہ گلدستہ اپنی جانب سے حضور ممدوح کے نذر کریں اور حسن اتفاق سے "نذر نظام" اس کا تاریخی نام بھی نکل آیا۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف

فہرست اسماء اہل کمال جنھوں نے مقالے پڑھے اور فہرست اسماء شعرائے نازک خیال جنکی غزلیں شامل گلدستہ ہیں خود شاہد ہیں کہ یہ افتتاحی اجلاس کس درجہ موقر اور قابل یادگار رہا۔

ع قیاس کن زگلستان من بہار مرا

خصوصیت کے ساتھ جناب ڈاکٹر عبدالحق وجناب خواجہ حسن نظامی وجناب پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی۔ جناب پنڈت امرناتھ مدن ساحر دہلوی مرحوم وجناب نوح ناروی وجناب تاباں بدایونی وجناب پنڈت جگموہن ناتھ رینہ شوق شاہجہاں پوری وجناب مہاراجکمار محمود آباد کی شرکت قابل ذکر ہے۔

میری درخواست پر اعلیٰ حضرت نواب رام پور دام اقبالہ نے علیا حضرت ہرہائی نس بیگم صاحبہ کی غزل بذریعہ شاعر دربار رام پور مرحمت فرمانا منظور فرمایا تھا۔ مگر چونکہ نواب صاحب ممدوح کو بسلسلہ معائنہ فوج ہندوستان سے محاذ جنگ پر تشریف لے جانا پڑا جناب ممدوحہ کی اس عنوان سے شرکت نہ ہونے کا انجمن کو بیحد قلق رہا۔ تاہم یہ کیا کم محل شکر و سپاس ہے کہ انجمن کے مقصد سے ہمدردی بکمال طیب خاطر فرمائی گئی۔

جناب سائل دہلوی اور جناب صفی لکھنوی کے بوجہ ضعف و پیرانہ سالی عدم شرکت کا تاسف ہوا۔ مگر قطعات معذرت جو ان بزرگوں نے بھیجے اُن سے ان کے انتہائی خلوص اور ادب پروری کا پتہ لگتا ہے۔

ریڈیو اسٹیشن لکھنؤ کے ڈائرکٹر۔ پروفیسر چپ قابل تشکر ہیں جنھوں نے بڑے اہتمام سے مشاعرہ کی مختصر کارروائی کو شب کے وقت نشر کیا اور اعلیٰحضرت سرکار نظام کی غزل تمام نقاط ہندوستان میں سُنی گئی۔

مقامی حضرات میں پروفیسر ضامن علی صاحب وجناب آغا علی خاں صاحب وجناب ڈاکٹر محمد نسیم صاحب سکریٹری انجمن وجناب جلال الدین صاحب ایڈوکیٹ، سکریٹری کمیٹی استقبالیہ نے جس جوش و خلوص کے ساتھ انجمن کی ترقی اور اجلاس کے اہتمام میں حصہ لیا اسکا شکریہ ادا کیا جانا ضروری سمجھتا ہوں۔ جناب دیوان پنڈت رادھے ناتھ کول صاحب المتخلص بہ گلشن صدر استقبالیہ کمیٹی و صدر مشاعرہ ہر طرح تعریف سے مستغنی ہیں۔ ممدوح نے ابتدا سے

ابتک "انجمن روح ادب" کی روح کو تازہ رکھنے میں دامے، درمے، قدمے، سخنے، دریغ نہیں فرمایا، اور اس گلدستہ کی آرائش و ترتیب بھی تمام و کمال انھیں کی ذات والاصفات سے عمل میں آئی۔

آخر میں خدا سے دعا ہے کہ "روح ادب" کی بالیدگی میں یوماً فیوماً ترقی ہو اور بانیان انجمن کے مرکوز خاطر جو اہم مقصد ہے بہ احسن وجوہ پورا ہو۔ آمین!

سید ابو محمدؐ
وائس پریسیڈنٹ انجمن



شاہزادۂ عالیشان ہز ہائنس پرنس آف برار دام اقبالہٗ

پیام پرنس اعظم جاہ

میں نہایت مسرت سے "انجمن روح ادب" کے افتتاحی اجلاس کے لئے اپنا دعائیہ پیام بھیجتا ہوں۔ یہ انجمن دورِ حاضر کی ضرورت کو پورا کرنے اور اُردو کو ترقی دینے کے لئے بنائی گئی ہے۔ بظاہر یہ انجمن اُس اتحاد و یگانگی کے قیام اور ترقّی کے لئے بنائی گئی ہے جو ملک کی دو بڑی قوموں کی یکجہتی سے پیدا ہوئی ہے یہ نیک شگون ہے کہ اس اتحاد کو برقرار رکھنے کے لئے انجمن کا افتتاحی اجلاس الہ آباد میں ہو رہا ہے جہاں دریائے گنگ و جمن کا سنگم ہے جو بجائے خود ایک دائمی اتحاد کی عظیم الشان نشانی ہے۔ میں دل سے دعا کرتا ہوں کہ اس انجمن کو ترقّیاں نصیب ہوں۔

(ہز ہائی نس) اعظم جاہ

(پرنس آف بیرار)

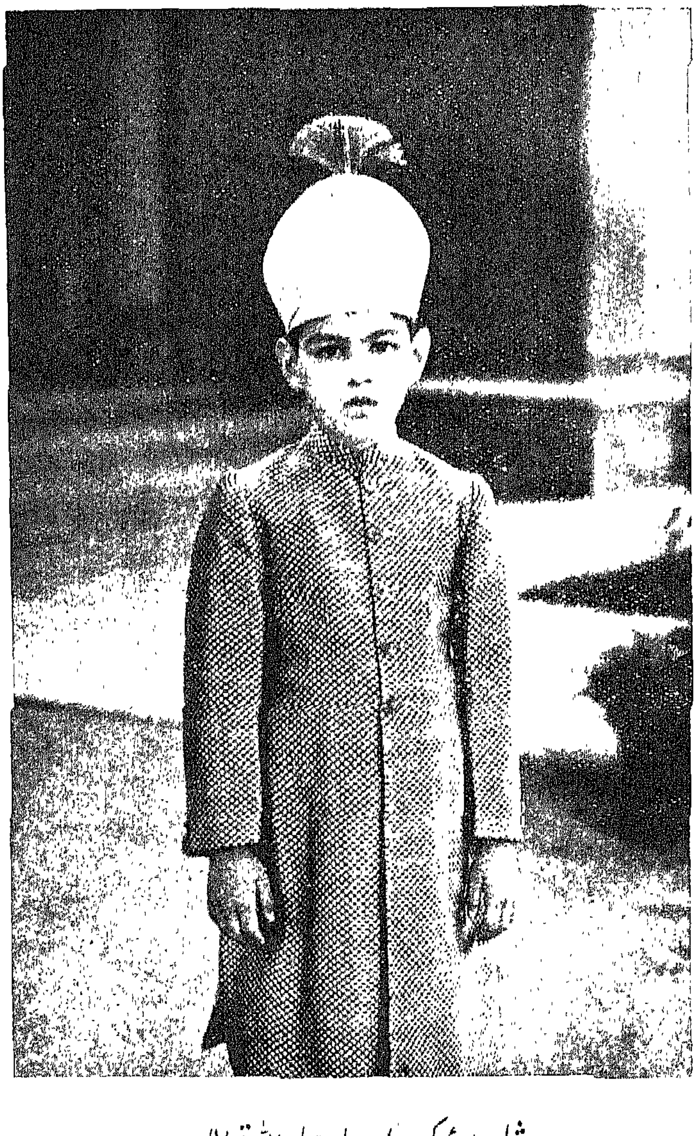
پیام دُرِ شہوار پرنسس برار

میں صمیم قلب سے اس انجمن کے لئے دعا کرتی ہوں جس نے اُس علم و ادب کی ترقی کا بیڑہ اُٹھایا ہے جس میں مجھے خاص دلچسپی ہے۔ مجھکو یقین ہے کہ "روح ادب" اپنے اغراض و مقاصد کے حصول میں کامیاب ہوگی اور اُس کی خدمات ملکی زندگی کو قوت بخشیں گی اور جان نثاران ادب کو یکجا کر کے اُردو ادب کی ترقی اور آپس کے اتحاد و نیز اُس کے مفید اثرات کی توسیع میں معین ہوں گی۔

دستخط (ہر ہائی نس) دُرِ شہوار
(پرنسس آف برار)



جناب عالیہ ہر ہائنس شاہزادی دُرِّ شہوار پرنسس آف برار



شاہزادۂ مکرم جاہ بہادر سلمہ اللہ تعالیٰ

۷۸۶

(نذرِ عقیدت)

بہ

انکشافِ حقیقت

سرتاج تو خسروِ دکن ہیں
سرپنچ سپر بنے ہوئے ہیں
اردو کے بڑے یہ دونوں محسن
سانچے میں خلوص کے ڈھلے ہیں

(محمد حسین زبیری مارہروی)

خطبۂ صدارت

عالیجناب دیوان پنڈت رادھے ناتھ کول صاحب گلشن
صدر استقبالیہ کمیٹی
افتتاحی اجلاس "انجمنِ روحِ ادب" (رجسٹرڈ) الہ آباد

قطعہ

زباں اپنی نہ ہو ناکام طرزِ عرضِ مطلب میں
بلا سے کچھ نہ آئے لیکن اندازِ بیاں آئے
سنو تم گوشِ دل سے تو سناؤں اپنا افسانہ
مرا بھی جی لگے تم کو بھی لطفِ داستاں آئے

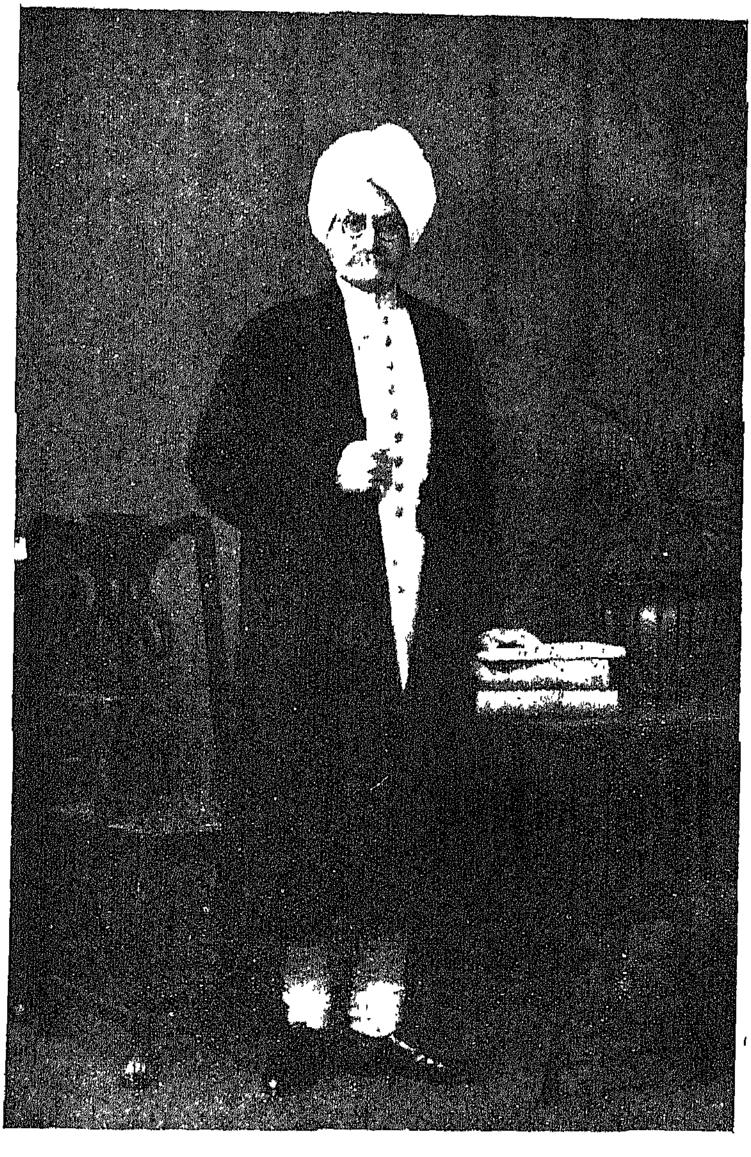
مہمانوں کا خیر مقدم

معززین والا تمکین!

آج وہ فرحت افزا روزِ سعید ہے کہ ؎

مشتعل ہے ہر طرف شمعِ سخن سے انجمن ... بج رہی ہیں ہر طرف شہنائیاں

سخندانانِ باکمال و قدردانانِ سخن اور محبانِ و بہی خواہانِ اردو ادب



عالی جناب دیوان پنڈت رادھے ناتھ کول صاحب المتخلص گلشن صدر کمیٹی استقبالیہ و صدر مشاعرہ

کی تشریف آوری کا شکریہ بجا لانے کے لیئے دہن میں زبان۔ زبان پر الفاظ اور الفاظ کے اندر قدرتِ اظہارِ دلی مسرت کہاں سے پیدا کی جائے۔ درحقیقت دل جو محسوس کر رہا ہے زبان اُس کے بیان سے قاصر ہے ؎

معنی کی شعاعوں سے جو لکھ جاتا ہے دل پر
سچ یہ ہے وہ لفظوں میں ادا ہو نہیں سکتا

حضراتِ ذی شان نے قدم رنجہ فرما کر نہ صرف "انجمنِ روحِ ادب" کی دلی آرزو کے پورا کرنے میں حصہ ہی لیا ہے بلکہ اس انجمن کے قابل یادگار افتتاحی اجلاس کی رونق و شان کو دوبالا کر کے حوصلہ افزائی اور عزت بھی بخشی ہے۔ جس کے لئے واقعی

ع شکر اس کا ادا کر سکے کیا منہ ہے زباں کا

خدمتِ اُردو ادب

فرض اہلِ علم کا ہے انتظامِ بزمِ قوم
وہ دبستاں کیا معلم جس دبستاں میں نہیں

علم منبع نور ہے۔
سخن نفیس خیالات کا سرچشمہ ہے جس سے دل کو سرور حاصل ہوتا ہے۔
عالم مثلِ شاخِ پُرثمر ہے جو سجدۂ حق میں سرنگوں ہے ؎

اگر دیکھو تو ہر گل ایک دفتر ہے معانی کا
اگر سمجھو تو ہر پتی بیان راز کرتی ہے

سخندان کی چشمِ بصیرت میں خار و گل کا پہلو بہ پہلو ہونا ایک دوسرے کی زیب و زینت کو بڑھاتا ہے۔ صفائیِ قلب کے ساتھ دوست و دشمن کے بالاتفاق یکجا ہونے کا عجیب دلکش، پُرلطف اور سبق آموز نظارہ ہے ؎

گل و خار مل جل کے رہتے ہیں باہم — کہیں نام کو بوئے نفرت نہیں ہے

اسی طرح سے

زبانیں مختلف بھی ہوں اگر دو حق پرستوں کی
باہم نبھ جاتی ہے نیت کی خوبی کام کرتی ہے

ہم ہندوستانیوں کی عام فہم زبان دراصل اُردو ہی ہے جو ہر فرقہ۔ ہر پیشہ اور ہر مختلف زبان بولنے والے کے آپس کے میل ملاپ سے نسلاً بعد نسل بنتی چلی آئی ہے اور روزمرّہ بولی جاتی ہے۔ اس اُردو و لشکری زبان میں سنسکرت۔ برج بھاشا۔ فارسی۔ عربی۔ پوربی۔ پنجابی۔ انگریزی۔ پرتگالی وغیرہ مختلف زبانوں کے الفاظ ملے جُلے رہتے ہیں۔ جہاں تک ممکن ہو غیر زبانوں کے الفاظ کی بھرتی سے اُردو زبان کو پاک و صاف رکھنا لازمی ہے۔ ایسا کرنا کسی دوسری زبان سے مخاصمت یا تنگ نظری کے لحاظ سے نہیں کہا جاتا ہے بلکہ علمی فرض کو مدِّ نظر رکھ کر کہنے کی جرأت کی جاتی ہے۔

ع کیجئے بہرِ خدا اپنی زبان کا کچھ تو پاس

حامیان و خادمانِ اُردو ادب کو مژدہ دیتا ہوں کہ اگر وہ اپنی بےلاغرضانہ خدمتِ اُردو دل و جان سے ادا کرتے رہیں گے تو قدرتاً صلہ سے کبھی محروم نہیں رہ سکتے بلکہ مستحق ہو کر بخشش یزدانی سے ضرور فیضیاب ہونگے سے

خدا جب دوست ہے اے داغ کیا دشمن سے اندیشہ
ہمارا کچھ کسی کی دشمنی سے ہو نہیں سکتا

جس کام کو ہاتھ میں لیا جائے کام کی غرض سے اُسے کیا جائے نام کی غرض سے نہیں، نام کے پیچھے کام کی وقعت جاتی رہتی ہے۔ جس کام کا کرنا جس کو فرض ہے اُسے بلا کسی صلہ کے خیال سے اور بلا کسی پر احسان کرنے کے کرنا واجب ہے اور سے

کرتے ہو گر احسان تو کر دو اُسے عام
اتنا کہ جہاں میں کوئی ممنون نہ ہو

چونکہ ہم ایک ہی شاخ کے پتے ہیں ایک انجمن کے

تو مناسب ہے کہ ع دل کے چمن کو آبِ محبت سے سینچئے
اور ع دلوں کا قرب حاصل کیجئے، راحت رساں ہو کر
یعنی ؎ خُم نہ بن کر خود غرض ہو جایئے
مثلِ ساغر اور کے کام آیئے
پس ترکِ خودی خادمانِ ادب کا پہلا فرض ہے ؎

عیب است بزرگ ترکشیدن خود را ۔۔۔ وزجملۂ خلق برگزیدن خود را
از مردمکِ دیدہ بباید آموخت ۔۔۔ دیدن ہمہ کس را و ندیدن خود را

انجمن روحِ ادب کا ظہور

ع مل گیا دل ہے جو دل مطلبِ دل بر آیا

چند سال کا عرصہ ہوا کہ الہ آباد میں زبانِ اُردو کی ہر پہلو سے ترقی کے لئے پہلے تو ایک انجمن "تنظیم ادب" کے نام سے بنائی گئی تھی پھر اُسکا نام "انجمن روحِ ادب" رکھا گیا جس کا کام اُس کے بانیان کپتان جناب سید محمد ضامن علی صاحب ضامن اور جناب خان صاحب آغا علی خاں صاحب محمود اپنی خاص توجہ سے دیگر قابل قدر معاونین کے ہمراہ نہایت خوبی سے چلاتے رہے اور انجمن کے سالانہ اجلاس اور مشاعرے دریاآباد میں خاں صاحب جناب آغا علی خاں صاحب کے دولت خانہ "محمود منزل" پر ہوتے رہے جس میں شریک ہونے کا فخر خادم کو بھی حاصل ہے۔

اب خدا کی شان دیکھئے! ؎

تدبیر کی تقدیر جدا ہوتی ہے ۔۔۔ تقدیر کی تدبیر جدا ہوتی ہے
اس خط کو فرشتے بھی نہیں پڑھ سکتے ۔۔۔ مقسوم کی تحریر جدا ہوتی ہے

۲۷ جنوری سال رواں میں جبکہ انجمن روح ادب کا سالانہ جلسہ "محمود منزل" میں معدنِ علم و ہنر، سخن فہم، نکتہ سنج، عالی ہمم وسیع الاخلاق

سرمایۂ اقلیم ہند۔ فخر قوم۔ ملک کے مایۂ ناز ادیب۔ اُردو کے محسن عالیجناب رائٹ آنریبل ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو پی، سی۔ کے، سی۔ ایس، آئی کی زیر صدارت بڑی شان و شوکت سے ہوا۔ اس وقت جناب موصوف نے اپنی پُرجوش تقریر میں حاضرین جلسہ کی توجہ انجمن کے مقاصد پر دلائی اور فرمایا کہ "انجمن روح ادب" کو جلد رجسٹرڈ کرانا چاہئے اور اس کے قواعد و ضوابط بنا کر عمل میں لانے چاہئیں۔ اس کے لئے عمارت تعمیر کرنی چاہئے اور اس کا ایک کتب خانہ بھی ہونا چاہئے اور انجمن کا ایک اُردو رسالہ بھی آب و تاب سے نکلنا چاہئے اور اس کے لئے روپیہ کی فراہمی کی کوشش کرنی چاہئے۔ نیز حسب معمول فراخ دلی اور اعلیٰ حوصلگی کے ساتھ زبان مبارک سے یہ بھی فرمایا کہ اگر ایسا ہوا تو میں کافی امداد دینے کا وعدہ کرتا ہوں۔ قدرت کی کوئی بات خالی از حکمت نہیں! جناب موصوف نے جو کل فرمایا تھا آج کر کے دکھا دیا! قولِ مرداں جاں دارد۔

انجمن روح ادب الہ آباد کی ۱۴ر نومبر ۱۹۴۱ء کو رجسٹری ہوگئی اُسکا دستور العمل اور قواعد و ضوابط سب باقاعدہ چھپ گئے۔ انجمن روح ادب کا نقش (موٹو) "ہندوستانیوں کا سب سے بڑا مشترکہ سرمایہ اُردو زبان ہے" سب کے دلوں پر نقش ہوگیا۔ یہ سب ہمارے اقلیم دل کے سرتاج سر تیج بہادر سپرو کی توجہ خاص کا مبارک نتیجہ ہے۔ عمارت اور کتب خانہ بھی جلد ہی بن جائیں گے۔ اس ناچیز کا یہ کہنا کسی صورت سے بھی بیجا نہ ہوگا کہ "انجمن روح ادب" کے جسم میں از سر نو تازہ روح پھونکنے والے مسیحا دم سر تیج بہادر سپرو ہی ہیں۔ خدا مدت دراز تک آپ کو تندرست اور سلامت رکھے۔ ایسے صادق القول و فعل کہاں ملتے ہیں!

نگہ پیدا اگر اسے غافل تجلی عین فطرت ہے — کہ اپنی موج سے بیگانہ رہ سکتا نہیں دریا
وہی ہے صاحب امروز جس نے اپنی ہمت سے — زمانے کے سمندر سے نکالا گوہر فردا

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس شہر بلکہ صوبے میں ایک ایسی انجمن

کی ضرورت تھی جو ملک کی ہر دل عزیز زبانِ اُردو کی علمی اور ادبی خدمت کو خوبی اور خوش اسلوبی سے انجام دیتی رہے اور اُس کے علمی خزانے کو نظم و نثر کی تازہ تصنیفوں سے مالا مال کرتی رہے اور لگاتار کوشش سے اُس میں نئے علوم و فنون کے سرمایہ کا اضافہ کرتی رہے۔ مقامِ شکر ہے کہ اب ایسی انجمن قائم ہو گئی، ایشور اسے ہمیشہ قائم رکھے ؏

اپنی جگہ سے ہم نہ ہٹیں گو ہوں گردشیں
ایسے رہیں کہ جیسے انگوٹھی میں نگ رہے

ہمّتِ مرداں مددِ خدا

گر جیب میں زر نہیں تو راحت بھی نہیں بازو میں سکت نہیں تو عزّت بھی نہیں
گر علم نہیں تو زور و زر ہے بیکار مذہب جو نہیں تو آدمیت بھی نہیں

آپ حضرات کے روشن دلوں سے "انجمن روحِ ادب" کے مقاصد پوشیدہ نہ رہنے چاہئیں۔ وہ ہیں اُردو ادب کو ہر پہلو سے ترقی دینا۔ علمی و ادبی مضامین پر زبان اُردو مباحثہ و تقریر کرانا۔ اُردو مشاعروں کا منعقد کرنا۔ رفاہ عام کے لئے اُردو و فارسی کتابوں کا کتب خانہ قائم کرنا۔ اُردو میں امتحانات لینا اور سندیں عطا کرنا۔ اور ایسے دوسرے کام جیسے مطبوعات وغیرہ جن سے مندرجہ بالا مقاصد کے حصول و ترقی کی صورت پیدا ہو۔ سیاسی اور مذہبی مباحثوں کی انجمن اجازت نہ دیگی۔

تمام صوبے میں آپ سے علمی اور ادبی ذوق و شوق رکھنے والے احباب کی خاص توجہ کے یہ تمام مقاصد محتاج ہیں۔ جبکہ انجمن روحِ ادب کے کام میں دامے، درمے، قدمے، سخنے، قلمے آپ شریک ہو کر ہم کارکنوں کا ہاتھ بٹائیں گے تو یہ آپ کا اپنا ہی کام ہے جس کی اس وقتِ خاص میں خاص ضرورت ہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ کامیابی کیوں نہ نصیب ہو؟

ع پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

کوئی کام ہو بغیر مالی امداد کے ہرگز نہیں ہو سکتا اور پھر ایسے عظیم کام کے لئے تو کثیر تعداد سے روپیہ کی ضرورت ہوگی یہ سرمایہ سب خورد و کلاں امیر و غریب۔ شاہ و گدا کے یکدلی سے مل کر کام کرنے ہی سے فراہم ہو سکے گا اس کے لئے دل مضبوط کر کے کمر باندھئے!

یہ صحیح ہے، غم کا سب سے بڑا علاج مصروفیت ہے۔ اچھے کاموں میں مصروف رہنا اپنا غم غلط کرنا ہے اور وقت کو علم سے نیک کام میں لگا کر دوسروں کی راحت و مسرت کا باعث ہوتا ہے۔

کسی شخص یا جماعت کی حالت کو بہتر بنانے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اسے ویسا ہونے کا یقین دلایا جائے جیسا کہ وہ فی الحقیقت نہیں ہے۔ جس بات کو دانا دل سے دیکھ لیتا ہے نادان آنکھ سے بھی نہیں دیکھتا!

اپنے کام کو اپنا فرض سمجھ کر تن من دھن سے کئے جانا فرض ہے کوئی سنے یا نہ سنے ؎

مخاطب گر نباشد شمع خاموش است عرفی
کہ ہست آواز چہ ہست اما تو در معنی زبان بینی

اور اسیر بھی جب ؎ آدمی نہیں سنتا آدمی کی باتوں کو
تو چاہئے کہ ۔ پیکر عمل بن کر غیب کی صدا ہو جا

اسیر شک نہیں کہ ؎ دوسرے کے درد کا احساس ہوتا ہے کسے
ہنس دیا کرتے ہیں گل شبنم کو روتا دیکھ کر

مگر ؎ جو نازک طبع ہیں مست جانتے ہیں پرائے رنج کو
تنگ ہوتی ہے کلی کی صدائے آہ و شیون سن کر

صاحبان! کام کوئی ہو بغیر پختگی خواہش، پوری ہمت، دلی شیفتگی کے لائق صد رشک کبھی نہیں ہو سکتا ؎

تا پر شیفتہ اندر دلدار نہ شد ہمت و رہا ۔ بامید سے یار در ہمت

اخلاص درست و صبر نا چار درست | زیں چار درست میشود کار درست

قطعہ

کام جو کرنا ہے وہ محنت سے کر | گرچہ فرق آئے ترے آرام میں
کونسی مشکل ہے جو آساں نہ ہو | صبح روشن ہے چھپی ہر شام میں
اپنی قوت پر بھروسہ چاہیئے | کام دیتے کی کام کے انجام میں
ہوتا ہے دنیا میں سب اپنے کئے | کوششیں درکار ہیں ہر کام میں

نغمہ سنجانِ گلشنِ ادب

محفل میں شمع چاند فلک پر چمن میں پھول
تصویر روئے انورِ جاناں کہاں نہیں

آج نغمہ سنجانِ گلشنِ ادب کے رنگا رنگ گلہائے نظر فریب گلدستہ کا نظارہ غنچہ دل کو باغ باغ کر رہا ہے اور اُس کی فرح بخش مہک مشامِ جانِ بزم میں بسی ہوئی ہے جس سے دلی مراد کی اُس اُمید کے بر آنے کا یقین واثق ہوتا ہے کہ جو بحرِ سخن کے قلب میں ایک مدت سے موجزن تھی۔

؎ سخن کی قدر ہے اہلِ سخن کی صحبت میں

سامعین کے طبائع ایسے ہونے چاہئیں کہ جن کی صحبت سے محبت کا ایک دوسرے پر ایسا اثر ہو کہ جس سے نفرت کا خیال تک بھی پیدا نہ ہونے پائے اس سے متعلق ایک جوشیلے شاعر کا بند نہایت دلپسند اور سبق آموز ہے ملاحظہ فرمایا جائے ؎

اے دوست دل میں گردِ کدورت نہ چاہیئے | اچھے تو کیا بُرے سے بھی نفرت نہ چاہیئے
کہتا ہے کون پھول سے رغبت نہ چاہیئے | کانٹوں سے بھی مگر تجھے وحشت نہ چاہیئے
کانٹے کی رگ میں بھی ہے لہو سبزہ زار کا | پالا ہوا ہے وہ بھی نسیم بہار کا

حضرات! پیشتر اس سے کہ میں آپ کی سامعہ خراشی ختم کردوں ایک بات اور کہنی چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اس ہر قسم کی کشمکش اور اینچا تانی کے زمانے میں مختلف مذہب اور ملّت کے اصحاب کا ایک جگہ مل کر بیٹھنا اور بلا لحاظ کسی امر کے اچھے کلام سے لطف اٹھانا اور اس کی داد دینا ہم کو اس اصول موضوعہ کی طرف لے جاتا ہے کہ شعر اور ادب مختلف ذہنیت کے انسانوں میں ایک واسطہ ہے موالات اور رواداری کا اور اسلئے ہم سب کا فرض ہے کہ اس بزم ادب اور اس نوعیت کی دوسری صحبتوں کو زندہ رکھیں اور ہر دلعزیز بنائیں۔

یہ عالموں کی ادبی محفل ہے جو ادب و آداب اس کے شایانِ شان ہیں ملحوظ خاطر رہنے چاہئیں ؎

دمے با نیک خواہاں متفق باش
غنیمت داں امورِ اتفاقی

آخری التجا

اب یہی التجا ہے کہ کہی ہوئی باتوں کا خیال رکھا جائے اور کہنے والے کا کچھ خیال نہ کیا جائے یہ باتیں کہنے میں جتنی آسان ہیں عمل میں اس سے ہزار درجہ مشکل ہیں لیکن راستہ بغیر اپنے چلے طے نہیں ہوسکتا، دلی شوق، ہمّت اور قوت برداشت سے سب کام ہوا کرتے ہیں مثل ہے "ہار یئے نہ ہمّت بساریئے نہ رام" ؎

مشکلے نیست کہ آساں نہ شود مرد باید کہ ہراساں نہ شود

دو دلی دوستوں میں ناراضگی گویا جسم اور روح کی بدامنی ہوتی ہے۔ خدا ممبرانِ انجمن میں یک دلی اور یک رنگی قائم رکھے اور "انجمن روحِ ادب" کو ہمیشہ ہر بلا سے محفوظ رکھے! آمین!

شکریہ کارپردازان و مہمانان

یہ تقریر نامکمل رہے گی اگر ان اصحاب گرامی کا دلی شکریہ ادا نہ کیا جائے کہ جنھوں نے افتتاحی اجلاس "انجمن روح ادب" کو کامیاب بنانے کی کوشش کی اور کام میں شوق و شغف ظاہر فرمایا اور نیز جنھوں نے کہ استقبالیہ کمیٹی کے انتظام میں حصہ لیا اور اجلاس کو کامیاب بنانے میں سرگرمی و اعانت فرمائی اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں :-

عالی جناب رائٹ آنریبل ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو، آپ کا نام نامی آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔

جناب خان بہادر سید ابو محمد صاحب
جناب خان بہادر سید نجم الدین احمد صاحب جعفری
جناب رائے بہادر بابو بھگوتی سرن سنگھ صاحب
جناب کپتان سید محمد ضامن علی صاحب
جناب خان بہادر عشرت حسین صاحب
جناب سید واصف حسین صاحب
جناب مولوی سید محمد ہادی صاحب
جناب محمد جلال الدین احمد صاحب
جناب رائے بہادر سوہن لال صاحب سریواستو
جناب ڈاکٹر محمد حماد صاحب فاروقی
جناب پنڈت تربھون ناتھ آغا صاحب

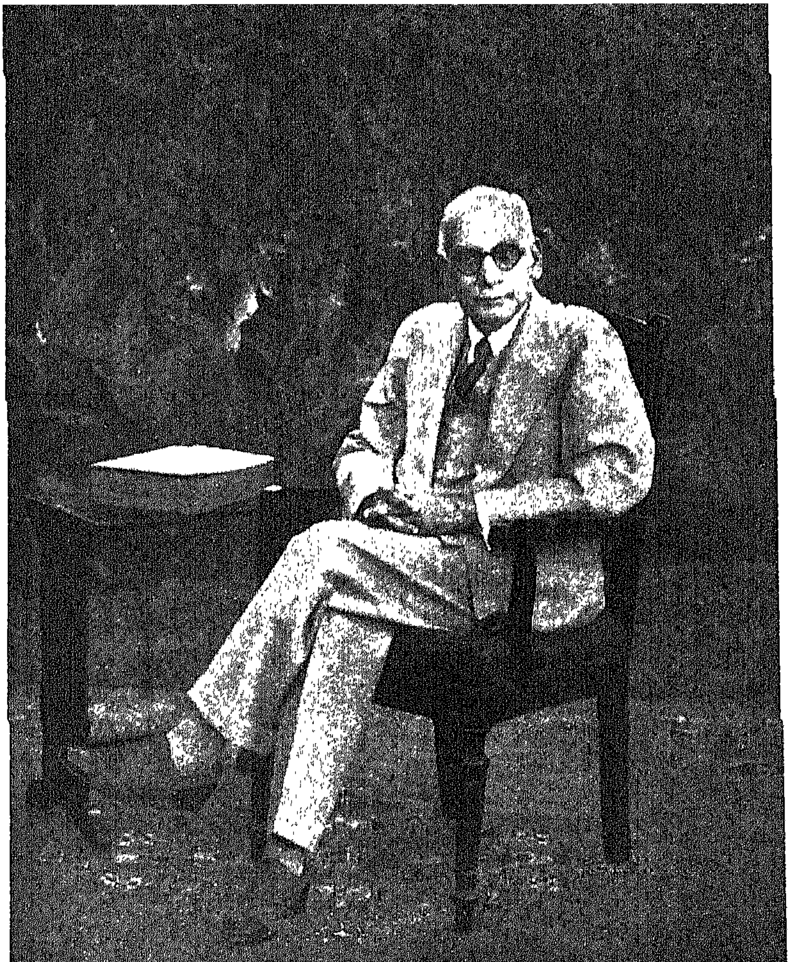
جناب ڈاکٹر محمد نسیم صاحب
جناب نواب سر محمد یوسف
جناب پنڈت منوہر لال زتشی صاحب
جناب خانصاحب آغا علی خاں صاحب
جناب خواجہ عبد المجید صاحب
جناب سید رفیق حسین صاحب
جناب شیو پرشاد سنہا صاحب
جناب ڈاکٹر عبد الستار صاحب صدیقی
جناب مولانا محمد شاہد فاخری صاحب
جناب پنڈت برتھی ناتھ صاحب
جناب پنڈت ترلوکی ناتھ صاحب مدن

اور دیگر معزز معاونین۔

صاحبان والا شان! آپ دور و دراز سفر کی تکلیف اٹھا کر اور اپنا قیمتی وقت صرف کر کے افتتاحی اجلاس "انجمن روح ادب" کی رونق افزائی

کے لئے یہاں تشریف فرما ہیں بلاشبہ یہ آپ صاحبان کی دلی ادب نوازی ہے جس کے لئے ہماری جانب سے آپ ہر پہلو سے شکریہ کے مستحق ہیں اور ہم دل سے آپ کے مداح و شکر گزار ہیں۔

چونکہ تنگیٔ وقت عرض کو طول دینے سے مانع ہے لہذا عالی جناب رائٹ آنریبل ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو صدر "انجمن روح ادب" کی خدمت اقدس میں درخواست ہے کہ اپنی افتتاحی تقریر گوہر بار سے حاضرین کو سرفرازی بخشیں۔



عالی جناب رائٹ آنریبل ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو پی سی اے سی ایس۔ آئی ال ال ڈی،
صدر انجمن روح ادب

خطبۂ صدارت

عالیجناب رائٹ آنریبل ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو
پی۔ سی۔ کے۔ سی۔ ایس۔ آئی، ایل ایل۔ ڈی
صدر انجمن روح ادب (رجسٹرڈ) الہ آباد

یکشنبہ ۲۱ر دسمبر ۱۹۴۱ء

حضرات!

میرا پہلا فرض یہ ہے کہ اپنے تمام محسنوں کا جنھوں نے کہ "انجمن روح ادب" کی دعوت قبول فرما کر یہاں تکلیف فرمائی ہے۔ تہ دل سے شکریہ ادا کروں اور ان فروگذاشتوں کے نسبت جو آپ کے استقبال یا آرام میں ہو گئی ہیں خواستگار معافی ہوں۔ اس نوزائیدہ انجمن کی حوصلہ افزائی اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی تھی کہ آپ جیسے بزرگوں نے جو باکمال ادیب و فاضل ہیں اور جن کا شمار اساتذہ میں ہے اس افتتاحی جلسہ میں شریک ہو کر اس انجمن کو سند قبولیت عطا فرمائی۔

میں اس بات کا بھی شروع میں ہی اظہار کر دینا چاہتا ہوں کہ اس انجمن کو یہ فخر قابل رشک حاصل ہوا ہے کہ اعلیٰ حضرت نظام الملک خسرو دکن نے اپنے دست مبارک سے لکھ کر ایک غزل بھیجی ہے جو

حضرت ممدوح کی فکر بلند پرواز کا نتیجہ ہے۔ میں اپنے جانب سے اور منجانب انجمن اعلیٰ حضرت کی خدمت بابرکت میں بصد تعظیم و تکریم اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ مگر یہ کہنا بھی لازمی ہے کہ اگر ہم کو یہ فخر حاصل ہوا ہے تو وہ بہ توسل عالی جناب نواب سر محمد احمد سعید خاں رئیس چھتاری کے حاصل ہوا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ نواب صاحب اس وقت حیدرآباد میں بہ عہدہ صدر اعظم بابِ حکومت ممتاز ہیں۔ میں نے نواب صاحب کی خدمت میں ایک عریضہ بھیجا تھا اور درخواست کی تھی کہ اس انجمن کی ہمت افزائی کے لئے اعلیٰ حضرت کی خدمت میں ہمارے جانب سے یہ پیام دیں کہ انجمن کے جلسہ و مشاعرہ کے واسطے ایک اپنی غزل تبرکاً مرحمت فرمائیں۔ چنانچہ اعلیٰ حضرت نے اس عرضداشت کو منظور فرما کر ایک غیر مطبوعہ غزل بھیجدی جو کہ عام طور پر وہ مشاعروں کے واسطے نہیں بھیجا کرتے ہیں یہ غزل مشاعرہ شروع ہوتے ہی آپ حضرات کو سنائی جائیگی۔

بہی خواہان اُردو کو یہ ماننا پڑے گا کہ فی زمانہ اُردو کی ترقی اور اشاعت میں جو اعلیٰ حضرت کے زمانہ حکومت میں ریاست حیدرآباد سے ایک اعلیٰ پیمانہ پر امداد ملی ہے وہ ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ یادرہیگی۔ دارالعلوم عثمانیہ یونیورسٹی میں اُردو ہی ذریعہ تعلیم کا ہے حالانکہ اس دارالعلوم میں اور زبانوں کی تعلیم کا بھی انتظام موجود ہے۔ دارالترجمہ حیدرآباد نے اُردو کی نمایاں خدمت کی ہے اور وہ خدمت اس وقت تک جاری ہے۔ اس انجمن کو سیاسی یا مذہبی جھگڑوں سے کوئی واسطہ نہیں۔ ادب اور تہذیب کے نقطۂ نظر سے مجھے اس بات کے کہنے میں کچھ تامل نہیں ہے کہ میں اعلیٰ حضرت کو نہ صرف بحیثیت والیِ حکمرانِ دکن سمجھتا ہوں بلکہ اُس تہذیب اور زبان کا امین بھی سمجھتا ہوں جو اس وقت معرض خطر میں ہے اور جس کے قیام کا میں اپنے محدود دائرہ میں بدل و جان خواہاں ہوں۔

علاوہ اعلیٰ حضرت کی غزل کے دو غزلیں والاشان پرنس معظم جاہ بہادر نے بھی

مرحمت فرمائی ہیں۔ وہ بھی وقت مناسب پر آپ کو پڑھ کر سنائی جائیں گی۔ ان غزلوں کے سننے سے آپ کو معلوم ہوگا کہ شہزادہ صاحب ممدوح کو نہ صرف زبان پر قدرت حاصل ہے بلکہ اُن کے کلام میں ایک خاص شیرینی و گداز ہے۔

بعد اس تمہید کے میں نہایت مختصر طور پر اس انجمن کے نسبت کچھ عرض کروں گا۔ میں نہ ادیب ہوں نہ فاضل نہ شعر و سخن سننے کی لڑکپن سے عادت رہی ہے مگر ایک مصرعہ کہنے کا بھی گنہگار نہیں ہوں۔

میری تعلیم جس فضا میں اور جس زمانہ میں ہوئی تھی وہ آجکل کے فضا سے بالکل مختلف تھی۔ شمالی ہندوستان میں اُس زمانہ میں تعلیم یافتہ ہونے کا یہ معیار تھا کہ آدمی فارسی اور اُردو زبان سے کافی طور پر بہرہ ور ہو۔ انگریزی زبان کی بھی ترویج خاصی ہو گئی تھی۔ لیکن اُردو کو ہم لوگ اُس وقت اپنی زبان سمجھتے تھے۔ اس سے یہ میری مراد نہیں ہے کہ ہندی یا سنسکرت سے ہم کو اجتناب کرنا چاہیئے بلکہ جیسا اپنے مقالہ میں حضرت حالی نے فرمایا تھا "اُردو کی اصلیت یہ ہے کہ وہ سنسکرت اور پراکرت کی لڑکی ہے۔ یعنی خاندان دونوں کا ایک ہی ہے۔ زبان کی نہ کوئی قوم ہوتی ہے نہ ذات ہوتی ہے"۔ اور میرے رائے ناقص میں جتنی زبانوں سے آدمی واقف ہو اُتنا ہی وہ علم کے زیور سے زیادہ آراستہ ہوتا ہے۔ اس بات کے تسلیم کرنے میں میرے خیال میں ہم کو تکلف نہیں کرنا چاہیئے کہ پنجاب میں اور ہمارے صوبہ میں اور خصوصاً مغربی اضلاع میں اس زبان کا رواج دو سو برس سے زیادہ رہا ہے اور اس عرصہ میں اس زبان کا ذخیرہ برابر بڑھتا گیا ہے۔ اس میں ہندی۔ سنسکرت۔ عربی۔ فارسی۔ انگریزی۔ فرانسیسی اور پرتگالی الفاظ بھی شامل ہو گئے ہیں بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ ان کے مجموعہ سے یہ زبان بنی ہے۔ آیندہ اس میں کیا کیا ترقی ہوگی اور کیا کیا تغیرات ہونگے ان کا انحصار کچھ تو آپ صاحبوں پر ہے اور کچھ زمانہ کی ضرورتوں پر۔ خلاصہ یہ کہ میں اس زبان کو ایک موروثی اور مشترکہ سرمایہ سمجھتا ہوں جس کے

مالک و شریک و سہیم ہندو و مسلمان دونوں بحصہ برابر ہیں۔ اگر یہ میرا خیال صحیح ہے تو دونوں کا فرض ہے کہ اس سرمایہ کو تباہ ہونے سے محفوظ رکھیں۔ نہ صرف محفوظ رکھیں بلکہ اس کے ترقی اور اضافہ کی کوشش کریں۔ میرے خیال میں یہ غیر ممکن ہے کہ اب مسلمان بحیثیت مجموعی اُردو کو چھوڑ کر فارسی یا عربی کو اپنی زبان بنالیں اور اسی طرح یہ بھی غیر ممکن ہے کہ ہندو عموماً اس مشترکہ زبان کو چھوڑ کر سنسکرت یا پراکرت کو بولنے یا لکھنے لگیں۔ یہ ضرور ہے کہ جیسے مسلمانوں کی مذہبی کتابیں یا تاریخی کتابیں عربی میں یا ایک حد تک فارسی میں ہیں۔ اسی طریقہ سے ہندوؤں کی مذہبی کتابیں اور زیادہ تر ادبی کتابیں سنسکرت یا ہندی میں ہیں۔ جیسا کہ میں مسلمان کے لئے عربی یا فارسی پڑھنے پر معترض نہیں ہوں ویسا ہی میں کسی ہندو کے سنسکرت یا ہندی پڑھنے پر معترض نہیں ہو سکتا۔ یورپ میں بھی تعلیم یافتہ طبقہ میں اس وقت تک یہ رواج ہے کہ وہاں کے اکثر دارالعلوم میں یونانی یا لاطینی زبانیں پڑھائی جاتی ہیں۔ مگر برطانیہ اعظم میں۔ سکاٹلنڈ۔ ویلس اور انگلینڈ میں عام طور پر انگریزی زبان لکھی جاتی ہے اور بولی جاتی ہے۔ فرانس کے بھی کئی حصوں میں مختلف زبانیں ہیں مگر عام طور پر ایک ہی مشترکہ زبان ہے جو کہ شمال سے جنوب تک لکھی جاتی ہے اور بولی جاتی ہے۔ اٹلی کے درسگاہوں میں لاطینی زبان ضرور پڑھائی جاتی ہے مگر ملک کی زبان اٹیلین (Italian) ہے۔ ٹرکی میں جو کہ ایک اسلامی ملک ہے۔ عربی اور فارسی کا تو برائے نام وجود ہے مگر زبان وہاں کی ترکی ہے جس میں بہت کافی تعداد عربی۔ فارسی اور فرانسیسی الفاظ کی شامل ہے۔ عام لوگوں کی طرف اگر آپ توجہ کریں تو یہ معلوم ہوگا کہ ان کی زبان پر بیشمار عربی، فارسی۔ سنسکرت اور ہندی کے الفاظ ہیں۔ مگر ان کو یہ نہیں معلوم کہ یہ الفاظ کہاں سے آئے ہیں۔ وہ تو یہی سمجھتے ہیں کہ یہ ہماری زبان کے الفاظ ہیں۔ میری رائے ناقص میں یہ ثبوت حب الوطنی کا یا غیرت قومی کا نہیں ہے کہ ان غیر زبانوں کے الفاظ

کو جو ہماری زبان میں جذب ہو گئے ہیں دیدہ و دانستہ خارج کریں اور ان کی بجائے ہم عربی یا فارسی یا سنسکرت کے ایسے الفاظ اپنی زبان میں ٹھونسیں کہ جن سے ہمارے کان آشنا نہیں اور جن کی وجہ سے زبان کی زیبائش اور شستگی میں خرابی پیدا ہو جائے ان وجوہات سے میں اس زبان کا حامی و مددگار رہا ہوں اور رہوں گا۔ علاوہ بریں میں اس زبان کو رشتۂ اتحاد و ارتباط سمجھتا ہوں۔ اگر یہ رشتہ ٹوٹ گیا تو وہ تہذیب و تمدن جس کے پرورش و فروغ میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے یکساں حصہ لیا ہے مٹ جائیگی اور اس کے بجائے ہمارے ملک میں دو تہذیبیں پیدا ہو جائیں گی میں باوجود ان مذہبی و سیاسی اختلافات کے جو کچھ عرصہ سے ہمارے بدنصیب ملک کو تباہ کرنے چلے جا رہے ہیں۔ دونوں کی تہذیب ایک ہی سمجھتا ہوں۔ تہذیب کا تعلق صرف مذہب سے ہی نہیں ہے بلکہ تہذیب مجموعہ ہے اُن تفصیلات کا جو قوم کے لئے باعثِ امتیاز ہوتا ہے۔ جس شعبۂ زندگی پر آپ نظر ڈالیں آپ ایک ہی نتیجہ نکال سکتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ مذہبی و سیاسی اختلافات کو چھوڑ کر ہمارے یہاں یگانگت کے اسباب زیادہ ہیں اور مغایرت کے کم۔ اگر مغایرت کے بھی کچھ اسباب ہیں جو ہمارے لئے اس وقت باعث ننگ و شرم ہیں۔ تو ان کی تخفیف اگر ہو سکتی ہے تو مشترکہ تہذیب کے بدولت ہی ہو سکتی ہے۔ انھیں وجوہ سے میں نے اپنے مقامی احباب کو یہ صلاح دی کہ اس مشترکہ تہذیب کی تائید و ترقی کے لئے ایک انجمن قائم کی جائے جس میں ہندو و مسلمان ایک جگہ بیٹھ کر اپنے خیالات کا اظہار کر سکیں اور خلوص و محبت کے ساتھ لطف زندگی حاصل کر سکیں۔ اس انجمن کے قیام کے لئے میں نے یہ بھی صلاح دی کہ اس کی قانون کے مطابق رجسٹری کرادی جائے چنانچہ میری دلی خواہش ہے کہ اس انجمن کے لئے ایک کتب خانہ بھی قائم کرایا جائے۔ مگر اس انجمن کو استقلال اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک اس کے لئے ایک علیحدہ مکان نہ

خرید لیا جائے یا بنوا دیا جائے۔ اور اس کے واسطے ایک کافی سرمایہ نہ ہوجائے کہ جس کے منافع سے یہ اپنی کوششیں جاری رکھ سکے۔ میں امید کرتا ہوں کہ ان تمام حوصلوں کے پورا کرنے میں کارکنان انجمن کافی کوشش کریں گے۔ اور حتی الامکان میں بھی اس میں کوشش کرنے کے لئے تیار ہوں۔ یہ سوال کہ یہ انجمن کس طور پر اُردو کی خدمت کر سکے گی قابل غور ہے مگر اس کا تعلق ایک خاص کمیٹی سے ہوگا جو میں اُمید کرتا ہوں۔ اس کے لئے مقرر کی جائے گی۔ آپ کی صلاح نیک و مشورہ کی یہ انجمن خواہاں ہے۔ آپ یہ اطمینان فرمائیں کہ جو کچھ کہ صلاح و مشورہ اس انجمن کو ملے گا اس پر بعد غور و فکر کے عمل کرنے کی کوشش کی جائیگی میں پھر آپ حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے اس موقع پر شریک ہو کر اس انجمن کی حوصلہ افزائی فرمائی اور اس کو مرہون منت کیا۔

پیشکشِ مختصر

بتقریب افتتاحی اجلاس انجمن روح ادب الہ آباد

بصدارت عالی جناب رائٹ آنریبل سر تیج بہادر سپرو

بروز یکشنبہ ۲۱ دسمبر ۱۹۴۱ء

آج کس شان سے گلشن میں بہار آئی ہے — جس کو خود دیکھ کے قدرت بھی تماشائی ہے
چہلیں کرتی ہوئی پھرتی ہے صبا پھولوں سے — گلے ملتی ہے ہر اک شاخ سے جی بھر بھر کے
بوئے گل باغ میں اترائی ہوئی پھرتی ہے — مست ہو کر کبھی اٹھتی ہے کبھی گرتی ہے
جابجا باغ میں اس طرح ہے پھولوں کا نکھار — صفحۂ دہر پہ جیسے ہو جوانی کا ابھار
صبح دم دامنِ گل ہیں دُرِ شبنم سے بھرے — بلبلوں نے بھی محبت کے ترانے گائے
دیکھ کر رنگ چمن یہ ہوا احساس مجھے — یہ قدرت نے بصد لطف سجایا ہے اسے

خوش ہیں طائر کہ ہوا خوف خزاں باغ سے دور
یاس و حرماں کے جو کھٹکے تھے ہوئے سب کافور

آج آفاق پہ ہے نیا مہرِ درخشاں نکلا — آج سوئی ہوئی قسمت کا ہے تارا چمکا
آج ہے "انجمنِ روحِ ادب" کا جلسا — اس کا شاداب الٰہی رہے بوٹا بوٹا
متحد ہو کے کریں سب یہی پیمانِ وفا — پرورش اس کی دل و جاں سے کرینگے بخدا
دیدنی میکدۂ علم و ادب کی ہے فضا — کہ ہے ساقی بھی نیا مے بھی نئی جام نیا
حیدرآباد دکن کے جو ہیں عالی سلطاں — ان کے اوصاف کی تفسیر سے قاصر ہے زباں
مصدرِ لطف و کرم ملکِ دکن کے مالک — ویسے ہی دل کے بھی ہیں جیسے ہیں تن کے مالک

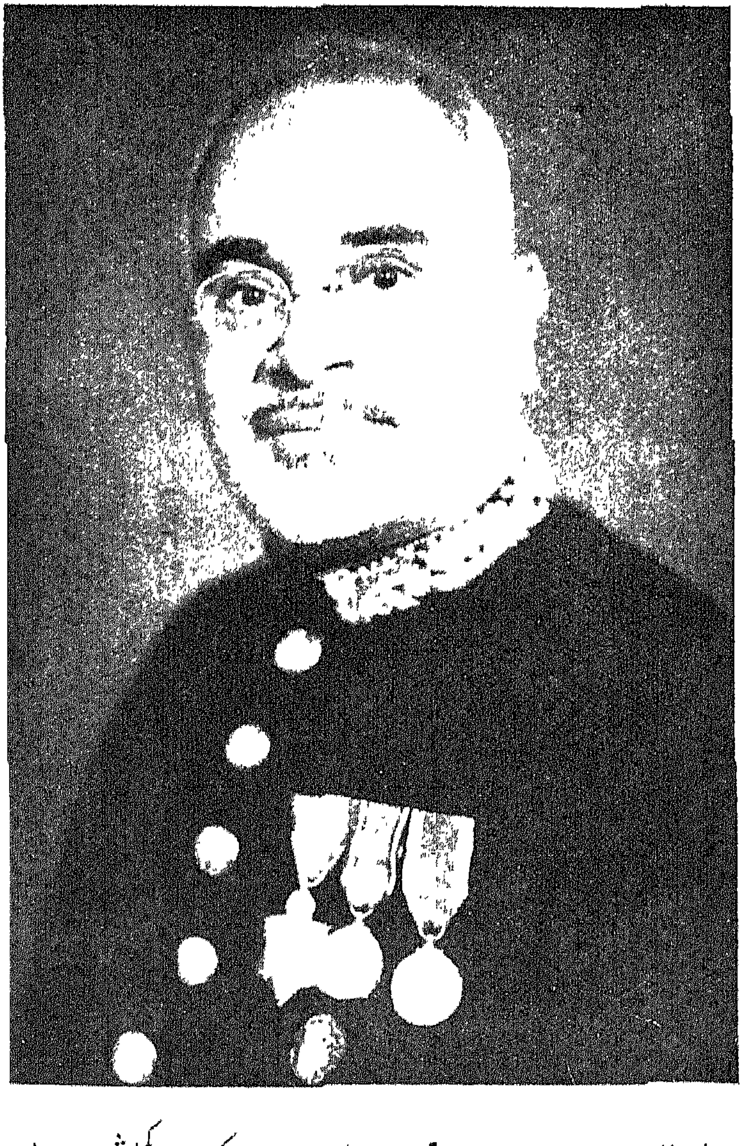
کون سا دل ہے وہ جس دل پہ نہیں آپ کا گھر — آپ سا دہر میں کوئی نہیں بندہ پرور
مہرباں آپ کسی پہ جو ذرا ہو جائیں — نعمتیں اس کو دو عالم کی عطا ہو جائیں
انجمن شام و سحر آپ کا دم بھرتی ہے — آپ کا شکر تہِ دل سے ادا کرتی ہے

ایسا جب کشتیِ آمال کا ہو کھیون ہار
بات کی بات میں ہو جائے نہ کیوں بیڑا پار

یوں بھی ہے "انجمن روحِ ادب" پہ ہمیں ناز — جس کو سرپنچ بہادر سے ملے ہیں دمساز
آپ کے فیض و کرم سے اسے عزت ہے ملی — آپ کی ذات گرامی سے یہ رفعت بخشی
برگ اور بار سے کل تک جو شجر تھا خالی — آج اس کی تر و تازہ ہوئی ڈالی ڈالی
آپ نے آبِ محبت سے ہے اس کو سینچا — آپ کے لطف و عنایت سے یہ سرسبز ہوا
شکر ہے رحمتِ حق کا، کہ یہ دن آیا ہے — تخمِ امید جو بویا تھا، وہ پھل لایا ہے
دل سے اربابِ نظر کا یہی پیماں ہوگا — اس کی خدمت کریں، سب کا یہی ایماں ہوگا
یا خدا اس پہ ہے تیری عنایت کی نظر — اس کی تعریف کا ہوتا رہے چرچا گھر گھر
سب کی آنکھوں میں رہے حسن کا تارا ہو کر — دل میں ہر اک کے رہے جی کا سہارا ہو کر

سچے دل سے یہی آغا کی دعا ہے ہر دم
یہ سلامت رہے جب تک رہے دنیا قائم

از نتیجۂ فکر ٹی۔ این۔ آغا۔ ایڈوکیٹ اسسٹنٹ
سکریٹری



عالی جناب خان بہادر سید ابو محمد صاحب ام اے ممبر پبلک سروس کمیشن یو پی

خطبہ افتتاحیہ

صدرِ محترم و معزز حاضرین۔

جو پُر مغز افتتاحی تقریر ہمارے محسن ادب سر تیج بہادر سپرو نے ابھی فرمائی ہے اس کے بعد "انجمن روح ادب" کے موضوع پر کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ ہماری انجمن علی الاعلان اُردو زبان کی حمایت اور ترقی دینے کے مقصد سے قائم کی گئی ہے، کیونکہ ہمارا یقین ہے کہ یہی زبان ہندو مسلمانوں کی مشترکہ تہذیب کی بہترین سرمایہ دار ہے، اور اسی زبان کے ذریعہ سے گزشتہ زمانہ میں دونوں قوموں کے درمیان رشتہ اتحاد قائم ہوا، اور اسی کے قیام سے اس اتحاد اور ارتباطِ باہمی کی امید کی جا سکتی ہے۔ آجکل جبکہ سیاسی جھگڑوں کی بدولت ملک میں اک طوفان برپا ہے اور ان جھگڑوں کے سلسلہ میں ایک نئی زبان کے پیدا کرنے کا سودا سے خام زور پر ہے، ہماری بے انتہا خوش قسمتی ہے کہ سر تیج بہادر سپرو سے روشن دماغ حق پرست، سرپرست نے اردو کی حفاظت کے لیے دل سے توجہ فرمائی ہے۔ ممدوح کی جس قدر تعریف کی جائے وہ کم ہے۔ آج ان کی ذات دنیا کے مشاہیر میں شمار کی جاتی ہے، اور ان کی شان میں ایک فارسی استاد کا یہ شعر بالکل صادق آتا ہے:-

صد ہزاراں صورت اندر قالبِ حسن و جمال
ریختند اما نہ اُو مطبوع تر کم ریختند

یعنی حسن و جمال کے سانچے میں لاکھوں صورتیں ڈھالی گئیں، مگر آپ سے زیادہ بھلی صورت جو دلوں میں کھپ جائے نہ ڈھل سکی۔

حضرات! میں نے اس شعر کو صرف سر تیج کی تعریف کی غرض سے نہیں پڑھا۔ یہ شعر اردو زبان پر بھی صادق آتا ہے، جو ہندوستان کی مختلف بولیوں میں سب سے زیادہ پیاری، دلکش اور مطبوع زبان بن کر پورب سے پچھم

اور اُتر سے دکھن تمام ہندوستان میں رائج ہے۔ اُردو کا ایک نام ریختہ بھی ہے، اور اُردو کی تاریخوں میں مصنفین نے ریختہ کے معنی گری پڑی چیز کے لکھے ہیں، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اردو ایک گری پڑی چیز یا لشکری بولی تھی، جو فاتح اور مفتوح قوموں کے تصادم سے بنی۔ مجھے اس رائے سے اختلاف ہے۔ اگرچہ جس طرح لال کرتی بازاروں میں فوجی مسکولوں اور انگریزی صاحبان کے نوکروں میں اک خاص بولی انگریزی اور اردو لفظوں کے انمیل بے جوڑ مخلوط ہونے سے پائی جاتی ہے۔ ممکن ہے کہ اردو کا آغاز اسی طرح ہوا ہو، مگر اس میں ایسی صلاحیت تھی کہ جیسے جیسے ہندو مسلمانوں میں محبت اور ارتباط بڑھتا گیا، حاکم اور محکوم دونوں نے مل کر اس کی تعمیر میں ایسی توجہ کی کہ اس نے ریختہ یعنی ایک سانچہ میں ڈھلی ہوئی صورت اختیار کر لی، اور اب نہ وہ بازاری زبان ہے، نہ لشکری، بلکہ وہ اب ایسی مکمل، جامع اور حسین زبان ہے کہ جس پر ہندو اور مسلمان یکساں فخر و مباہات کر سکتے ہیں۔ چنانچہ غالب نے اپنے ریختہ کلام کے رشک فارسی ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ در اصل اردو کی تعمیر میں پہلے مسلمان بادشاہوں نے بڑا حصہ لیا۔ انھوں نے اپنی زبان کو ملک پر مسلط نہیں کیا، اور اپنی دوراندیشی سے اگرچہ فارسی کو دفتر کی زبان کی حیثیت سے اس لئے قائم رکھا کہ نئے گھر و ریود سے میں ابھی استعداد کافی نہیں تھی، مگر اردو کو رواج دینے کے لئے اپنی روزمرہ میں داخل کیا۔ حضرت امیر خسرو کی خالق باری اس کا بیّن ثبوت ہے، جو میری ابتدائی تعلیم کے زمانہ تک درسی کتابوں میں داخل تھی اور مسلمانوں اور ہندوؤں کے باہمی اتفاق اور رواداری کی ضرورت پر مبنی تھی۔ بابر کے قلمی دیوان میں جس پر سلاطین مغلیہ کے دستخط ہیں اور جو رامپور کے کتب خانہ سرکاری میں محفوظ ہے، اردو الفاظ ترکی زبان میں داخل نظر آتے ہیں، اور گھروں میں تو معمولی بول چال اس درجہ مخلوط ہو گئی تھی کہ کم پڑھے لکھے طبقہ کی مذہبی اور اخلاقی تعلیم کے لئے کتابیں مخلوط

زبان میں لکھی جانے لگی تھیں اور شعراء نے اپنے جذبات کے اظہار کے لئے بھی اسی کو آلہ بنا لیا تھا۔ شہنشاہ اکبر نے جو ہندوستان کا سب سے بڑا مسلمان بادشاہ گذرا ہے یہ اپنا نصب العین قرار دیا کہ ہندو مسلمان اس ملک میں شیر و شکر ہو کر رہیں۔ تب تو اُردو کے لئے تمام راہیں کھل گئیں اور رفتہ رفتہ یہ زبان معراجِ کمال پہ پہنچ گئی، اور جب بڑے بڑے کامل شعراء نے شمالی ہند سے لے کر جنوبی ہند تک اس مخلوط زبان کو ریختہ کیا یعنی عمدہ سانچہ میں ڈھالا تو میرؔ اور سوداؔ اور دردؔ کے عہد میں وہ صحیح معنی میں ایسی ریختہ ہو گئی کہ اس پر یہی شعر صادق آیا کہ:-

صد ہزاراں صورت اندر قالبِ حسن و جمال
ریختہ آمد از طبع تر کم ریختند

میں اُردو کے دوسرے نام "ریختہ" کا یہی مفہوم سمجھتا ہوں۔

اب میں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ اس زبان کو ریختہ کرنے میں ہندو مسلمانوں نے برابر حصہ لیا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے فاتحانہ حملوں سے بہت پہلے سے مسلمانوں کا تاجرانہ تعلق اس ملک سے رہا سو اصل مالآبار و سندھ اور کابل کے اطراف سے عربی اور فارسی اس ملک میں آئی اور آٹھ سو برس سے تو دونوں قوموں میں ایسا تعلق رہا ہے کہ باتفاق تمام مورخین اس اُردو زبان کی مستقل بنیاد تقریباً آٹھ سو سال ہوئے پڑ چکی تھی۔ خوب یاد رکھئے کہ اُسے ہندوستانی فلسفہ اور مذہب سنسکرت کے ذریعہ سے حاصل کیا۔ اور سیاحت دان امراء نے یہاں تک کہ نامور امراء نے سنسکرت کا علم حاصل کیا۔ شعراء میں حضرت امیر خسرو بھی سنسکرت علوم سے بخوبی واقف مانے گئے ہیں۔ دوسری طرف دیکھئے تو ہندوؤں نے علوم عربی و فارسی جاننے میں بڑی قابلیت دکھائی، اور مسلمان حکومتوں میں بڑے بڑے اعلیٰ عہدوں پر ممتاز ہوئے۔ اس طرح سے ایک نئی تہذیب کو نشو و نما ہوئی، اور سنسکرت اور عربی فارسی میں ایک عجیب امتزاج ہونے لگا، اور جب اُردو زبان میں استعداد کامل ہو گئی تو مسلمان اور ہندو شعراء اسی زبان میں یک رنگ ہو کر اس مشترکہ تہذیب و تمدن کا گیت گانے لگے۔ دکن میں

تو اُردو کئی بار سرکاری دفتروں کی زبان قرار دی گئی اور تمام کاروبار اسی پر منحصر ہوا۔ اگر پورے طور پر تحقیقات کی جائے تو مجھے یقین ہے کہ یہ ثابت ہوگا کہ اُردو کی تکمیل میں ہندوؤں نے بمقابلہ مسلمانوں کے زیادہ حصّہ لیا ہے۔

قدیم ہندی شاعروں نے اپنے کلام میں بہت سے عربی، فارسی الفاظ استعمال کئے ہیں۔ ۱۸۰۱ء میں مرزا علی لطف نے اپنے تذکرہ گلزار ابراہیم میں ٹیک چند دہلوی، بکھاری لال، سنتوکھ رائے، راجہ جسونت سنگھ پروانہ، ہردے رام جودت، موتی لال عیبق، رائے سرب سنگھ دیوانہ، مہتاب رائے رتسوا، بندرابن راقم، گردھاری لال طرز، لالہ شیو سنگھ ظہور، سیتارام عمدہ بھکاری داس عزیز، منشی عجائب رائے عاشق، لالہ صاحب رائے فریاد، لالہ بدھو سنگھ قلندر، رائے انندرام مخلص، راجہ رام نرائن موزوں، لالہ بخت مل عظیم آبادی، منشی کشن چند مجروح، رام جیشن مغموم، سداسکھ نشار، لالہ مول رائے وفا کے نام صفِ اوّل میں دکھائے ہیں۔ اس کے بعد ۱۸۸۵ء میں منشی دیبی پرشاد نے جو تذکرہ اردو شعراء کا لکھا ہے اس میں ۵۲۴ ہندو شعرا کا بیان معہ نمونۂ کلام پیش کیا ہے۔ عہد حاضر کے شعراء میں کشمیری نژاد ہندو شعرا کی تعداد ۳۹۷ ہے جنھوں نے فن شعر میں گل کاریاں کی ہیں اور ان میں آبر، سرشار چکبست، حضرت شاعر، ساقی، سعد، بیدل، شاکر، طالب، انندنرائن ملّا، رعنا، انور، عاصی، نگار، موہن، مضطر، نسیم لکھنوی، عاشق، کیفا ہجر، مسترد، ماہر اور شوق خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ کوئی ادب ہو، اس میں قوم و مذہب کی قید نہیں ہوتی۔ ادب میں تعصب کا دخل نازیبا ہے۔ اور شاعر ہر تنگ نظری سے بالاتر ہوا کرتا ہے۔ شاعر کا مذہب محبت ہے اور صرف محبت۔ محبت ہی کے تحت میں اسکے تمام جذبات اور مشاہدات ہوا کرتے ہیں۔ اُردو میں کبیر، منیر اور نظیر کے کلام اس پر شاہد ہیں۔ سچّا شاعر اپنے پاک خیالات کو آراستہ زبان میں بے خوف و خطر ادا کرتا ہے۔ اردو زبان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ قالب جس میں یہ ریختہ

کی گئی سنسکرت ہے یا پراکرت، اور اس کو سانچے میں ڈھالنے والے ہندو اور مسلمان دونوں، اور مکمل اُردو نے جو خوبصورت اور دلنشیں صورت اختیار کی اس کو غور سے دیکھا جائے تو اس میں وہی حسن غالب نظر آتا ہے جو اس ملک کا خاص ہے۔ عربی فارسی الفاظ اس میں سموئے گئے ہیں مگر بڑی لطافت کے ساتھ اور نہایت احتیاط سے، یہاں تک کہ اگر آپ ہر دور کے مشہور اور مستند اُستادوں کے کلام پر نظر ڈالیں، تو ۲۵ فی صدی عربی فارسی الفاظ سے زیادہ آپ کو نہ ملیں گے اور کثرت سے ایسے اشعار اور نظمیں ملیں گی جن میں آمیزش بہت ہی کم ہے۔ یہ تو بدنصیبی ہمارے ملک کی ہے کہ تیس پینتیس سال سے افراط تفریط دونوں جانب سے ایسی بھی ہوئی ہے کہ لطافتِ زبان کے زائل ہونے کا شدید خطرہ پیدا ہوگیا ہے، بقول درؔد:-

آنکھیں کہیں کہ دل نے کیا ہے ہمیں خراب
دل یہ کہے کہ آنکھوں نے ہم کو مٹا دیا
بگڑا کسی کا کچھ نہیں اے دردؔ عشق میں
دونوں کی ضد نے خاک میں ہم کو ملا دیا

خدا سے دعا ہے کہ ہمارے محترم صدر کے سایۂ عاطفت میں یہ انجمن روحِ ادب جس میں ہندو و مسلم اراکین بڑے ذوق و شوق سے شریک ہیں، اردو زبان اور تہذیب کو جو دونوں قوموں کا مشترکہ سرمایہ ہے نہ صرف قائم رکھنے کی بلکہ آئندہ نسلوں کے لئے اور بھی آراستہ اور پیراستہ چھوڑنے کی کوشش کریگی۔

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ ادب سے اور تعصب سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیئے۔ میری رائے میں اردو زبان اور تہذیب کو ترقی دینے کے لئے یہ صورت ٹھیک نہیں ہے جو آجکل کی جارہی ہے کہ ہندوؤں کی ضد میں خواہ مخواہ عربی فارسی کے نامانوس الفاظ نظم و نثر میں ٹھوسے جائیں اور اردو روزمرہ کو اتنا مشکل کردیا جائے کہ وہ اپنا پیارا رنگ بدل دے۔ اسی طرح ہندوؤں کو چاہیئے کہ وہ بھاشا کو جو بذات خود ایک نرم اور شیریں چیز ہے سنسکرت کے ثقیل الفاظ

ملا کر ایسا نہ بنا دیں کہ بالکل سمجھنے میں نہ آسکے۔ ہندوستانی اکیڈمی کی تحقیقاتی رپورٹ میں (جس کا میں بھی ایک ممبر تھا) بالاتفاق یہی طے ہوا تھا کہ اردو کو اپنے طرز پر ترقی کرنا چاہیئے اور ہندی کو اپنے طرز پر۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ دونوں زبانوں کے ہوا خواہ کیا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ اردو ادیبوں سے میں یہ درخواست کروں گا کہ جو طریقہ ان کے پیشرو اساتذہ نے برتا اسی پر قائم رہیں اور عربی فارسی کے جدید الفاظ اور اختراعات سے گریز کریں۔ جو الفاظ ۸۰۰ سال کی مدت میں اردو زبان میں کھل مل نہ سکے ان کو بے ضرورت داخل کرنا زبان کو خراب کرنا ہے۔ حضرات شعراء کا خصوصاً یہ فرض ہے کہ کلام میں زبان کی صفائی، حلاوت اور گھلاوٹ پر نظر رکھیں اور پرانے اساتذہ کا کلام جنھوں نے پراکرت کو اردو اور اردو کو اردوئے معلیٰ بنا دیا بغور پڑھیں۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ عصر حاضر کے نوجوان شعراء کو نہ صرف پرانے اساتذہ کو مطالعہ کرنا لازمی ہے بلکہ ان کو بھاشا شاعری سے بھی پوری واقفیت پیدا کرنا چاہیئے۔ سیاسی نقطہ نظر کو چھوڑ کر وقت آگیا ہے کہ ہم ہندو اور مسلمان دونوں زبانوں کو سیکھیں۔ ایسا کرنے سے دونوں میں صلاحیت بڑھے گی۔ وہ لفظوں کے حسن قبول اور ترکیبوں کی نشست کا صحیح اندازہ کریں اور آج کل کی نا قابل معافی اندھا دھند سے بچیں۔

خان بہادر سید ابو محمد صاحب

الہ آباد اور شعرائے الہ آباد

از

کپتان پروفیسر سید محمد ضامن علی صاحب

ضامن صدر شعبۂ اردو۔ الہ آباد یونیورسٹی

صدر محترم کے ارشاد عالی کی تعمیل کو اپنا شرف سمجھ کر الہ آباد اور شعرائے الہ آباد کے مختصر حالات آپ حضرات کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

محترم صدر و ادب نوازانِ اردو۔

مرقع عالم کو غور سے دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ زمین و آسمان کے مالک نے جس طرح بنی نوع انسان کی ظاہری و باطنی حالتوں اور کیفیتوں میں علی قدر مراتب انھوں نے فضلنا بعضکم علی بعض د جانے تفرقے رکھے ہیں اسی طرح بقاع ارض کے بھی مدارج و مراتب قرار دئے ہیں۔ انھیں بوقلموں حالتوں اور گوناگوں کیفیتوں کی رنگ آمیزی سے مرقع عالم کو دلکش و دیدہ زیب بنا دیا ہے۔ استاد ذوق فرماتے ہیں۔

گلہائے رنگ رنگ سے ہے رونق چمن
اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

یہ ارض پاک جو الہ آباد کے نام سے موسوم ہے اور جہاں پھر "روح ادب" آج نیا جنم لے رہی ہے اور اپنے پچھلے کرموں کی بدولت ایک مستقل رنگ اختیار کر رہی ہے زمانہ قدیم سے روحانیت کے لئے مشہور ہے صحیح تاریخ تو نہیں بتائی جا سکتی لیکن بعض مورخین کہتے ہیں کہ ڈیڑھ ہزار برس قبل مسیح سے ہر زمانہ میں یہ مقام مرجع خاص و عام رہا ہے۔ ملک کے مختلف

حصّوں سے ہندو مذہب کے پیرو کثیر تعداد میں تیرتھ کے لئے یہاں جمع ہوتے اور گنگ و جمن کے سنگم (ملتقیٰ) میں نہاکر اپنے پچھلے پاپ دھویا کرتے تھے اور متبرک درخت اور مندر کا طواف کرکے نجات اخروی کی سند حاصل کرتے تھے۔ بدھ مذہب کے زمانے میں بھی جس کا آغاز ۵۴۰ برس قبل مسیح ہوا یہ مقام متبرک سمجھا جاتا تھا۔ کوسمبھی جو یہاں سے قریب ۳۰ میل جانب غرب واقع ہے اور یہاں کچھ آثار قدیمہ بھی برآمد ہوئے ہیں۔ ایک زمانے میں بدھ مذہب کے بادشاہوں کی سلطنت کا ایک صوبہ تھا اور اسی صوبہ میں یہ مقام بھی جو اب الہ آباد کے نام سے موسوم ہے شامل تھا۔ یہاں ہر سال ایک اژدھام ہوتا تھا جس میں خیرات کے نام سے دولت لٹتی تھی۔ اُس زمانہ کی یادگار وہ مینارہ ہے جو یہاں تاف قلعہ میں ایستادہ ہے اور جس کے کتبے گذشتہ شان و شوکت کا پتہ دیتے ہیں۔ ہندوؤں کی مذہبی کتابوں میں جو بہت قدیم ہیں اس مقام کا نام پریاگ لکھا ہوا ہے اور اسی نام سے یہ پکارا جاتا تھا آج بھی اس کا دوسرا نام یہی ہے پریاگ کے معنی قربانگاہ کے ہیں۔ مذہبی نقطۂ نگاہ سے یہاں کی داد و دہش و خیرات باعث برکت اور یہاں کی موت سبب نجات خیال کی جاتی تھی اسی وجہ سے یہ نام پڑا۔ رامچندر جی نے اپنے خود اختیاری جلا وطنی کے سلسلہ میں پریاگ کو بھی اپنے قدموں سے عزت بخشی تھی، جس مقام پر قیام کیا تھا وہ بھردواج کہلاتا ہے اور اب بھی عقیدت مندوں کی زیارتگاہ ہے۔ مسلمان بادشاہوں کی عہد حکومت میں بھی اس مقام کی عظمت میں کمی نہیں ہونے پائی بعض بادشاہوں نے تو اپنی حق شناسی اور نیک نیتی سے عمال کے نام یہ حکم جاری کر دیا تھا کہ میلے کے زمانے میں جاتریوں کی آسائش کا پورا سامان مہیا کیا جائے اور کوئی محصول اُن سے نہ لیا جائے۔ سال میں کئی دفعہ سنگم پر اہل ہنود کا اجتماع ہوتا تھا جن میں عورت۔ مرد۔ عالم۔ جاہل۔ شاعر۔ ادیب۔ فلسفی۔ صناع۔ اہل حرفہ۔ تجار۔ علوم و فنون کے ماہر۔ جوان۔

بوڑھے ۔ بچے ۔ صحیح و تندرست ۔ بیمار و نحیف غرض چھوٹے بڑے ہر طبقہ کے لوگ موجود ہوتے تھے اور اپنے رسوم مذہبی آزادی سے بجا لاتے تھے۔

سولھویں صدی عیسوی میں اکبر بادشاہ نے یہاں ایک فلک شکوہ قلعہ تعمیر کرایا اور شہر آباد کیا جس کا نام اس مقام کی پاکی کا خیال کرکے الہ آباد رکھا اور اپنی مذہبی رواداری ۔ انسانی مروت حق سرو ہی اور رعایا کی خاطرداری سے اُس مرجع انام مندر اور متبرک درخت کو جو صدیوں سے ہندوؤں کی زیارتگاہ بنا ہوا تھا قلعہ کے سینے میں دل کی جگہ دیگر ہمیشہ کے لئے نظر بد سے محفوظ کر دیا۔

قلعہ تیار ہونے کے بعد یہ مقام جو اس وقت تک محض تیرتھ راج سمجھا جاتا تھا۔ اب سیاست کا مرکز بھی خیال کیا جانے لگا اور اس صوبہ کی راجدھانی قرار پایا شاہزادہ سلیم جو بعد میں جہانگیر کے لقب سے تخت جہانبانی پر جلوہ افروز ہوا قلعہ میں رہنے لگا۔ ارکان دولت ۔ اہل سیف ۔ اہل حرفہ ۔ عالم ۔ ادیب شاعر۔ صناع ۔ پیشہ ور غرض ہر طبقہ کے لوگ آباد ہونے لگے تھوڑے ہی دنوں میں مسلمان بھی اچھی خاصی تعداد میں آباد ہوگئے ۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے ایک جگہ رہنے سے آپس کا اتحاد بڑھا اور دونوں کے دن رات کے میل جول سے ایک طرف تو لباس ۔ رسم و رسوم اور طرز معاشرت پر اثر پڑنے لگا اور دوسری طرف مخلوط زبان کو وسعت و ترقی ہونے لگی جو آگے چل کر اُردو کہلائی اور یہ دونوں قوموں کی مشترکہ واحد زبان بن گئی ۔ صوفیائے کرام نے بھی یہاں کی مقامی حالت کا اندازہ کرکے خدمت خلق اور ترویج مذہب کے ارادے سے ادھر کا رخ کیا شہر کے ارض و طول میں پھیل کر تھوڑے تھوڑے فاصلہ سے تزکیہ نفس و حق آگاہی کے حلقے قائم کئے جو دائرہ کے نام سے موسوم ہوئے اس قسم کے بارہ دائرے اور کچھ چھوٹے چھوٹے دائرے ظہور میں آئے جنکی آستان بوسی کو آج تک مسلمان اپنا فخر سمجھتے ہیں۔

ان مختصر حالات سے ظاہر ہوگیا کہ اس مقام کو جو ہندوؤں کی تیرتھ گاہ ۔ بدھ مذہب والوں کے لیے متبرک اور مسلمانوں کے نزدیک قابل تکریم ہے خالق ارض و

سے ازل ہی سے عبادت روحانیت اور تزکیۂ نفس کا مرکز قرار دیا تھا۔ قدرت
کاملہ دیکھئے کہ گنگ و جمن کا پانی جو دل عارف کی طرح پاک و صاف ہے آپس میں
ملتا ہے اور پھر ایک دوسرے سے علٰیحدہ نظر آتا ہے۔ ایک تیسری ندی سرسوتی
جو ہندو اعتقادات کی رو سے علم کی دیوی ہے ظاہری آنکھوں سے نہاں ہو کر
سنگم میں داخل ہوتی ہے اور یہ سب مل کر حقیقت عرفان اور علم کی جلوہ پاشیاں
کرتے ہیں۔ مبارک ہے آج کا دن کہ اپنے مقدس زمین پر ہندو، مسلمان اور
عیسائیوں کے باہمی ارتباط کی گراں قدر یادگار اور کوششوں کی بولتی تصویر
یعنی اردو زبان کی ایک انجمن نے نیا جنم لیا ہے اور اپنے مانو (اصول عمل کے
متوسلوں) کے لئے کشمیری کنول کا پھول اختیار کیا ہے جو آنکھوں کو ٹھنڈک اور
دل کو فرحت بخشتا ہے۔ پانی میں نشو و نما پاکر تاب آفتاب کے اثر سے شگفتہ ہوتا
ہے کیا تعجب جو اس مقام کی برکت اس انجمن کو حیات جاوید بخشے اور جناب صدر
کے نجم ارم کی آبیاری اور آپ حضرات کے نگاہ مہر کی شعاعیں اس کو آنکھوں کا
نور اور دل کا سرور بنا کر عالم میں سرخرو کریں۔ جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے
قلعہ کی تعمیر کے بعد سے دار الخلافہ دہلی اور الہ آباد کے سیاسی تعلقات اور شاہزادہ
سلیم کے قیام نے ارباب عقل و دانش کی توجہ الہ آباد کی جانب مبذول کرائی
جنھوں نے شہر کو آباد کرنے اور رعایا کو مرفہ الحال بنانے کی امکانی کوشش
کی۔ اسی سلسلے میں اہل علم و فضل کی توجہ سے علم و ادب کو بھی ترقیاں نصیب
ہوئیں [illegible] صوفیائے کرام کے زمانوں میں علوم مشرقیہ کے تعلیم کی درسگاہیں
کھلیں۔ ریاضت و حق شناسی کی تعلیم ہونے لگی شبانہ روز سالکان راہ وفا
عشق حقیقی [illegible] جب آتش [illegible] سے دل جلتا تھا تو زبان
کی [illegible] آہ و زاری اشعار کی صورت میں ظاہر ہوتی تھی۔ ان بزرگوں
کی نوشت و خواند کی زبان فارسی تھی اور عام گفتگو اردو میں کیا کرتے تھے
ان کی تصنیفات [illegible] تحریریں، مثنویاں اور قصیدے کثیر تعداد میں
آج تک موجود ہیں اور [illegible] کئی بزرگ صاحب دیوان تھے

ہیں۔ نثر کی کتابیں بھی بزبان فارسی۔ فقہ۔ علم کلام۔ رموز حقیقت وغیرہ میں لکھی گئیں جو استبداد زمانہ سے کچھ تو ضائع ہو گئیں اور کچھ ابھی باقی ہیں۔ ان حضرات نے اپنی تصانیف سے فارسی ادب کے ذخیرہ میں جو اضافہ کیا اُسکے اظہار و تفصیل کے لئے ایک مستقل مضمون کی ضرورت ہے۔ اس مختصر مضمون میں گنجائش نہیں ہے اس لئے نظر انداز کرتا ہوں۔ اس زمانے میں اہل علم و فضل زیادہ فارسی ہی میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ اُردو اگرچہ بہت ترقی کر گئی تھی اور روزمرہ کی بول چال و نیز کاروباری ضرورت کو پورا کرنے کی حد سے گذر کر علمی زبان بن چکی تھی اور دکھن میں نثر کی کتابیں اور نظم کے دواوین اس زبان میں مرتب ہو چکے تھے اور وہاں کے شعرا و نثر نگار زیادہ تر اسی زبان میں کہنے اور لکھنے لگے تھے مگر شمالی ہند میں اس کی جانب کم توجہ تھی۔ یہاں فارسی ہی کا دور دورہ تھا۔ وَلی جب دہلی آئے تو ان کے کلام کی شیرینی اور دل آویزی نے شعرائے دہلی کو اردو کی جانب مائل کیا۔ شعرائے الہ آباد کا بھی یہی حال ہوا۔ پہلے فارسی میں کہتے تھے پھر عام دلچسپی دیکھ کر اردو میں طبع آزمائی کرنے لگے۔ یہاں کے شعرا کا کلام دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو کی مستقل شاعری یہاں بھی کم و بیش اسی زمانے سے شروع ہوئی جب سے دہلی میں ہوئی مگر کلام کی پختگی اور لفظوں کی نشست یہ بتاتی ہے کہ ابتدائی تکلیف نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ فارسی میں شعر کہنے کی مشق نے اردو کلام کو بھی اسی سطح پر پہنچا دیا ہو۔ یہاں کے شعرا کا جو کلام دستیاب ہوا ہے اسکو باعتبار زمانۂ حیات شاعر متقدمین۔ متوسطین۔ متاخرین و معاصرین کے چار دوروں میں تقسیم کرکے ہر ایک کا ضمیمہ پیش کرتا ہوں۔ یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ یہ الہ آباد کے تمام شاعروں کا مجموعہ ہے کیونکہ باوجود سعی بلیغ کے بہتوں کے کلام میری نظر سے پوشیدہ رہ گئے ہوں گے مگر یہ عرض کروں گا کہ انھیں چند شعرا کی تلاش۔ ان کے کلام کی فراہمی و نیز ان کے زمانۂ حیات کے دریافت کرنے میں جو دقتیں مجھ کو پیش آئی ہیں اس کو میرا دل جانتا ہے۔

سنہ ۱۷۵۰ء سے یہاں کی شاعری کا آغاز قرار دیکر پچاس پچاس برس کے چار دور بنائے ہیں۔ کُل شاعروں کی تعداد ۳۴۶ ہے جن میں ۲۶۷ مسلمان ۷۵ ہندو ۲ عیسائی ۲ خاتون ہیں ہر دور کے شاعروں میں سے چند کے اشعار تفریح طبع کے لئے پڑھتا ہوں تاکہ اس زمانے کے کلام کا اندازہ ہو جائے۔

دور اوّل سنہ ۱۷۵۰ء سے سنہ ۱۸۰۰ء تک

اس دور کے شاعروں کے کلام میں سادگی، اور بیساختہ پن ہے۔ زبان صاف اور نرم ہے مگر کہیں کہیں قدامت کی جھلک بھی پائی جاتی ہے۔

(۱) **بیتاب** ۔ شاہ محمد علیم الدین قاضی فخر الدین کے چھوٹے بھائی تھے شاہ عالم بادشاہ کے زمانے میں گذرے۔ صاحب تذکرہ گلزار ابراہیم لکھتے ہیں "از سلسلہ سجیاد با علوم رسمیہ آشنا است ہر چند راقم اور اندیدہ صفات حمیدہ او از زبان بعضے شنیدہ" فارسی میں بھی نظم کرتے تھے اردو کے کلام میں پختگی۔ مضمون آفرینی پائی جاتی ہے۔ زبان بھی صاف ہے نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

رفتہ رفتہ بہت خوش قدم آفت ہوگا قدم آگے جو رکھے گا تو قیامت ہوگا

نگیں کی طرز یہ کیا مجھ کو سخت بھاتی ہے کہ ایک نام کی خاطر جگر کھداتی ہے

---

(۲) **مصیب** ۔ حاجی شیخ غلام قطب الدین ولد حاجی شیخ محمد فاخر بن شاہ محبوب اللہ الہ آبادی صاحب علم و فضل تھے۔ مکہ معظمہ میں بعد ادائے حج سنہ ۱۱۸۷ھ مطابق سنہ ۱۷۷۳ء میں انتقال کیا۔ صاحب دیوان گذرے ہیں۔ اردو فارسی دونوں زبانوں میں کہتے تھے۔ طبیعت نہایت شگفتہ پائی تھی ملاحظہ ہو۔

شبِ فرقت میں تیری او ظالم ہو گیا خواب، خواب آنکھوں میں

کون گلشن میں کہو مشک کی بو لاتی ہے — کہتے ہیں زلف کے کوچے میں صبا جاتی ہے

---

(۳) نثار۔ منشی سدا سکھ خلف منشی سنبل پرشاد دہلی کے رہنے والے تھے لیکن الہ آباد میں اقامت اختیار کر لی تھی۔ سوداؔ کے شاگرد تھے۔ بھاشا اور فارسی میں کہتے تھے کئی دیوان اور مثنوی ان کی یادگار ہیں نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

ہمارا ہی دل جب ہمارا نہیں ہے — تو شکوہ ہمیں کچھ تمہارا نہیں ہے

کیا سنگار رجھانے کو تم نے کس کی چشم — کہ بال بال در اشک جو پروئے ہیں

---

(۴) عزیز۔ بھکاری داس شاگرد خواجہ میر درد سنہ ۱۱۹۶ھ مطابق سنہ ۱۷۸۱ء میں الہ آباد میں رہتے تھے شعر گوئی کا ذوق سلیم رکھتے تھے۔

ایسا ہے لعل لب کا ترے رنگ یار سرخ — یاقوت جس کے آگے لگے ایک سنگ سرخ

کرے نہ بار اگر دل کو صاف کینے سے — عزیز موت بھلی پھر تو ایسے جینے سے

ملیں کیونکر بھلا اس شوخ طفل لاابالی سے
کہ سوتے سوتے جو چونکے ہے تصویر خیالی سے

دور دوم سنہ ۱۸۰۱ء سے سنہ ۱۸۵۰ء تک

(۵) اجمل۔ شاہ محمد اجمل الہ آبادی غلام قطب الدین مصیب کے چھوٹے بھائی تھے۔ بڑے بزرگ اور مشہور خاندان سے تھے سنہ ۱۲۳۶ھ مطابق سنہ ۱۸۲۰ء میں انتقال کیا۔ زیادہ تر فارسی میں کہتے تھے کبھی کبھی اردو میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔

شاد کتنا دل سے با طرب سے بر میں جب جانانہ تھا — ہائے کیسی رات تھی جس رات وہ ہمخانہ تھا
ہو گیا تھا کہتے کہتے ان دنوں کچھ ہوشیار — پھر جو دیکھا کل تک اجمل کو وہی دیوانہ تھا

اس دور میں یہ امر خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ حضرت ناسخ نے اپنے قدم سے الہ آباد کو شرف بخشا۔ ان کے آنے سے شہر میں سوائے شعر و شاعری کے اور کوئی ذکر ہی نہ رہ گیا۔ ان کی تشریف آوری کا واقعہ مختصراً یہ ہے کہ سلطان غازی الدین حیدر کے عہد حکومت میں اراکین سلطنت کی دو پارٹیاں تھیں، ایک معتمد الدولہ آغا میر کی جس میں حضرت ناسخ بھی تھے اور دوسری نواب منتظم الدولہ حکیم مہدی کی۔ دونوں پارٹیاں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش کرتی تھیں۔ اتفاقاً بادشاہ نے کسی بات پر ناخوش ہو کر حکیم مہدی کو معزول کر دیا۔ ناسخ نے ظریفانہ انداز میں حکیم صاحب کی ہجو کہی۔ زیادہ دن نہ گذرے تھے کہ شاہی عتاب نے ناسخ کی طرف بھی رخ کیا۔ یہ لکھنؤ سے بھاگ نکلے اور الہ آباد آ گئے۔ شاہ ابو المعالی کا زمانہ تھا ناسخ کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور دائرہ شاہ اجمل کے صدری دروازے سے متصل جو بالاخانہ تھا اس پر بصد افتخار ان کو ٹھہرایا۔ راجہ چندو لال نے پندرہ ہزار روپیہ بھیجے اور ناسخ کو بلوا بھیجا مگر شیخ صاحب نہ گئے اور یہ کہلا بھیجا کہ اب میں نے سید کا دامن پکڑ لیا ہے اسے چھوڑ نہیں سکتا۔ یہاں سے جاؤں گا تو لکھنؤ ہی جاؤں گا۔ کچھ دن الہ آباد میں قیام کرنے کے بعد بنارس اور عظیم آباد تشریف لے گئے وہاں بھی لوگوں نے سر آنکھوں پر بٹھایا مگر طبیعت نہ لگی الہ آباد تشریف لائے اور یہ شعر فرمایا ؎

ہر کچھ کے دائرہ ہی میں رکھتا ہوں میں قدم آئی کہاں سے گردشِ پرکار پاؤں میں

ڈھائی برس تک قیام رہا۔ ۱۸۲۷ء میں جب غازی الدین حیدر کا انتقال ہوا تو معتمد الدولہ آغا میر کے بھروسہ پر لکھنؤ پہونچے وہاں معلوم ہوا کہ سلطان ناصر الدین حیدر نے حکیم مہدی کو قلمدان وزارت عطا کیا اُلٹے پیروں پھر الہ آباد واپس آئے یہاں پہونچ کر بیٹے کی بیماری کی خبر ملی۔ پریشان ہو گئے پھر اطلاع آئی کہ خدا نے شفا دی تو ایک تاریخ کہی۔ جس کے چند شعر سناتا ہوں ؎

نورِ چشمم شفا ز چیچک یافت دلم ایں مژدۂ مبارک یافت
سجدۂ شکرِ حق ادا کردم در حقِ نامہ بر دعا کردم

گفت ہر ساکنِ الہ آباد   اے مسافر ترا مبارکباد
سال مسعود گفت پیر خرد   عودتِ نورِ چشم سعد بود

۱۲۴۳ھ مطابق ۱۸۲۷ء

چھ برس تک لکھنؤ سے باہر الہ آباد - کانپور - بنارس میں سیر کرتے پھرے ایک غزل میں اس کی نسبت اشارہ فرماتے ہیں -

دشت سے کب وطن کو پہونچونگا   کہ چھٹا اب تو سال آپہونچا

خدا جانے کس دل سے یہ شعر کہا تھا جو تیر بہدف ہوا - حکیم مہدی ۱۸۳۲ء میں معزول ہو کر فرخ آباد چلے گئے - ناسخ پھر لکھنؤ پہونچے اور حکیم صاحب کی معزولی کی تاریخ نئے انداز سے کہی -

افتاد حکیم از وزارت   تاریخ بطرزِ نو رقم کن
از جای حکیم ہشت برگر   سہ مرتبہ نصف نصف کم کن

چار برس تک لکھنؤ میں قیام کیا - محمد علی شاہ کے زمانے میں حکیم مہدی پھر منصبِ وزارت کے لئے طلب کئے گئے - شیخ ناسخ تیسری مرتبہ لکھنؤ چھوڑ کر الہ آباد تشریف لائے - نو مہینے بعد حکیم صاحب خود دارِ فانی سے سدھارے ناسخ لکھنؤ آئے اور ایک سال کے اندر ہی اندر راہی ملکِ بقا ہوئے - کہانی کہاں سے کہاں پہونچی کہنا صرف اتنا تھا کہ الہ آباد کے مشاعروں، ادبی صحبتوں اور مذاق سلیم نے ناسخ سے استاذ کا دل اس طرح موہ لیا کہ لکھنؤ سے نکل کر سوائے اس مقام کے کسی اور جگہ دل نہ لگا - ناسخ کے قیام سے الہ آباد کے شاعروں کو بھی چار چاند لگ گئے - سادگی کی جگہ تشبیہ و استعارے نے لے لی - بیساختہ پن نے بنوٹ کا لباس اختیار کیا - اثر شاعرانہ صناعیوں میں گم ہونے لگا - اس دور کے چند اور شاعروں کا کلام سناتا ہوں -

(۲) اہل - شریمتی جانکی بی بی الہ آبادی قوم کایستھ سے تھیں، بڑی ذہین اور خوش فکر شاعرہ تھیں ۱۸۸۵ء میں بقیدِ حیات تھیں -

تو نے تو رہا کر ہی دیا زلفِ دوتا سے   ہم جان سے جائیں کبھی تو اب تیری بلا سے

ملتا ہے وہ مضموں ہمیں ذہن رسا سے
رہ جاتا ہے جو بندشِ فکرِ شعرا سے

مارا ہے جنھیں آپ نے آنکھوں کی حیا سے
اب ان کو جلاؤ لبِ اعجاز نما سے

شانہ جیب الجھتا ہے تری زلفِ دوتا سے
ڈرتا ہے ہمارا دل صد چاک بلا سے

تا حشر جدا ہوں نہیں اس جور و جفا سے
خواہش ہے اگر دل میں تو اتنی ہے خدا سے

کعبے کی طرف نشہ میں کس طرح سے جاؤں
دشوار سنبھلنا ہے مجھے لغزشِ پا سے

اس گل کا نہ لائی کبھی پیغام مرے پاس
شرمندہ کبھی میں نہ ہوا بادِ صبا سے

آتا ہے نظر ہاتھ میں اس شوخ کے جس وقت
ہوتا ہے لہو خاک مرا رنگِ حنا سے

بیکر کہیں چھلّے کو کرے مجھ کو نہ بدنام
اتنا ہے فقط خوف ترے دزدِ حنا سے

باقی نہ رہی خواہشِ مے بادہ کشوں کو
بے ہوش کچھ ایسے ہوئے ساقی کی صدا سے

سچ پوچھئے تو خاکِ درِ یار پہ ہم کو
آرام ہے بڑھ کر کہیں نقشِ کفِ پا سے

---

(۷) **عالی**۔ شاہ ابوالمعالی، حضرت شاہ اجمل کے لڑکے تھے اور ہر دو زبان فارسی و ریختہ میں شعر کہتے تھے۔ میر کے شاگرد تھے۔

آئینہ پنہاں بغل میں لیکے میں ان سے کہا
ہم تمھیں تم کو دکھا دیں گے تو کیا دوگے ہمیں
پہلے تو یہ سن کے کچھ حیران ہو کر رہ گئے
پھر کہا ہنس کر کے آئینہ دکھا دوگے ہمیں

نورِ تجلی یہ نہیں موسیٰ، طور پہ ایسا جلوہ کہاں ہے
آکے ہمارے نورِ نظر نے پردے میں دکھلائیں آنکھیں
خانہ خراب ہو اس چاہت کا دن کو چین نہ خواب ہے شب کو
آنکھ لگی اک پل نہ ہماری جب سے تم نے لگائیں آنکھیں

---

(۸) **افضل**۔ شاہ غلام اعظم خلف شاہ ابوالمعالی بن حضرت شاہ اجمل صاحب۔ آتشؔ کے شاگرد تھے آپ سے دو دیوان اور ایک مثنوی یادگار ہے۔

ہے یقیں نور بصارت ہو زیادہ افضل ۔۔۔ سرمۂ خاک مدینہ لگے گر آنکھوں میں

پھوٹیں مری آنکھیں جو کسی اور کو دیکھوں ۔۔۔ ناحق نہ سنا کیجئے افواہ کسی کی
جی جائے جگر ٹکڑے ہو پھٹ جائے کلیجہ ۔۔۔ کیا تجھ کو خبر اے بت گمراہ کسی کی

(۹) **تابش** تخلص، محمد جعفر نام۔ وطن ان کا الہ آباد تھا لیکن دہلی میں گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی ؎

کبھی بن بادہ رہ نہیں سکتے ۔۔۔ توبہ کچھ ہم کو سازگار نہیں
دل میں خوش ہیں عدو یہ لئے تابش ۔۔۔ وہ ستمگر کسی کا یار نہیں

(۱۰) **جیتل** ۔ خلف منشی موتی لال سکنہ الہ آباد محافظ دفتر کلکٹری بنارس۔

ہوئے کیسے کیسے جوانمرد پیدا ۔۔۔ بنائے زمیں پر مکاں کیسے کیسے

دور سوم ۱۸۵۰ء سے ۱۹۰۰ء تک

دوسرے ہی دور میں یہاں کی شاعری چمک اٹھی تھی، تیسرے دور میں نور علیٰ نور ہو گئی۔ منشی محمد اسمٰعیل منیرؔ جو ناسخی خاندان کے چشم و چراغ تھے یہاں تشریف لائے۔ شاعری کا ڈنکا بجایا۔ صوبہ کے ہر گوشہ سے اہل ذوق جمع ہوئے۔ مشاعرے بہار پر آئے۔ مرشیانہ روزانہ ہی کا چرچا ہونے لگا۔ شعراء نے عموماً اور منیرؔ کے شاگردوں نے خصوصاً ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنے کے لئے جان توڑ کر غزلیں کہیں۔ بزم سخن گلہائے مضامین سے مہک اٹھی۔ طرحی مشاعروں میں ہر شاعر دو غزلہ و سہ غزلہ کہکر لاتا اور جتنے قافیے ہوتے سب کو باندھتا حتیٰ کہ مبتذل سے مبتذل قافیوں کو بھی سنوارنے کی کوشش کرتا۔ وہ محفل تو درہم برہم ہو گئی مگر اس کی جیتی جاگتی یادگار حضرت تاباںؔ اور بزم اکبر آبادی ابھی موجود ہیں۔ خدا دونوں کو صحت بدنی کے ساتھ زندہ و قائم رکھے۔ اس زمانہ میں الہ آباد کی شاعری شباب پر تھی۔ اکبرؔ۔ نیساںؔ۔ قیصرؔ۔ افسرؔ۔

شاعری کے اربعہ عناصر خیال کئے جاتے تھے ۔ اکبر نے طرز جدید اختیار کی نیساں نے زمین شعر پر گل و بوٹے اُگائے ۔ نادر تشبیہوں اور جدید استعاروں کی خلعت فاخرہ سے شاہد مضمون کو آراستہ کرکے نظر فریب بنایا ۔ تبصر و انسر نے قدیم روش کو زندہ رکھ کر مضامین کے دریا بہائے ۔ دریا آباد میں فضل علی خاں صاحب کے محل میں مشاعرے کی صحبتیں گرم رہا کرتی تھیں ۔ غذائے روحانی کے ساتھ غذائے جسمانی کا بھی انتظام ہوتا تھا ۔ امیر انہ کھانا ہوتا تھا اور سارا شہر مدعو کیا جاتا تھا ۔ بعض ناعاقبت اندیش شاگردوں کی وجہ سے ایک دفعہ کچھ مناقشہ ہوا ، بزم مشاعرہ کا فرش میدان جنگ بنا ۔ دونوں جانب سے لکڑیاں چلنے لگیں ۔ ادھر محفل کے جھاڑ و فانوس ٹوٹے اُدھر شاہد سخن کا دل ٹوٹا ۔ محفل درہم برہم اور شمع سخن کچھ دنوں کے لئے گل ہوگئی ۔ اس شان کے مشاعرے پھر دیکھنے میں نہ آئے ۔ انھیں شاگردوں نے اپنی ٹولیاں بناکر چھوٹے چھوٹے مشاعرے شروع کر دئے جس سے کلام میں ترقی اور ادب کے ذخیرہ میں اضافہ تو ہوا مگر جوش اور مقابلہ کی گھما گھمی باقی نہ رہی ۔ چند شاعروں کا کلام سناتا ہوں ۔

(۱۱) آسان ۔ لالہ بھیم رام الٰہ آباد کے رہنے والے تھے ۔

مرنے کے بعد تا بہ حشر آنکھیں جو میری وا رہیں
مجھ کو تو کچھ خبر نہیں کس کا یہ انتظار تھا

(۱۲) حیرت ۔ محمد جان خاں یار خاں کے بیٹے الٰہ آباد کے رہنے والے تھے ۔

مدفن سے میرے اٹھ کے بگولہ جو رہ گیا ۔ کہنے لگے وہ خاک کسی ناتواں کی ہے

(۱۳) سجاد ۔ میر علی سجاد نام ۔ میر صفدر علی کے لڑکے تھے ۔ موضع کڑا ضلع الٰہ آباد کے رہنے والے تھے پہلے تحصیلداری کے عہدہ پر فائز ہوئے بعد ترقی پا کر ڈپٹی کلکٹر مقرر ہوئے ۔ رشک سے اصلاح لیتے تھے ۔ صاحب دیوان گذرے ہیں ۔

صدقے ترے قد پہ لاکھوں خوش قد ۔۔۔ آنکھوں پہ فدا ہزار آنکھیں
گلرنگ ہیں آستین و دامن ۔۔۔ دکھلاتی ہیں کیا بہار آنکھیں

(۱۴) **افسر** - مولوی سید عزیز الدین حیدر ابن سید علی حمزہ - شاگرد وحید ساکن کڑا الہ آباد کے باشندے تھے - کچھ دنوں کے لئے حیدر آباد بھی تشریف لے گئے تھے - نہایت پُرگو اور پختہ کار شاعر تھے - آخر عمر میں نابینا ہو گئے تھے - صاحب دیوان ہیں ؎

عالم کا رنگ کیا کیا ہوگا نہ تھا نہ اب ہے ۔۔۔ لیکن حبیب تم سا ہوگا نہ تھا نہ اب ہے
یوں آنکھ بدلی تمنے ہنستے ہی ہنستے مجھ سے ۔۔۔ کچھ واسطہ ہی گویا ہوگا نہ تھا نہ اب ہے
دل لینے میں ہمارے اب سوچ تمکو کیا ہے ۔۔۔ لکھدیں کہ ہم کو دعوی ہوگا نہ تھا نہ اب ہے
تیرا نظیر ہونا ہے یہ مثال رکھتا ۔۔۔ جیسے خدا کا ہمتا ہوگا نہ تھا نہ اب ہے

زندہ ہوں یا مردہ حال ایسا بھی ہے ویسا بھی ہے
اب تو کچھ دن سے خیال ایسا بھی ہے ویسا بھی ہے
قید رکھے عمر بھر دم بھر نہ رہنے دے اسیر
آپ کی زلفوں کا جال ایسا بھی ہے ویسا بھی ہے
عمر بھر منہ سے نہ بولے ہنس پڑیں اک بات پر
آپ کا مجھ سے ملال ایسا بھی ہے ویسا بھی ہے

حال کیا پوچھتے ہو نشہ میں سرشار تو ہوں ۔۔۔ بیٹھو کیفیتیں بتلاؤنگا ہشیار تو ہوں
بال بال الفت گیسو میں پھنسا کر مجھ کو ۔۔۔ کہتے ہو جاؤ - کہاں جاؤں گرفتار تو ہوں
گل رنگیں نہ سہی سبزۂ بیگانہ سہی ۔۔۔ گو کسی رنگ سے ہوں زینت گلزار تو ہوں

مجھے دکھلائی خضر عشق نے انکی گلی اچھی ۔۔۔ یہیں سے جھک کے اب دیر و حرم کو بندگی اچھی
اکیلے سوز و ساز اچھا نہ تنہا میکشی اچھی ۔۔۔ حقیقت ہے اسکا غم بھلا اسکی خوشی اچھی

(۱۵) قیصر تخلص شاہ امین الدین نام۔ الہ آباد کے ایک معزز خاندان کے رکن تھے اور ۱۲۵۳ھ میں پیدا ہوئے۔ عربی و فارسی کی درسی کتابوں کا تکملہ آپ نے آگرہ میں کیا اور وہیں مرزا اعظم علی اعظم شاگرد آتش کے شاگرد ہو گئے۔ اپنے والد کے انتقال کے بعد الہ آباد کی دیوانی میں مختلف عہدوں پر کام کرکے پنشن لی اور خانہ نشین ہو گئے۔ رسولِ خدا کی شان میں کئی نظمیں لکھیں "گلدستۂ نبوت" اور "نظم دل افروز" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ۸ محرم ۱۳۲۴ھ میں انتقال کیا ؎

گریباں گیر ہوتا کیوں لہو پھر میری گردن کا
کفن ملتا اگر بعدِ فنا قاتل کے دامن کا

جو پہنا طوقِ منت اس طرف اس آفت جاں نے
جنوں نے اس طرف ساماں کیا زنجیر آہن کا

کیا ہے پرزے پرزے تو نے اے دستِ جنوں ایسا
رفو ہونا نہیں ممکن ہمارے جامۂ تن کا

خیال دل میں جو آیا سیاہ کاری کا   سفید ہو گئے مثلِ کفن مزار پہ ہم

نیساں ۔ میر علی عباد صاحب نام۔ الہ آباد کے معزز و مفتخر خاندان کے رکن تھے۔ عربی و فارسی میں کافی دستگاہ رکھتے تھے۔ سلطنت برطانیہ میں تحصیلداری کے عہدہ پر فائز تھے۔ نہایت خلیق اور عالی حوصلہ بزرگ تھے۔ منشی میر کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ دیوان میر میں بہت سے شعر ملتے ہیں جس میں منشی صاحب مرحوم نے اپنی محبت سے نیساں صاحب کی تعریف کی ہے۔ نہایت پرگو اور صاحب کمال تھے۔ کسی صنفِ شاعری میں بند نہ تھے۔ قصیدہ، غزل، مرثیہ، رباعی، مثنوی سب ہی کچھ کہتے تھے۔ تشبیہ و استعارے کے بادشاہ تھے جس مضمون کو جس طرح چاہتے تھے باندھ دیتے تھے۔ ان کے زمانہ میں سارا شہر شاعر بن گیا تھا۔ طرحی مشاعرہ جب ہوتا تو پانچ چھ سو شعر کہہ کر رکھ لیتے۔ لوگ

غزلیں مانگنے آتے اور اجازت پاکر کاغذ سے نقل کر لیتے کبھی ایسا بھی ہوتا ایک ہی شعر دو شاعروں کی غزل میں پہونچ جاتا ۔ عقل شعر میں ایک لطف پیدا ہوجاتا تھا ۔ ایسا فیاض شاعر نظر سے نہیں گذرا ہے

خنجر یار پس ذبح چمکتا نکلا — آستین رگ جاں سے ید بیضا نکلا
دل سے میرے نہ خیال مژہ یار گیا — نہ کبھی پائے تصور سے یہ کانٹا نکلا

تصوف

فلک سے پھولوں کا گہنا حضور سیم بر آیا — گلے کے ہار میں گندھ کر گل داغ قمر آیا
جسے دیکھا اسی کے پردے میں تو ہی نظر آیا — ہر اک جامہ نہایت ٹھیک تیرے جسم پر آیا

زبان

یہ تو سچ ہے کہ مری آہ میں تاثیر نہیں — دونوں ہاتھوں سے جگر کس نے سنبھالا اپنا
چھپ کے آئینۂ دل توڑ نہ اے پردہ نشیں — ایک تو رہنے دے منہ دیکھنے والا اپنا

عالی ہے جن کا ظرف منور رہیں انکے دل — کاہی ہوئی نہ ساغر خورشید و ماہ پر
دل کی کشش اگر ہے سلامت تو دیکھنا — لائیں گے کھینچ کر تمھیں اک روز راہ پر
رحم آگیا کسے مرے حال تباہ پر — قربان صبح عید ہے روز سیاہ پر

آئی خدا کی یاد دم واپسیں تو کیا — آنکھیں کھلیں تو وقت نماز سحر نہ تھا
برسوں بتوں کے عشق میں تقدیر سے لڑا — بندہ اُدھر رہا کہ خدا بھی جدھر نہ تھا
بھڑکا دیا ہوا سے تمنائے وصل نے — اتنا بلند شعلۂ داغ جگر نہ تھا
یہ کیا ہوا کہ بیٹھ گئے دل کو تھام کے — پھر کہئے تیرے نالۂ دل میں اثر نہ تھا
کعبہ میں شمع دل میں چھپا دیر میں چراغ — نور جمال یار کہاں جلوہ گر نہ تھا

---

(۱۷) اکبر ۔ تخلص میر اکبر حسین نام ۔ بڑے معزز خاندان کے چشم و چراغ تھے ۔ عہدہ ڈسٹرکٹ ججی سے پنشن لی ۔ شاعر شیریں کلام تھے ۔ سنجیدہ ۔ صوفیانہ ۔ سیاسی ۔ مذاقیہ ۔ قومی ۔ اخلاقی غرض ہر مضمون کی شاعری ان کے یہاں ملتی ہے

سوسائٹی کی اصلاح منظور نظر تھی چنانچہ ایسے شعر کہتے تھے کہ سنتے ہی آدمی ہنس پڑے اور پھر خود ہی شرمندہ ہو کر اپنی اصلاح پر آمادہ ہو۔ زبان ہندی کے زمانہ میں بھی سیاست کی شاعری کرتے تھے اور ڈھکے چھپے سب کچھ کہہ جاتے تھے۔ جو رنگ آپ نے اختیار کیا تھا وہ آپ کی ذات پر ختم ہو گیا۔ شاعر باکمال تھے۔ بچے بچے کی زبان پر نام اور ہر دل میں آپ کی جگہ ہے خدا غریق رحمت کرے۔ اگر الہ آباد سے سب کچھ لے لیا جائے تو ایک اکبر کی ذات اس کی افضلیت اور شرف کے لئے کافی ہے ؎

مشرقی کو ہے ذوقِ روحانی مغربی کو ہے میل جسمانی

کہا منصور نے خدا ہوں میں ڈارون بولا بوزنہ ہوں میں
ہنس کے کہنے لگے مرے اک دوست فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

اپنی منقاروں سے حلقہ کس رہے ہیں جال کا طائروں پر سحر ہے صیاد کے اقبال کا

تذکرۂ صاحب نسب نا ہے وہ وقت آیا ہے بے اثر ہو گی شرافت مال دیکھا جائیگا

سینے کا زخم آہ کی سختی سے چھل گیا اچھا ہوا مزہ تو محبت کا مل گیا
ہوتا ہے انبساط غذاے لطیف سے غنچے کو دیکھئے کہ ہوا کھا کے کھل گیا
وہ مطرب اور وہ ساز وگانا بدل گیا نیندیں بدل گئیں وہ فسانہ بدل گیا
فطرت کے ہر اثر میں ہوا ایک انقلاب پانی فلک پہ کھیت میں دانہ بدل گیا

بتکدے میں شور ہے اکبر مسلماں ہو گیا بے وفاؤں سے کوئی کہدے کہ ہاں ہاں ہو گیا

کر گئی کام نگاہ مس پر فن کیسا بچ چلے دیر و حرم شیخ و برہمن کیسا
اس کو چکر ہی رہا اور یہ خدا تک پہونچا دل پر سوز جو ہاتھ آئے تو انجن کیسا

ارشاد جو ہوتا ہے کہ لکھو صفت دہن کچھ معلوم ہوا آپ مجھے تنگ کریں گے

سامان تکلف نظر آئیں گے جو ہر سو جنت میں بھی یاد آئیگا کاشانہ کسی کا

کھیل جینے کا کھیل ہی لیں گے جو گذرتی ہے جھیل ہی لیں گے

فلسفۂ غم کا جسے معلوم ہے ہو مبارک وہ اگر مغموم ہے

(۱۸) **ملتجی** - کندن لال سکسینہ ساکن الہ آباد -

چلتے ہیں اُٹھائے ہوئے دامن وہ ادا سے سائے کی توقع نہ رہی بال ہما سے

ابرو تہ لوح جبیں، نیچے ہلال اوپر قمر
ہم جنس دونوں ہم نشیں نیچے ہلال اوپر قمر
محراب پر کھنچوائی ہے تصویر اپنے یار کی
اس عقل پر صد آفریں نیچے ہلال اوپر قمر

دور چہارم سنہ ۱۹۰۱ء تا حال

اس دور میں تیسرے دور کے کچھ شعراء بھی شامل ہیں۔ یہ دور موجود شعراء کا ہے۔ آپ حضرات ان کا کلام سنتے رہتے ہیں طول کے خیال سے اقتباسات نہیں پڑھوں گا۔ ہاں اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آغاز دور میں شعر گوئی کی طرف لوگوں کی توجہ کم ہو گئی تھی۔ مشاعرے بھی خال خال ہوتے تھے۔ اصول معاوضہ اور دادستد کی لہر لوگوں کے رگ و پے میں دوڑ گئی تھی۔ شعر گوئی کو فضول و بیکار سمجھ کر اس کی جانب سے بے اعتنائی برتنے لگے تھے۔ اردو پر جب کبھی ایسی افتاد پڑی ہے تو قدرت نے غیب سے اس کی امداد کے سامان بہم پہنچائے ہیں۔ سنہ ۱۹۱۳ء میں جناب

ناصری صاحب مرحوم میور کالج میں پروفیسر علوم مشرقیہ ہو کر آئے - میری طالب علمی کا زمانہ تھا لیکن شاہد سخن سے بھی کچھ راہ و رسم تھی - موصوف کی توجہ اور اس حقیر کی کوشش سے مشاعرے شعراء کے حلقے سے نکل کر طالب علموں کی جماعت میں پہونچے - پہلا مشاعرہ مسلمان بورڈنگ ہاؤس میں بڑے آب و تاب سے ہوا - لوگوں کو دلچسپی پیدا ہوئی - کچھ ہی دنوں میں ہر کالج و اسکول میں مشاعرے ہونے لگے اور اس زور کے ہوئے کہ سارے صوبے میں دھوم مچ گئی - دور دور شعلۂ شوق بھڑکا اور شعر و شاعری کا وقار بڑھا - ناصری صاحب مرحوم کے چلے جانے کے بعد گو میں تنہا رہ گیا تھا لیکن ارباب ذوق کی مدد سے محفل سخن کی گرما گرمی میں کمی نہیں ہونے پائی - سنہ ۱۹۱۶ء سے برابر اس وقت تک ایک مشاعرہ ہر انگریزی مہینے کے پہلے اتوار کو حقیر کے مکان پر ہوتا ہے جس میں اہلِ ذوق تشریف لاتے ہیں - علاوہ اس کے اراکین شہر کے یہاں برابر شعر و سخن کا ذکر رہتا ہے - اہلِ علم اور ارباب ذوق کی توجہ کا نتیجہ ہے کہ یہاں کی شاعری کو روز افزوں ترقی ہے - زبان و ادب کی ترقی کے لئے مختلف جماعتیں قائم ہیں - جن میں مقالہ خوانی - بحث و تمحیص اور تقریریں ہوتی رہتی ہیں - انجمن "روح ادب" خود اپنی صورت حال سے اس کی شاہد ہے - سنہ [illegible] سے ابتک تو کم دو سو برس کا زمانہ گذرا ہے اس دوران میں الہ آباد نے جو اردو ادب کی خدمت کی ہے اس کو سرسری طور پر بیان کرتا ہوں تاکہ ذہن میں ایک خاکہ قائم ہو جائے -

نظم میں بہ اعتبار شکل کے رباعی - قطعہ - غزل - قصیدہ - مثنوی - مثلث، مخمس، مسدس، ترجیع بند، ترکیب بند وغیرہ اور بہ اعتبار مضامین کے مرثیہ - سلام - نوحہ - سوز - ماتم - نعت - منقبت اور عشقیہ - رزمیہ - تاریخی نظمیں یا مستقل مضامین پر نظمیں - قومی - اخلاقی :

اصلاحی نظمیں ۔ مذاقیہ نظمیں ۔ ریختی ۔ ہجو ۔ غرض ہر قسم کی شاعری موجود ہے ۔ کلام میں صاف ۔ سادہ زبان ۔ استعارہ ۔ تشبیہ ۔ بنوٹ اور صنعتیں بھی پائی جاتی ہیں ۔ نثر سے بھی اہل علم بے اعتناء نہیں رہے ۔ نثر میں فقہ ۔ مواعظ ۔ قصص ۔ قواعد ۔ تعلیم نسواں ۔ انشاء و خطوط ۔ ناول و ڈرامہ کی کتابیں تیار ہوئیں ۔ ریاضی ۔ جغرافیہ ۔ تاریخ ۔ سوانحعمری ۔ لغت ۔ قانون ۔ طب ۔ زراعت و باغبانی وغیرہ پر بھی کتابیں لکھی گئیں ۔ عالمانہ ، صوفیانہ ۔ ظریفانہ اور سنجیدہ طرز تحریر کے مضامین سے بھی دامن خالی نہیں ہے ۔ مذاق جدید کی نظم و نثر بھی پائی جاتی ہے اور ترقی کرتی جاتی ہے ۔

اگر نظر غور سے دیکھا جائے تو الہ آباد نے اردو ادب کے خزانے کو مختلف رنگ و ڈھنگ کے جواہرپاروں سے مملو کرنے کی کوشش میں کمی نہیں کی ۔ اہل علم اور ارباب قلم اپنی خدمت سے غافل نہیں ہیں اور کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں ۔ اس صوبہ کی ہندوستانی اکیڈیمی کے منشاء عامہ میں الہ آباد کے اہل قلم اور ارباب علم کے بھی کئی مطبوعات ہیں ۔ بیجا نہ ہوگا اگر یہ بھی عرض کروں کہ الہ آباد یونیورسٹی پہلی یونیورسٹی ہے جس نے اُردو کو بی ۔ اے اور ام ۔ اے کے امتحانی مضامین میں جگہ دی ۔ جن طالب علموں نے اردو میں ام ۔ اے اور بی ۔ اے کیا ہے انھیں سے اکثر آئی ۔ سی ۔ ایس ۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس ۔ ڈپٹی کلکٹر ہیں ۔ بعض تعلیمات اور دیگر محکموں میں بھی معزز عہدوں پر ممتاز ہیں ۔ یہ سن کر آپ حضرات کو مسرت ہوگی کہ اپنے فرائض کی انجام دہی اور سرکاری کام کی کثرت میں بھی یہ سب اردو نظم و نثر کی خدمت میں مصروف رہتے ہیں ۔ ان میں سے کئی حضرات

صاحبِ تصانیف اور صاحبِ دیوان ہیں ۔ ان لوگوں سے مجھے امید ہے کہ اسی طرح وہ اُردو کی خدمت کرتے رہیں گے۔

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

دورِ اوّل ۱۷۵۰ء سے ۱۸۰۰ء تک

بیتاب

شاہ محمد علیم الدین۔ قاضی فخر الدین کے چھوٹے بھائی تھے۔ شاہ عالم بادشاہ کے زمانے گزرے۔ صاحب تذکرہ گلزار ابراہیم لکھتے ہیں "از سلسلۂ نجباد با علوم رسمیہ آشنا است۔ ہرچند راقم اور را ندیدہ صفات حمیدۂ او از زبان بعضے شنیدہ"

رفتہ رفتہ بہت خوش قدم را آفت ہوگا — قدم آگے جو رکھے گا تو قیامت ہوگا

نگیں کی طرز یہ کیا مجھ کو سخت بھاتی ہے — کہ ایک نام کی خاطر جگر کھداتی ہے

رفعت

شیخ محمد رفیع الہ آبادی۔ ایک عرصہ تک نواب عالیجاہ میر محمد قاسم علیخاں کے ساتھ رہے۔ اس کے بعد پٹنہ میں اقامت اختیار کر لی تھی۔ بڑے شگفتہ مزاج آدمی تھے۔

کیا جگر ہے کہ ترے در پہ فغاں کرتے ہیں — ہم تو آہستہ قدم رکھتے ہوئے ڈرتے ہیں

کیا کرتا ہے اکثر نالۂ جانکاہ پہلو میں — الٰہی دل ہے میرا یا کوئی بدخواہ پہلو میں

مصیب

مصیب تخلص، حاجی شیخ غلام قطب الدین ولد حاجی محمد فاخر بن شاہ خوب اللہ الہ آبادی مکہ معظمہ میں بعد ادائے حج ۱۱۸۷ھ مطابق ۱۷۷۳ء انتقال کیا۔ صاحب دیوان گذرے ہیں۔ اُردو و فارسی دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کرتے تھے۔

شبِ فرقت میں تری او ظالم — ہو گیا خواب خواب آنکھوں میں

کون گلشن میں کہو مشک کی بو لاتی ہے ۔ کہتے ہیں زلف کے کوچہ میں صبا جاتی ہے

منتظر الہ آبادی

خواجہ بخش اللہ نام ۔ بڑے خلیق، ملنسار اور سلیم الطبع تھے (۱۷۷۶ء مطابق ۱۱۹۰ھ) ۔

یہی ڈھب جو تیرا مرے یار ہوگا ۔ قسم تیغ کی ایک خونخوار ہوگا

تیرے تھے میاں خواہ ترے خواہ بیگانے ہم ۔ لے یار تو خوش رہ کہ ترے در سے چلے ہم

بجز و اتنا ہے نہ کچھ ایسا نہ کچھ تقریر ہے ۔ منتظر کے ہاتھ میں شاید تری تصویر ہے

نثار

منشی سدا سکھ خلف منشی سیتل پرشاد دہلی کے رہنے والے تھے لیکن الہ آباد میں اقامت اختیار کر لی تھی ۔ بھاکا و فارسی میں بھی کہتے تھے ۔ سودا کے شاگرد تھے ۔ کئی دیوان اور مثنوی ان سے یادگار رہیں ۔

ہمارا ہی دل جب ہمارا نہیں ہے ۔ تو شکوہ ہمیں کچھ تمہارا نہیں ہے

کیا ستمگار ہے جو جانے کو تم نے اب کے بہ چشم ۔ کہ بال بال ذرا اشک جو پروئے ہیں

فرحت

مرزا الف بیگ ۔ آپ کے دادا باہر سے آ کر ہندوستان میں رہنے لگے ۔ سپہ گری پیشہ تھے ۔ اپنے عہد میں الہ آباد میں بے مثل شاعر شمار کئے جاتے تھے ۔

عزیز

بھکاری داس دہلوی شاگرد خواجہ میر درد ۱۱۹۶ھ مطابق ۱۷۸۱ء میں الہ آباد میں تھے ۔

ایسا ہے لعل لب کا ترے رنگ یار سرخ ۔ یاقوت بس کے آگے لگے ایک سنگ سرخ

کرے نہ یار اگر صاف دل کو کینے سے ۔ عزیز موت بھلی پھر تو ایسے جینے سے

ملیں کیونکر بھلا اس شوخ طفل لاابالی سے ۔ کہ سوتے سوتے جو چونکے ہے تصویر خیالی سے

جنوں

شیخ غلام مرتضیٰ درویش سہسرامی تھے اور مولوی محمد برکت علی کے شاگردوں میں تھے۔ آخر ایام میں نابینا ہوگئے تھے۔

وجود اس جہاں کا عدم دیکھتے ہیں ۔ عجب خواب ہے یہ جو ہم دیکھتے ہیں
مٹے ہے ابھی پیچ و تاب اپنے دل کا ۔ جب اس زلف کا پیچ و خم دیکھتے ہیں

آفت جاں ہوگئی آخر یہ بینائی مجھے ۔ جو بلا کہیے سو ان آنکھوں نے دکھلائی مجھے
دل مرا ہر شب الجھتا ہے صنم کی زلف میں ۔ ایک دم کب چین دیتا ہے یہ سودائی مجھے

تری چشم مست سے ساقیا جنوں ایسا مست تو ہوگیا
کہ مئے دو آتشہ طاق پر جو دھری تھی وہ وہیں دھری رہی

محزوں

محزوں تخلص مولوی سید محمد تقی موسوی، مولوی محمد برکت مرحوم کے اچھے شاگردوں میں تھے۔ بڑے بردبار اور خوش تقریر تھے اور فارسی و اردو دونوں میں کہتے تھے۔

صنم اگرچہ تری جستجو سیاہ دیکھتا ہوں ۔ بہر طرف تری زلفوں سے راہ رکھتا ہوں

اجمل

شاہ محمد اجمل الہ آبادی غلام قطب الدین صاحب کے چھوٹے بھائی تھے۔ سے بزرگ ! مشہور خاندان سے تھے ۱۲۳۶ھ مطابق ۱۸۲۰ء میں انتقال کیا زیادہ تر فارسی کہتے تھے۔

شاد تھا دل ہر طرف سے ہر بیں جب جانا نہ تھا
ہائے کیسی رات تھی جس رات وہ مہمانہ تھا
ہوگیا تھا کہتے کہتے ان دنوں کچھ ہوشیار
پھر جو دیکھا کل میں اجل کو وہی دیوانہ تھا

وارث

وارث تخلص حاجی شاہ محمد وارث۔ شاہ قطب الدین مصیب کے شاگرد و خلیفہ گزرے۔ صاحب دیوان تھے۔

پڑا ہے سنگ دلوں سے مقابلہ دل کا — نہ ٹوٹ جائے میں ڈرتا ہوں آبلہ دل کا

ہمارے آہ اور نالے فلک تک جا کے پہنچے ہیں — اگر ہوتا نہیں وہ بیخبر آگاہ کیا کیجے

بتا تو اے مرے ظالم مثال نقش قدم — تری گلی میں کوئی گر کے پھر اٹھا بھی نہیں

کیا آہ ناتواں مری اس کو اثر کرے — اک عمر چاہئے کہ لبوں تک گذر کرے

مفتوں الٰہ آبادی

کاظم علی نام۔ حالات اور شعر نہیں مل سکے۔

شیخ محمد افضل، احقر و حقیر تخلص کرتے تھے اور شاہ محمد ناصر افضلی شاہ میرن جان، سید حکیم افضل کامل، حکیم مظہر الحق مظہر، مفتی اسد اللہ اور شاہ محمد زاہد عرف شاہ حاجی جان فارسی و اردو میں شعر کہتے تھے۔ افسوس ہے کہ ان بزرگوں کے نہ مفصل حالات معلوم ہوسکے اور نہ کلام دستیاب ہوا۔

دورِ دوئم سنہ ۱۸۰۰ء سے سنہ ۱۸۵۰ء تک

مشاغل

شیخ امیرالدین معروف بہ مولوی امیر اللہ باشندہ کڑا۔ مصحفی کے شاگرد تھے اور الہ آباد میں وکالت کرتے تھے۔

بیقراری سے مری آہ وہ آگاہ نہیں　　جس کا میں چاہنے والا ہوں اسے چاہ نہیں

عالی

عالی تخلص شاہ ابو المعالی۔ حضرت شاہ اجمل اجمل کے لڑکے تھے اور ہر دو زبان فارسی و ریختہ میں شعر کہتے تھے۔ میر کے شاگرد تھے۔

نور تجلی یہ نہیں موسیٰ طور پہ ایسا جلوہ کہاں ہے
آکے ہمارے نور نظر نے پردہ میں دکھلائیں آنکھیں
خانہ خراب ہو اس چاہت کا دن کو نہ چین نہ خواب ہے شب کو
آنکھ لگی اک پل نہ ہماری جب سے تم نے لڑائیں آنکھیں

اعظم

اعظم تخلص سید اعظم علی الہ آبادی اکبر آباد کے مدرسہ میں منشی تھے۔ آتش کے شاگرد اور صاحب دیوان گزرے۔

خنجر کا نہ بسمل ہوں نہ شمشیر جفا کا　　انداز کا مقتول ہوا کشتہ ہوں ادا کا

چھوڑ کر کے جیتے رد تانہ کرو عزم سفر　　جان من موسم بارش تو نکل جانے دو

کچھ مفت نہیں وعدۂ دیدار کیا ہے　　جب لاکھ قسم دی ہے تو اقرار کیا ہے

جلوہ جو کوہ طور کا موسیٰ کے سامنے　　مخفی حیا کھول دو دید بیضا کے سامنے

مستعد ہیں وہ اگر جور و جفا کے اوپر — ہم بھی بیٹھے ہیں کمر کس کے وفا کے اوپر

افضل

افضل تخلص شاہ غلام اعظم خلف شاہ ابوالمعالی بن حضرت شاہ محمد اجمل صاحب ناسخ کے شاگرد تھے۔ آپ سے چار دیوان اور ایک مثنوی یادگار ہیں۔ منشی منیر نے آپ کی بعض غزلوں پر مصرعے لگائے ہیں۔

ہے یقیں نورِ بصارت ہو زیادہ افضل — سرمۂ خاک مدینہ لگے گر آنکھوں میں

غربت میں مجھے جوں ہی خیالِ وطن آیا — ہونے لگی پاؤں پہ مرے گردِ سفر بار

پھوٹیں مری آنکھیں جو کسی اور کو دیکھوں — ناحق نہ سنا کیجئے افواہ کسی کی
جی جائے جگر ٹکڑے ہو پھٹ جائے کلیجہ — کیا تجھ کو خبر اے بتِ گمراہ کسی کی

دو لب جاں بخش ایک ہیں زار کس کا ہو رہوں — دو مسیحا ایک ہیں بیمار کس کا ہو رہوں

قدسی

سید محمد اکبر نام عرف محمد جان خلف شاہ علی جعفر حضرت شاہ اجمل کے نواسے تھے لکھنؤ جاکر آتش کے شاگرد ہوئے تھے۔ ایک دیوان آپ کی یادگار رہا۔

یاد آتی ہیں کافر جو ملاقات کی راتیں — کٹتی کسی عنواں نہیں برسات کی راتیں

تری بلائیں نہ لیں پاؤں بھی نہیں دابے — یہ ہم سمجھتے ہیں بیکار ہیں ہمارے ہاتھ

اشرف

اشرف حسین خاں الہ آباد کے رہنے والے تھے اور منشی حسین خاں ناطق سے اصلاح لیتے تھے۔ عدالت دیوانی بنارس میں ناظر تھے۔

ہے بحر پہ کبھی تو کبھی کوہ و دشت میں — یک جا نہیں مقام ہمارے غبار کا

اصغر

سید اصغر علی وطن آپ کا بہار لیکن پیدا الہ آباد ہی میں ہوئے تھے اور یہیں وکالت کرتے تھے۔

جوڑے پہ ہوا اشک کہ یہ ہے نافۂ تاتار — میں زلف کو سمجھا کہ یہ مشک ختنی ہے

تابش

تابش تخلص محمد جعفر نام وطن ان کا الہ آباد تھا لیکن دہلی میں گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔

کبھی بن یاد وہ رہ نہیں سکتے — تو یہ کچھ ہم کو سازگار نہیں
دل میں تو خوش ہیں عدو پہ لے تابش — وہ ستمگر کسی کا یار نہیں

تحسین

سید حیدر علی الہ آباد کے رہنے والے تھے۔ توکل اختیار کیا تھا۔

ہم تم پہ لے بتا ان دل آزار زار ہیں — لیکن ہزار حیف کہ اغیار یار ہیں

ظفر

شیخ فتح علی باشندہ الہ آباد۔ الہ آباد میں مختاری کرتے تھے۔

اس سے نہ کھینچا تھا مرا زائچہ حال سیاہ — اے خدا کیوں نہ ہوا قرعۂ رمال سیاہ

عیار

سید تراب علی پرگنہ مہ کے رہنے والے تھے الہ آباد میں منصفی کے عہدہ پر مامور تھے۔

سر کون ہے کہ تیغ ستم سے قلم نہیں — وہ دل ہے کون سا کہ تری جبیں غم نہیں

فدا

مرزا محمد خلف مرزا اسمٰعیل بیگ الہ آباد میں تحصیلدار تھے۔

ہے رنگ نرالا گل و گلزار میں یاں سے | اک نوک نکلتی ہے ہر اک خار میں یاں کے

قائل

مولوی فصیح اللہ الہ آبادی۔ آپ مولوی امیر اللہ شائق کے بھائی تھے۔

خاک وا کسیر کی ہے قدر برابر مجھ کو | کر دیا فقر کی دولت نے تونگر مجھ کو

ہاشمی

سید اکبر علی۔ الہ آباد میں متوطن تھے۔

جام دے ساقی مجھے صہبائے تند و تیز کا | مست ہوں دیکھوں تماشا سبزۂ نوخیز کا

اہل

شریمتی جانکی بی بی۔ الہ آباد کے قوم کایستھ سے تھیں۔ بڑی ذہین اور خوش فکر شاعرہ تھیں ۱۸۸۵ء میں بقید حیات تھیں۔

توڑنے تو رہا کر ہی دیا زلف دوتا سے | ہم جان سے جائیں بھی تو اب تیری بلا سے
ملتا ہے وہ مضمون ہمیں ذہن رسا سے | رہ جاتا ہے جو بندش فکر شعرا سے
کعبہ کی طرف نشہ میں کس طرح سے جاؤں | دشوار سنبھلنا ہے مجھے لغزش پا سے
لایا جو شب ہجر میں اے اہل زباں پر | تاثیر ہم آغوش ہوئی آکے دعا سے
اس گل کا نہ لائے کبھی پیغام مرے پاس | شرمندہ کبھی میں نہ ہوا باد صبا سے
آتا ہے نظر ہاتھ میں اس شوخ کے جب تیغ | ہوتا ہے لہو خاک مرا رنگ حنا سے
مارا ہے جنھیں آپ نے آنکھوں کی حیا سے | اب ان کو جلاؤ لب اعجاز نما سے
شانہ جب الجھتا ہے تری زلف دوتا سے | ڈرتا ہے ہمارا دل صد چاک بلا سے
تا حشر جدا ہوں نہ مبیں امر جو بقا سے | خواہش ہے اگر دل میں تو اتنی ہے خدا سے
لیکن کہیں چھپائے کو کرے مجھ کو نہ بدنام | اتنا ہے فقط خوف ترے دزد حنا سے

بیہوش کچھ ایسے ہوئے ساقی کی صلا سے — باقی نہ رہے خواہش مے بادہ کشوں کو
آرام ہے بڑھ کر کہیں نقش کف پا سے — سچ پوچھئے تو خاک در یار پہ ہم کو

جیمل

خلف منشی موتی لال ساکن الہ آباد محافظ دفتر کلکٹری بنارس۔

ہوئے کیسے کیسے جوانمرد پیدا
بنائے زمیں پر مکاں کیسے کیسے

دورِ سوم ۱۸۵۸ء سے ۱۹۰۰ء

آثم

سید غلام مصطفیٰ، آثم، آپ مصطفیٰ آباد متعلقہ الٰہ آباد کے زمیندار تھے۔

کب تصور میں تری زلف گرہ گیر نہیں   مجھ سے سودائی کو کچھ حاجتِ زنجیر نہیں

احمد

احمد تخلص احمد علی نام سکندرہ کے رہنے والے الٰہ آباد میں سررشتہ دار سرسری تھے۔

روبرو آئینہ رویوں کے رہے ہے رات دن   دل ہے قسمت واہ ری تقدیر روئے آئینہ

احمدی

احمدی تخلص مولوی نور الدین حسین مولوی نصیر الدین حیدر کے بیٹے۔ اصل وطن امیٹھی لیکن الٰہ آباد میں رہتے تھے۔

باغ میں زلفوں کو اپنے تم نے جو شانہ کیا   سنبلِ تر رشکِ غیرت سے پریشاں ہو گیا

آسان

لالہ سیج رام آسان الٰہ آباد کے رہنے والے تھے۔

مرنے کے بعد تا بہ حشر آنکھیں جو میری کھلی رہیں   تجھ کو تو کچھ خبر نہیں کس کا یہ انتظار تھا

باقر

باقر خاں، اصالت خاں کے لڑکے تھے اور الٰہ آباد میں رہتے تھے۔

ہائے افسوس چھٹا موسمِ گل ہی میں چمن   مجھ سے ناکام کوئی باغ میں صیاد نہیں

بہار

سید زین العابدین الہ آباد کے رہنے والے عدالت میں سرشتہ دار تھے۔

نعش بیمار پہ قاتل بھی کھڑا روتا تھا ـــ لبِ نازک کو دبائے ہوئے دندان نکلے

پریشان

محمد خاں الہ آباد کے رہنے والے تھے۔

میں اس کانِ ملاحت کے لئے ہر لحظہ روتا ہوں ـــ عجب کیا لختِ دل آنکھوں سے میرے ہو نمک نکلے

جعفری

محمد جعفر خوشنویس باشندہ الہ آباد اجمیر شریف میں رہتے تھے۔

ہے وہ پابندِ چمن مجھ کو یہ حسرت ہے کہ لوگ ـــ سرو کو کس لئے آزاد کہا کرتے ہیں

جواد

سید اسرار علی سید بیدار علی کے لڑکے اور الہ آباد کے رہنے والے تھے۔

دیکھا کرتا ہوں تجھے دیدۂ باطن سے صنم ـــ چشمِ ظاہر سے جو موقع نہیں بینائی کا

جوان

میر جعفر علی مرزا میر کے بیٹے الہ آباد میں رہتے تھے۔

گلچیں یہ کہہ رہا ہے چمن میں پکار کے ـــ مژدہ ہو بلبلو کہ دن آئے بہار کے
دزدِ حنا سے ڈر ہے بہت دستبرد کا ـــ مہندی لگائیں آپ تو چھلّے اتار کے

جولاں

سید قدرت علی الہ آباد کے رہنے والے تھے اور ریختی کہا کرتے تھے۔

آنو کہ چھوکری کو نواں اب کی سال ہے ـــ انّا جی رت جگے کا مجھے پھر خیال ہے

حبیب

مرزا جان، مرزا بادل بیگ۔ وطن ان کا الہ آباد لیکن قنوج میں رہتے تھے۔

خضر کیا کوچۂ دلدار کا رہبر ہوگا ہم نے دیکھے ہیں بہت راہ بتانے والے

حیرت

محمد جان خاں نام باز خاں کے بیٹے الہ آباد کے رہنے والے تھے۔

مرقد سے میرے اٹھ کے بگولا جو رہ گیا کہنے لگے وہ خاک کسی ناتواں کی ہے

خواہش

حاجی میر الہ داد، الہ آباد کے رہنے والے تھے لیکن دہلی میں اقامت اختیار کی تھی۔

تیرے آنے کی دھوم ہے دل میں حسرتوں کا ہجوم ہے دل میں

ہر قدم پر ہیں آفتیں برپا چال ہے یا کوئی قیامت ہے

ذاکر

سید ذاکر حسین، سید علی حسین کے بیٹے، تارس میں منصف تھے۔

بعد مردن بھی نہ کم گردشِ قسمت ہوگی تودۂ خاکِ لحد اپنا بگولا ہوگا

رقم

مولوی احمد حسین رقم خلف مولوی احسان اللہ باشندہ کڑا ضلع الہ آباد

نہ دیتا ہو نہ دو بوسے لبوں کے زباں کو پر کرو دشنام سے بند

سجاد

میر علی سجاد نام میر صفدر علی کے لڑکے موضع کہرا ضلع الہ آباد کے رہنے والے

کلکٹری میں محافظ دفتر تھے پھر تحصیلدار ہوئے اور ترقی کرکے ڈپٹی کلکٹری کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ رشک سے اصلاح لیتے تھے اور صاحب دیوان گذرے ہیں۔

صدقے ترے قد پہ لاکھوں خوش قد　　آنکھوں پہ فدا ہزار آنکھیں
گلرنگ ہیں آستین و دامن　　دکھلاتی ہیں کیا بہار آنکھیں

سخی

سید پرورش علی، سید بیدار علی کے لڑکے قصبہ کڑا ضلع الہ آباد کے رہنے والے تھے۔

دل کھلونا نہیں جو کہتے ہو　　ہم یہی لیں گے ہم یہی لیں گے
ہنس کے بولا یہ سخی کی قبر ہے　　جان دیدی لاکھ سمجھاتے رہے

صاحب

صاحب علی خاں الہ آباد کے رہنے والے تھے۔

خار اور حسن چھوڑتا ہے اب نہیں دامن مرا　　اور جنوں کو ہے مرے چاک گریباں کی ہوس

ضو

ضو تخلص منشی کمال الدین، اصلی وطن الہ آباد لیکن دہلی میں رہتے تھے۔

دیکھنا ہے تو دیکھ لو ضو کو　　آگے کیا جانئے کہ کیا ہو جائے

عشاق تفتہ جاں پہ کبھی اک نگاہ ہے　　اے برق منتظر ہے یہ مشت گیاہ بھی
مشکل نہیں ہے ربط کسی کا کسی کے ساتھ　　پر اس کے ساتھ شرط ہے کچھ اک نباہ بھی

عاقل

لالہ مکھن لال۔ عدالت کلکٹری الہ آباد میں نوکر تھے۔

بے نشانی اس چمن میں ہے نشان عندلیب　　شہپر عنقا ہے چوب آشیان عندلیب

ہے گلستانِ جہاں میں عاقلِ شیریں سخن   ہمصفیر و ہمنوا ہم داستاں ہمدم حبیب

عیاش

عیاش تخلص شیخ مدار بخش موضع منہاج پور ضلع الہ آباد کے زمیندار تھے ۔

دن کو آتا ہے نظر وہ مہِ خوبی عیاش   کہوں کیونکر اثرِ نالۂ شبگیر نہیں

فرحت

فرحت تخلص لالہ تنانند عدالت منصفی الہ آباد میں وکیل تھے ۔

پھولا ہے لالہ گلشنِ سینہ میں داغ سے   افسوس اس بہار میں وہ مہ جبیں نہیں

قادر

قادر تخلص مولوی عبد القادر خلف مفتی سید کرامت علی الہ آباد کے رہنے والے تھے

چشم کے چشمہ سے طوفاں نوح کا ہوگا رواں   ہوئے گا آخر کو یہ دریا رواں بالائے سر

افسر

مولوی سید عزیز الدین حیدر الہ آبادی ابن سید علی حمزہ شاگرد وحید ساکن کڑا ۔ آخر عمر میں نابینا ہو گئے تھے کچھ دنوں حیدرآباد میں بھی قیام پذیر رہے ۔

عالم کا رنگ کیا کیا ہوگا نہ تھا نہ اب ہے   لیکن حبیب تم سا ہوگا نہ تھا نہ اب ہے
یوں آنکھ بدل لی تم نے ہنستے ہی ہنستے بیٹھے   کچھ واسطہ ہی گویا ہوگا نہ تھا نہ اب ہے
دل لینے میں ہمارے اب سوچ تم کو کیا ہے   لکھ دیں کہ ہم کو دعویٰ ہوگا نہ تھا نہ اب ہے
تیرا نظیر ہونا ہے یہ مثال رکھنا   جیسے خدا کا ہمتا ہوگا نہ تھا نہ اب ہے

زندہ ہوں یا مردہ حال ایسا بھی ہے ویسا بھی ہے
اب تو کچھ دل سے خیال ایسا بھی ہے ویسا بھی ہے

خیرہ رکھے عمر بھر دم بھر نہ رہنے دے اسیر
آپ کی زلفوں کا جال ایسا بھی ہے ویسا بھی ہے

عمر بھر منہ سے نہ بولیں ہنس پڑیں اک بات پر
آپ کا مجھ سے ملال ایسا بھی ہے ویسا بھی ہے

حال کیا پوچھتے ہو نشہ میں سرشار تو ہوں
بیٹھو کیفیتیں بتلاؤں گا ہشیار تو ہوں

بال بال الفتِ گیسو میں پھنسا کر مجھ کو
کہتے ہو جاؤ کہاں جاؤں گرفتار تو ہوں

گلِ رنگیں نہ سہی سبزۂ بیگانہ سہی
گو کسی رنگ سے ہوں زینتِ گلزار تو ہوں

میرے اس پوچھنے پر تم بھی مجھے چاہتے ہو
یہ تمنا ہے

مجھے دکھلائی خضرِ عشق نے انکی گلی اچھی
یہیں سے جھک کے اب دیر و حرم کو بندگی اچھی

اکیلے سوز و ساز اچھا نہ تنہا میکشی اچھی
حقیقت یہ ہے اس کا غم بھلا اسکی خوشی اچھی

شہید

غلام امام شہید۔ ساکن الہ آباد۔ نثر و نظم دونوں میں شہرۂ آفاق ہیں۔ ۱۸۷۳ء میں پرنس آف ویلز کی صحت کے جلسہ میں قصیدۂ تہنیت خسرو باغ میں پڑھا تھا۔

قاصر

قاصر تخلص سید خوب اللہ نام یحییٰ پور الہ آباد میں رہتے تھے۔

میں صدق دل سے بندہ اس صنم کا ہوں مرا زاہد
یہ ایماں ہے یہ ایماں ہے یہ ایماں ہے یہ ایماں ہے

قیصر

قیصر تخلص شاہ امین الدین۔ الہ آباد کے ایک معزز صوفیہ خاندان کے رکن تھے

اور ۱۲۸۵ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ عربی و فارسی کے درسی کتابوں کا تکملہ آپ نے آگرہ میں کیا اور وہیں مرزا اعظم علی اعظم شاگرد آتش کے شاگرد ہوئے۔ اپنے والد کے انتقال کے بعد الہ آباد کی دیوانی میں مختلف عہدوں پر کام کر کے پنشن لی اور خانہ نشین ہو گئے۔ علاوہ غزل کے مرثیہ۔ سلام اور نعت و منقبت وغیرہ بھی کہتے تھے رسول خدا کی شان میں کئی نظمیں لکھیں۔ گلدستہ نبوت اور نظم دل افروز مشہور ہیں یکم نومبر ۱۳۴۳ھ کو انتقال کیا۔

گریباں گیر ہوتا کیوں لہو پھر میری گردن کا
کفن ملتا اگر بعد فنا قاتل کے دامن کا

جو پہنا طوقِ منت اس طرف اس آفتِ جاں نے
جنوں نے اس طرف ساماں کیا زنجیر آہن کا

کیا ہے پرزے پرزے تو نے اے دستِ جنوں ایسا
رفو ہونا نہیں ممکن ہمارے جامۂ تن کا

خیال دل میں جو آیا سیاہ کاری کا | سفید ہو گئے مثل کفن مزار میں ہم

نیساں

خان بہادر میر علی عباد۔ نہایت جلیل القدر خاندان کے چشم و چراغ تھے موضع کہرا ضلع الہ آباد کے رہنے والے تھے۔ عربی، فارسی کی تعلیم ذی استعداد مولویوں سے حاصل کی۔ شاعری ورثہ میں ملی تحصیلداری کے عہدہ پر فائز تھے کارگزاریوں کے صلے میں خان بہادری کا خطاب گورنمنٹ سے عطا ہوا۔

نہایت منکسر مزاج۔ متواضع۔ خوش اخلاق۔ ہر دلعزیز اور صاحب جود و کرم تھے۔ شاہد سخن کی پرستاری میں زمانۂ ملازمت میں بھی مستغرق رہتے تھے۔ منشی منیر کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ قصیدہ۔ غزل۔ رباعی۔ مثنوی۔ مسدس۔ ترکیب بند۔ سلام۔ نوحہ مرثیہ۔ مستقل نظمیں غرض ہر قسم اور ہر صنعت کی

شاعری میں زور طبیعت دکھاتے تھے۔ سنگلاخ زمینوں اور مشکل طرحوں میں طبیعت کی تیزی اور بڑھ جاتی تھی۔ نہایت کامل الفن اور مسلم الثبوت اُستاد تھے۔ تشبیہ و استعارہ کلام کی جان تھی مگر سادگی۔ برجستگی۔ روانی ہاتھ سے نہیں جانے پاتی تھی۔ تخلیق مضامین آپ کا حصہ تھا۔

وحید

وحید تخلص مولوی وحید الدین خلف مولوی امیر اللہ موضع کرلا الہ آباد کے رہنے والے تھے۔

رہ گئی کتنوں کے دل میں قتل ہونے کی ہوس
دو ہی ہاتھوں میں تجھے اے تیغ زن کیا ہو گیا

آج ہر شہر کے کوچے نظر آتے ہیں اُداس ۔۔۔ کس طرف لے گئی وحشت تمہیں دیوانے کو
ہمنے جب وادیٔ غربت میں قدم رکھا تھا ۔۔۔ دور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو

لائے گی کس طرح سے کبھو بوئے پیرہن ۔۔۔ اس کی گلی میں جا کے صبا اور ہو گئی

اکبر

خان بہادر سید اکبر حسین۔ بڑے معزز خاندان کے رکن رکین تھے۔ ڈسٹرکٹ ججی کے عہدہ جلیلہ سے پنشن لی۔ خان بہادری کا خطاب گورنمنٹ سے ملا۔ شاعر شیریں کلام تھے۔ آپ نے طرز جدید اختیار کی جو آپ ہی کی ذات پر ختم ہو گئی۔ غزل۔ قصیدہ۔ رباعی۔ قطعات۔ مثنوی۔ نظمیں غرض ہر صنف کی شاعری پر قادر تھے۔ سنجیدہ۔ صوفیانہ۔ سیاسی۔ مذاقیہ۔ قومی۔ اخلاقی ہر قسم کا کلام آپ کے دیوان میں موجود ہے۔ سوسائٹی اور قوم کی اصلاح مدنظر تھی۔ زبان بندی کے زمانے میں میاں ہی شاعری کرتے تھے او منہ سے ڈھکے سب کچھ کہہ جاتے تھے۔ مذاحیہ شاعری سے اصلاح کا کام لیا۔ ایسی بات کہتے

سکھے کہ سننے والا بے ساختہ ہنس پڑے اور پھر شرمندہ ہو کر اپنی اصلاح پر آمادہ ہو۔ مسلم الثبوت اُستاد اور یگانۂ روزگار تھے۔ مطبوعہ کلام بازار میں ملتا ہے اور ہر اُردو داں قدر کی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔

بشیر

شاہ محمد بشیر۔ منشی منیر کے شاگرد تھے۔ بہت پُرگو اور خوش مزاج بزرگ تھے۔ فارسی و اُردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔

ہم پاؤں اُٹھائے ہوئے صحرا میں چلیں گے ۔۔۔ کانٹوں نے اگر بوجھ سنبھالا لاکھ پا کا

کامل الٰہ آبادی

سید احمد جان، حضرت شاہ اجمل کے پوتے تھے۔

ظاہر میں پھر گیا وہ ستمگر تو غم نہیں ۔۔۔ دل سے جو اُس نے بھلا دیا وہ ہمیں کم نہیں

کیواں

سید فتح علی الٰہ آبادی۔ نساخ و ناسخ کے شاگرد تھے۔

کہنے لگے وہ لاشۂ کیواں کو دیکھ کر ۔۔۔ ارمان ظلم ہائے مرے دل میں رہ گیا

مبارک

سید مبارک علی الٰہ آبادی شاہ غلام اعظم افضل کے شاگرد تھے۔

عشقِ سنگیں دلوں کا ہے ناصح ۔۔۔ اپنا پتھر تلے دبا ہے ہاتھ

مبتلا

لالہ چندی سہائے، اصل میں پرتاب گڑھ کے رہنے والے تھے لیکن محکمہ بیکاری میں الٰہ آباد میں نوکر تھے۔

عاشق رخ ہوں سرِ زلف گرہ گیر نہیں ؛ پائے وحشت کو مرے حاجتِ زنجیر نہیں
اُڑ گیا ہے اثرِ جذبِ محبت یا رب ، یا مرے نالۂ جانکاہ میں تاثیر نہیں

محوی

محوی تخلص میر باسط علی عطار الہ آبادی۔ کلکتہ میں اقامت اختیار کر لی تھی

وصل تیرا چاہتا ہوں ہر طرح ، پاس تو بھی ہو تری تصویر بھی

مضطر

مظفر تخلص شیخ علی بخش نام الہ آباد کے رہنے والے تھے۔

قتل بے جرم عبث کرتا ہے کیوں اے ظالم ، مضطرِ خستہ کی ثابت کوئی تقصیر نہیں

مہدی

مہدی تخلص مرزا مہدی نام الہ آباد میں رہتے تھے۔

تیر مژگاں کے مقابل ہیں کوئی تیر نہیں ، تیز ترا بروئے خمدار سے شمشیر نہیں

ندیم

سید محمد عسکری کڑا ضلع الہ آباد کے رہنے والے اور شاہ غلام اعظم افضل کے شاگرد تھے۔

زمین قبر سے مجھ کو بڑی ندامت ہے ، کہ مشت خاک نہیں ہے فشار کے قابل

نزہت

مولوی برہان الدین نام قصبہ دیوا ضلع الہ آباد کے رہنے والے تھے۔

گو تم دمِ مردن مری بالین پر آئے ، کیا ظلم کہ اس وقت بھی منہ ڈھانپ کر آئے
اک قامت رعنا کا تصور رکھا ہے مجھے صبح ، ہنگامۂ محشر کے تماشے نظر آئے

وجیہ

وجیہ تخلص میر ضامن علی ابن میر جعفر علی، الہ آباد کے رہنے والے تھے۔

شکوے جفاؤں کے نہیں ہرگز روا مجھے ہر حال میں ضرور ہے تیری رضا مجھے

وزیر

وزیر تخلص سید وزیر علی نام، الہ آباد میں رہتے تھے۔

قیدی حلقۂ گیسوے پریشاں ہوں میں پاے وحشت کو مری حاجت زنجیر نہیں

وفا

وفا تخلص شنکر لال الہ آبادی۔

زر ہے نہ میرے پاس نہ ہے جان نہ دل ہے
یاں ہے فقط اے جانِ جہاں نام خدا کا
جب تک کہ ہے جانِ وفا تیرے بدن میں
لازم ہے رہے وردِ زباں نام خدا کا

ولا

ولا تخلص محمد مراد خاں ابن منور خاں، الہ آباد کے رہنے والے تھے۔

اب تو خاموش ہے دل ورنہ قیامت ہوتی آسماں تک تھا پہنچتا کبھی نالہ اپنا

ہادی

ہادی تخلص سید محمد مہدی نام الہ آباد میں رہتے تھے۔

ملتی نہیں تشبیہ ترے زلف کی جاناں
ہے عین خطا کہئے جو مشکِ ختنی ہے

منشی

منشی کندن لال سکسینہ ساکن الہ آباد۔

چلتے ہیں اٹھائے ہوئے دامن وہ ادا سے   سایہ کی توقع نہ رہی بال ہما سے

ابرو تہ لوح جبیں نیچے ہلال اوپر قمر   ہمجنس دونوں ہمنشیں نیچے ہلال اوپر قمر
محراب پر کھنچوائی ہے تصویر اپنی یار نے   اس عقل پر صد آفریں نیچے ہلال اوپر قمر

عالم

منشی چندی سہائے خلف لالہ ٹھاکر پرشاد ساکن الہ آباد محرر بندوبست غازی پور۔

اس بادشہِ حسن کا کیا وصل ہو ممکن   سلطان مخاطب کہیں ہوتے ہیں گدا سے
وہ بھی تری تعریف میں کام آئیگی اک دن   رہ جائیں گے مضمون جو مرے فکر رسا سے
منہ سرخ ہے ابرو ہیں چڑھے بدلے ہیں تیور   آئی ہو نظر تم مجھے کچھ آج خفا سے
جان آ گئی بیمار محبت کے لبوں پر   اب فائدہ کچھ ہو گا دوا سے نہ دعا سے

ہنر

بابو دیوکی نندن صاحب الہ آبادی شاگرد جناب نظر۔ آپ کلکٹری الہ آباد میں ملازم تھے لیکن ترک ملازمت کرکے گوالیار جاکر نوکر ہو گئے تھے۔

نیند کمبخت نہیں آنکھ میں آنے دیتی   دشمن خواب ہوئی ہے شب فرقت کیسی

کیا لکھوں میں اس سے زیادہ خوبی قسمت کا حال   ایک خط میں سو جگہ بگڑی ہوئی تقدیر ہے

یہ آرزو نہیں اصلا کہ عزّ و جاہ ملے
فدا ہوں جس پہ الٰہی وہ رشک ماہ ملے

فیاضؔ

فیاض علی خاں صاحب عرف نیعنی خاں صاحب رئیس دریا آباد، اشرف علیخاں صاحب اشرفؔ کے صاحبزادے تھے۔ نہایت قابل و ذکی تھے۔ ۱۸۶۲ء میں انتقال فرمایا۔ فارسی و اردو میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ کلام کمیاب ہے نمونہ ملاحظہ ہو۔

حاسد کے حسد سے مرا کیا ہوتا ہے　　　مطلب مرا ہوتا ہے بھلا ہوتا ہے
کہتا ہے بُرا جو کہ مجھے غیبت میں　　　وہ پیشِ خدا آپ بُرا ہوتا ہے

نرغے میں عدو کے مری جان رہتی ہے　　　لیکن مدد شاہ زماں رہتی ہے
رہتا ہوں دل آزاروں میں لیکن بچ کر　　　جس طرح سے دانتوں میں زباں رہتی ہے

کم یار ہے عدم شائد　　　یا میں ہی دیکھتا ہوں کم شائد
پھر بتوں کی طرف چلا فیاضؔ　　　ہاتھ کچھ آ گئی رقم شائد

دورِ چہارم سنہ ۱۹۰۰ء سے تا حال

اثر

شیام بہادر۔ موضع خواجہ پور ضلع الہ آباد کے باشندے ہیں لیکن پنڈت نرمل چند تیواری صاحب ایڈووکیٹ کے محرر ہونے کی وجہ سے مستقل سکونت الہ آباد میں ہے۔ عمر ۳۵ سال ہے۔ سنہ ۱۹۳۶ء سے شعر و شاعری کا شوق پیدا ہوا۔

لاکھ پردوں میں ترا حسن خود آرائی ہے ۔۔۔ پھر بھی ہر شے سے عیاں جلوۂ رعنائی ہے
اُٹھتے جاتے ہی ہوئے عیش کے ساماں رخصت ۔۔۔ پھر وہی ہم ہیں وہی عالم تنہائی ہے
آج روتے ہو جسے دیکھ کے کل ہنستے تھے ۔۔۔ یہ وہی درد کا مارا دلِ شیدائی ہے
مجمعِ حسرت و حرماں ہے ہجومِ غم و یاس ۔۔۔ دل کے ویرانے میں اک انجمن آرائی ہے

ایک مدت سے ہوں زنداں میں اثرؔ کیا معلوم
صحنِ گلشن میں خزاں ہے کہ بہار آئی ہے

احمد

شیخ علی احمد مدرّس مدرسہ پھولپور۔ شاگرد میر وارث حسین صاحب رئیس موضع اترائوں ضلع الہ آباد۔

مصدرِ جود و سخا مخزنِ اسرارِ خدا ۔۔۔ معدنِ حلم و حیا طاہر و اطہر حیدر
دیکھ لیں چشمِ بصیرت سے جو ہوں اہلِ یقیں ۔۔۔ ماہ و خورشید کے مانند ہیں گھر گھر حیدر

اختر

شاہ حبیب الرحمٰن۔ شاہ محمد عثمان صاحب کے اکلوتے فرزند و جانشین ہیں۔ آپ کی ولادت ۲۱ جنوری سنہ ۱۸۹۴ء کو بمقام دائرہ شاہ حجت اللہ ہوئی۔ سنہ ۱۹۱۴ء میں درس و تدریس کا سلسلہ ختم ہو جانے پر شعر و شاعری کا شوق ہوا

جو کچھ دنوں تک قائم رہا ۱۹۲۸ء سے مولانا حامد علی صاحب حامد کی تحریک سے پھر شوق ہوا اور مشق سخن بڑھائی اور نعت، منقبت، قصیدہ، سلام، غزل، نوحہ، رباعی سب کچھ کہنے لگے۔ کلام میں تصوف کی چاشنی پائی جاتی ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

صورت و نقش و رنگ سے آئینۂ مجاز ہوں
میری حقیقت اور ہے اور سے بے نیاز ہوں
خاک نژاد ہوں مگر مخزنِ سرِ ناز ہوں
بلبل سدرہ بے خبر جس سے ہے میں وہ راز ہوں

خبر نہ تھی کہ بنا کر وہ رازدار مجھے | نہ دے گا جبر و فا پر بھی اختیار مجھے

برسا جو ابر رنگ طبیعت بدل گیا | توبہ کا پاؤں صحن چمن میں پھسل گیا

آنسو کو دل کی آگ سکھا رہی ہے جذب | دریا ابل رہا ہے مگر چشم تر نہیں
بازو میں جب تلک پر تو گرفتار دام تھے | اب دام سے چھٹے ہیں تو بازو میں پر نہیں

اختر

سید اختر رضا ۱۹۱۵ء میں موضع میمن ضلع بجنور میں پیدا ہوئے اور اب الہ آباد میں مقیم ہیں۔ والد کا نام سید محمد صادق ہے۔ ابتدائی تعلیم ختم کرنے کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی میں داخل ہوئے جہاں سے بی۔ اے آنرز کی ڈگری حاصل کی ریلوے میں گارڈ ہیں ۱۹۳۵ء سے شعر کہنا شروع کیا حضرت نجم آفندی سے شرف تلمذ ہے زیادہ تر قصیدے، سلام اور نوحے کہتے ہیں۔ نظمیں بھی لکھا کرتے ہیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

کسان کا گیت

وہ چشمِ شاہد فضا رنگیں رہی ہے
بیاباں میں سپیدی کھل رہی ہے
جبینِ شب سے افشاں دھل رہی ہے
وہ کلیوں کو تبسم آ رہا ہے | کسان اک مست بیٹھا گا رہا ہے

اخترؔ

اخترؔ ہاشمی کے آبا و اجداد میرٹھ کے رہنے والے تھے۔ آپ کے والد قاضی عبدالکریم صاحب مرحوم ڈپٹی کلکٹری کے عہدہ پر فائز تھے۔ اخترؔ صاحب خود سب انسپکٹر پولیس تھے۔ متعدد اضلاع میں تعینات رہ کر الہ آباد آ گئے۔ یہیں پنشن لی اور مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اس وقت آپ کی عمر ۶۵ سال کی ہے۔ ابتدا ہی سے شعر و شاعری کی طرف میلان طبع تھا۔ جناب شفقؔ عمادپوری سے اصلاح سخن لیتے ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

نقشہ نہ آترا لوح پہ جب اُسکی ذات کا — خاکا قلم نے کھینچ دیا کائنات کا
ہر ذرہ اک آئینہ ہے حسنِ صفات کا — رو پوش پھر بھی پردے میں جلوہ ہے ذات کا
دنیا میں جس نے کر دیا پیدا اک انقلاب — اعجاز تھا تری نگہِ التفات کا
قیدِ تعینات سے آزاد ہو سکے بھی — عالم مری نظر میں رہا ممکنات کا
قدرت کا اک طلسم ہے وہ حسن سرمدی — دنیا ہے ایک شعبدہ جسکی صفات کا
جنکے ہزاروں عکس پڑے اور مٹ گئے — انساں اک آئینہ ہے اُنھیں حادثات کا

اخترؔ ہو فکر توشۂ حسن عمل ضرور
ہے مرحلہ دراز حیات و ممات کا

ارشادؔ

ارشاد حسین خاں۔ آپ دریاآباد الہ آباد کے رئیس و زمیندار ہیں سب رجسٹراری کے عہدہ پر فائز تھے اور اب پنشن پاتے ہیں حضرت نیساںؔ الہ آبادی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ مدحیہ قصیدے اور غزلیں خوب کہتے ہیں قطعات۔ سلام۔ نوحہ مرثیہ بھی کہتے ہیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

چل کے خنجر آج دست تیغ زن میں رہ گیا — جوش کھا کھا کر لہو میرے بدن میں رہ گیا
اس قدر بوسے لئے ہم نے ہجوم شوق میں — نام تک باقی نہ مسّی کا دہن میں رہ گیا
خونِ ناحق کے اگر دھبے چھڑائے بھی تو کیا — داغ بدنامی نصیبِ تیغ زن میں رہ گیا

امین

شیخ غلام امام موضع داندو پور ضلع الہ آباد۔ شاگرد میر واجد حسین صاحب رئیس آگرہ۔

کس زباں سے ہو بیاں زینہ پر حیدر | قول احمد ہے کہ ہے نفس پیمبر حیدر
شوکت ظاہر و باطن میں بفضل داور | تھے سلیمان و سکندر سے فزوں تر حیدر

اعجاز

میر محمد حسین ساکن کراری الہ آباد۔

عرصہ حشر میں یارب جو مجھے لے جائیں | لب پہ ہو جوش ولا سے مرے حیدر حیدر
بعل بنتا تھا اسے دست خدا کہتے ہیں | ہاتھ میں گر کبھی لے لیتے تھے پتھر حیدر

احمدی

بی احمدی دختر بی امامن محلہ اونچہ منڈی شہر الہ آباد۔

سایہ جس کا ہو بد اندیش کو مرگ مبدم | ایسے ہیں صاحب شمشیر دو پیکر حیدر
احمدی ہم کو قیامت کا نہیں کچھ کھٹکا | قبر سے اٹھو نگی کہتے ہوئے حیدر حیدر

آزاد

کرپا شنکر خلف منشی راجیشوری پرشاد صاحب رئیس و زمیندار مہوہ کلاں ضلع الہ آباد۔ حال مقیم کٹرہ الہ آباد۔ پیدائش ۱۹۱۵ء۔

نمونۂ کلام :-

تھی نہ مجھے کوئی خبر منزل حسن و عشق کی
دیدۂ حق نما نے کچھ اس کا پتہ بتا دیا
عیش و نشاط دہر کی کھل گئیں سب حقیقتیں
آنکھ ہماری کب کھلی خاک میں جب ملا دیا

اعجازؔ

سید اعجاز حسین ایم۔اے الہ آباد یونیورسٹی میں اُردو کے لکچرار ہیں۔ آئینۂ معرفت، مختصر تاریخ ادب اُردو اور نئے ادبی رجحانات تین کتابیں لکھ کر ادبی دنیا میں اپنی جگہ پیدا کر چکے ہیں۔ شعر بھی کبھی کبھی کہتے ہیں۔

تمام رات ستاروں نے مجھ کو سمجھایا　　کہ فکر کر کوئی دنیا نئی بسانے کی

کون کس پر اب اعتماد کرے　　رنگ رُخ نے بتا دیا سب راز
ساری دنیا نظر میں ہیچ ہے اب　　کیا کیا تو نے اے نگاہِ ناز
ابھی مر مر کے تم کو جینا ہے　　عشق ہے دل لگی نہیں اعجازؔ

اعجازؔ

اعجاز حسین خاں۔ نواب ارادت خاں صاحب سے سلسلۂ نسب ملتا ہے سنہ ۱۸۹۲ء میں پیدا ہوئے۔ چار سال کا سن تھا کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ موروثی جائداد کورٹ آف وارڈز کے تحت میں رہی ابتدائی تعلیم گھر پر ختم کرنے کے بعد انگریزی اسکول میں انٹرمیڈیٹ تک تعلیم پائی۔ شاعری کا شوق بچپن سے تھا پہلے حضرت نیساںؔ سے شرف تلمذ تھا لیکن اُن کے انتقال کے بعد حضرت عزیزؔ لکھنوی سے اصلاح لینے لگے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

حسرتوں کا دل کی اب کوئی نشاں ملتا نہیں　　چھٹ گئے ساتھی ہمارے کارواں ملتا نہیں
چند روزوں کی اسیری میں ہوا یہ انقلاب　　ڈھونڈتا پھرتا ہوں لیکن آشیاں ملتا نہیں
پہروں کہتا ہوں قفس کی تیلیوں سے رازِ دل　　کنج تنہائی میں کوئی راز داں ملتا نہیں
نوکِ ناوک پر جھلک سی ہے لہو کے رنگ کی　　اور کچھ اس کے سوا دل کا نشاں ملتا نہیں

عشق میں اعجازؔ دیکھے کوئی میری محویت
ہوں قریبِ آستاں اور آستاں ملتا نہیں

آغا

پنڈت تربھون ناتھ آغا بی۔اے ایل۔ایل بی الہ آباد میں وکالت کرتے ہیں۔ طبیعت شگفتہ پائی ہے۔ شاعری کا شوق طالبعلمی کے زمانے سے تھا۔ وکالت کے ساتھ مشق سخن بھی جاری ہے۔

وہ ان کا مجھ کو نیچی نگاہوں سے دیکھنا ہو جائے دل نہ تیر نظر کا شکار آج
یہ حوصلے کہ مٹنے پہ بھی آسمان سے بڑھ بڑھ کے باتیں کرتا ہے میرا غبار آج

کیا خبر تھی اس میں کانٹوں کے سوا کچھ بھی نہیں
اس محبت کو بہار بے خزاں سمجھا تھا میں
ہو گئیں طے منزلیں دونوں فقط اک سانس میں
اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں

امیر

امیر محمد خاں۔ دریاآباد کے رؤسا میں سے ہیں اور ریلوے میل سروس میں ملازم ہیں۔ مدحیہ قصیدے اور غزلیں کہتے ہیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

بہار آئی پلا اے ساقیا ساغر محبت کا نکل جائے جو چھپا ہے دل میں جو کانشاعداوت کا
مزا سوزِ غمِ الفت کا ملتا ہے تڑپنے میں نہ ہوں ممنون کیونکر آتشِ گل کی عنایت کا
حسین ابن علی ہے نام اُس ماہِ امامت کا ہے ابنِ فاطمہ سبطِ نبی سردار جنت کا

بریاں

الہ یار خاں۔ آپ الہ آباد کے باشندے تھے۔ پہلے مولانا عزیز الدین انسر سے اصلاح سخن لیتے تھے۔ اُن کے بعد اپنے خسر ڈاکٹر باسط علی صاحب کو اپنا کلام دکھانے لگے۔ آخر عمر میں حضرت نوح ناروی سے بھی کچھ دنوں شرف تلمذ رہا۔ بہت خلیق و منکسر مزاج واقع ہوئے تھے ۱۹۳۶ء میں انتقال ہوا ۱۹۳۷ء میں ایک دیوان موسوم بہ یادگار بریاں شائع ہو چکا ہے۔ کلام ملاحظہ ہو۔

مٹا نہ اس کو بس لے پائے ناز رہنے دے — نشانِ قبر کا کچھ امتیاز رہنے دے
دلِ گرفتہ کو حسرت نہیں رہائی کی — اسیر حلقۂ زلفِ دراز رہنے دے
ہوا کی شکل چل لے دل کسی کے کوچہ میں — بس اب خیالِ نشیب و فراز رہنے دے
مریضِ ہجر کا تجھ سے علاج کیا ہوگا — یہ جس طرح ہے اُسے چارہ ساز رہنے دے

جہانِ عشق میں شہرت نہ اس کی ہو برپا
جنوں جو راز محبت کو راز رہنے دے

کھینچ کر لائی عدم سے مجھ کو دنیا کی طرف — اب کہاں لے جائے یہ عمرِ گریزاں دیکھئے

بسمل

منشی سکھ دیو پرشاد۔ آپ حضرت نوح ناروی جانشین حضرت داغ مرحوم کے ممتاز شاگردوں میں سے ہیں۔ صاحب دیوان ہیں اور الہ آباد میونسپل بورڈ میں ملازم ہیں۔ مقامی مشاعروں کے علاوہ دوسرے شہر کے مشاعروں میں بھی شریک ہوتے رہتے ہیں۔ اور ہر جگہ ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

دستِ وحشت کا مرے کارِ نمایاں دیکھئے — ٹکڑے ٹکڑے آستیں دامن گریباں دیکھئے
جس طرح بھی ہو سکے رنگِ گلستاں دیکھئے — قید میں رہ کر اسیروں کا یہ ارماں دیکھئے
اے جنوں تاثیر سے تیری یہ ناممکن نہیں — دامنِ لیلیٰ میں مجنوں کا گریباں دیکھئے
پتّی پتّی پر لکھی ہے داستانِ رنگ و بو — کیوں نہ اس عنوان سے حسنِ گلستاں دیکھئے
نیستی لے لیگی ہستی کا کسی دن جائزہ — مطمئن اس پر بھی ہے دنیا میں انساں دیکھئے

دیر میں پڑھتے ہیں پانچوں وقت کی بسملؔ نماز
ایسا ہندو دیکھئے ایسا مسلماں دیکھئے

بیدل

سید محمد رضا۔ آپ کے والد ماجد مولوی سید محمد کاظم صاحب مرحوم شرفائے

الہ آباد میں سے تھے۔ بیدل صاحب کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ اُس کے بعد انگریزی اسکول میں داخل ہوئے جہاں ایف۔ اے تک تعلیم پائی۔ ترک تعلیم کے بعد آپ میونسپل بورڈ الہ آباد میں ملازم ہو گئے۔ اس وقت ہیلتھ ڈپارٹمنٹ الہ آباد میں چیف سینیٹری انسپکٹر ہیں۔ شعر و شاعری سے فطری اُنس ہے۔ مشق سخن بھی کافی ہے۔ پچیس تیس سال سے شعر گوئی کرتے ہیں۔ حضرت عزیز مرحوم لکھنوی سے شرف تلمذ تھا۔ زیادہ تر غزلیں اور قصیدے کہتے ہیں۔ کلام میں سوز و گداز اور ترنم پایا جاتا ہے۔ جو کچھ کہتے ہیں اثر لیکر کہتے ہیں اس لئے کلام میں تاثیر رہتی ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

آپ کے ناوک کے صدقے رو رہے پیکاں دیکھئے
رقص کرتے دل کے اوراقِ پریشاں دیکھئے

آپ آکر سوئے گورِ غریباں دیکھئے
بے سر و ساماں جو ہیں اُن کا بھی ساماں دیکھئے

کھینچتا ہے کوئی ناوک پھر بھی ہاں ہاں دیکھئے
ٹوٹ کر بیٹھے نہ پیکاں سے رگِ جاں دیکھئے

محوِ حیرت ہو رہا ہوں جلوہ گاہِ حسن میں
کیا دکھاتی ہے مجھے یہ چشمِ حیراں دیکھئے

اشک بن کر بھی نہ ٹپکے دیدۂ خونبار سے
دل کے دل ہی میں رہے بیدل کے ارماں دیکھئے

پیارے

پیارے تخلص، شیخ امیر اللہ نام ساکن محلہ چوپ گھسیار ٹولہ۔

یہ شب قدر نہیں سایۂ گیسو ہے یہ — یہ نہیں نور، یہ عکسِ رخِ حمیدہ
از ازل تا بہ ابد سارا جہاں ہے محتاج — مشکلوں میں مرے کام آتے ہیں اکثر شنیدہ

پرتو

سید سبط علی از سادات منڈوا تحصیل کھاگا، ساکن حال الٰہ آباد۔

مدح خوانِ اللہ و پیغمبر ہوئے ۔۔۔ بہترینِ اولیا حیدر ہوئے
دعویٔ مردی سے جو ہمسر ہوئے ۔۔۔ وہ علی کی تیغ سے بے سر ہوئے

تحمل

سید محبوب حسین۔ آپ کے والد میر الفت حسین صاحب مرحوم موضع کراری ضلع الٰہ آباد کے باشندے تھے لیکن سکونت الٰہ آباد ہی میں اختیار کر لی تھی۔ تحمل صاحب کی تعلیم و تربیت الٰہ آباد ہی میں ہوئی۔ حضرت نیساں الٰہ آبادی سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ مشقِ سخن کافی ہے۔ مستند نوجوان شعرا کے کلام پر اصلاح بھی دیتے ہیں اور اس کی اہلیت بھی رکھتے ہیں۔ غزلیں اور قصیدے خوب کہتے ہیں۔ کلام میں روانی کے ساتھ پختگی بھی پائی جاتی ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

حشر میں نامۂ اعمال فرشتے دکھلائیں ۔۔۔ ہم فقط آپ کی تصویر لئے جاتے ہیں

الفت کا ایک جذبۂ بے اختیار تھا ۔۔۔ جس پر حیات و موت کا دار و مدار تھا
تھی سامنے شراب مگر پی سکا نہ میں ۔۔۔ اب کیا کہوں کہ جبر تھا یا اختیار تھا

ساقی کا احترام کئے جا رہا ہوں میں ۔۔۔ تقویٰ کو نذرِ جام کئے جا رہا ہوں میں
غفلت میں بھی یہ کام کئے جا رہا ہوں میں ۔۔۔ پختہ جنونِ خام کئے جا رہا ہوں میں
دونوں جہاں کو بھول چکا ہوں مگر ہنوز ۔۔۔ یادِ اس کو صبح و شام کئے جا رہا ہوں میں
اُن کو تھا ناگوار جو افسانۂ حیات ۔۔۔ قصہ ہی وہ تمام کئے جا رہا ہوں میں

پردہ ہے بیخودی کا خطائے نظر نہیں ۔۔۔ وہ سامنے ہیں اور مجھے کچھ خبر نہیں
رنگینیٔ شبابِ چمن دیکھتے ہیں سب ۔۔۔ انجامِ حسنِ گل پہ کسی کی نظر نہیں

تفتہ

عبدالباسط خاں۔ راجہ پور میں رہتے تھے۔ شعر و شاعری سے دلچسپی تھی۔ آفتگر کے شاگرد تھے۔ ۱۹۳۲ء میں بعمر ستر سال فوت ہوئے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

رشکِ چمن بنا کے دلِ داغدار کو ۔۔۔ دکھلا رہا ہوں جوش جنوں کی بہار کو
ہر پنکھڑی تھی خود سبق آموز ضبطِ عشق ۔۔۔ بلبل نہ سمجھی پھر بھی زبانِ بہار کو
دستِ جنوں نے ایسی اُڑائی ہیں دھجیاں ۔۔۔ چھوڑا نہ ایک جیب و گریباں کے تار کو

اس تیرہ باطنی سے تو اچھی صفائے قلب
تفتہ مٹا دو شیشۂ دل سے غبار کو

توکل

مولوی سید ابوالحسن۔ قصبہ کراری ضلع الہ آباد کے رہنے والے تھے۔ عربی و فارسی میں فارغ التحصیل تھے۔ نعت و منقبت میں قصیدے کہتے تھے اور بڑے زور و شور کے کہتے تھے۔ پورے قصیدوں کا نقل کرنا خالی از طوالت نہیں ہے۔

تمنا

سندر سنگھ نام۔ تمنا تخلص۔ خلف بابو داس دیو سنگھ صاحب ہومیو پیتھی سے خاص دلچسپی ہے اور یہی ذریعہ معاش ہے۔ ہندی و انگریزی خوب جانتے ہیں۔ کتابی اُردو کم جانتے ہیں لیکن زبان سے واقف ہیں اور شعر خوب کہتے ہیں۔ نمونۂ کلام۔

ہر کلی کی گود میں ہر پھول کے دامن میں ہے ۔۔۔ تیرا جلوہ اس طرح پھیلا ہوا گلشن میں ہے
سن رہا ہوں آج بےچینی دلِ دشمن میں ہے ۔۔۔ شکر ہے اتنا اثر تو نالۂ و شیون میں ہے
زہر بھی امرت بھی شربت بھی شراب ناب بھی ۔۔۔ سچ اگر پوچھو تو سب کچھ آنکھ اک چتون میں ہے

ثاقب

صادق حسین خاں رئیس بریلی حال مقیم الہ آباد۔

یہ تو سچ ہے کہ وہ اک ہاتھ میں دو کرتے تھے — ہاتھ میں رکھتے نہ تھے تیغ دو پیکر حیدر
اب نبوت نہ ہوئی ہے نہ کسی کی ہوگی — ہوتی تو بعد نبی ہوتے پیمبر حیدر

ثمیں

سید یاد حسین الہ آبادی شاگرد والا شان مرزا قیصر بخت صاحب بہادر فروغ۔

آئینہ مہر بنا عکس رخ روشن سے — مثل مہتاب چمکنے لگے جوہر حیدر
شب معراج ہوا پردۂ قدرت میں گزر — اس قدر قرب ہوا کس کو میسر حیدر

جدت

رحمت اللہ خاں سنہ ۱۹۰۴ء میں بمقام الہ آباد پیدا ہوئے۔ والد کا نام حشمت اللہ خاں۔ اردو مڈل تک تعلیم پانے کے بعد تجارت کرنے لگے سنہ ۱۹۲۳ء سے شعر کہنا شروع کیا۔ حضرت نوح ناروی کے شاگرد ہیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

اے عشق بڑھ اتنا کہ محیط دو جہاں ہو — دیباچۂ کونین کو افسانہ بنا دے

حسرت راحت کہاں تک کھینچ کر لائی مجھے — قبر کی آغوش میں آیا تو نیند آئی مجھے

جعفر

محمد جعفر ساکن محلہ بیدن ٹولہ شہر الہ آباد۔ شاگرد قیصر الہ آبادی۔

رجعت شمس ہوئی مردے جلائے صدہا — بالیقیں رکھتے تھے کیا رتبہ برتر حیدر
آپ کی دولت دیدار اگر مل جائے — آئینہ داری کروں مثل سکندر حیدر

جواد

چودھری میر جواد حسین ساکن کراری ضلع الہ آباد۔

کفر کا زور گھٹا قوتِ اسلام بڑھی — لے کے جب رن کو چلے تیغ دو پیکر حیدر
تیغ دی خالقِ اکبر نے نبی نے بیٹی — قفل میں سارے زمانے سے ہیں برتر حیدر

جعفر

شیخ جعفر علی ساکن موضع دانڈپور ضلع الہ آباد۔

زور تھا یہ کہ اُٹھائے ہوئے تھے مثلِ سپر — درِ خیبر کو مع بارِ پیمبر حیدر
شومِ طالع جو ازل سے ہوئے گرچہ ابلیس — آن واحد میں کریں مثلِ سکندر حیدر

جگدیش

جگدیشور پرشاد سریواستو بی، کام، آڈیٹر۔ خلف منشی بانکے بہاری لال صاحب پیشکار مرحوم۔ ساکن محلہ اترسویا، راجہ کا پھاٹک۔ نمونۂ کلام:-

بے حجاب اتنے کہ چشمِ شوق سے چھپتے نہیں
جانتے ہیں بالیقیں اپنا تماشائی مجھے

جعفر

سید جعفر حسین دریاآبادی۔

شق ہوئی کعبہ کی دیوار برائے میلاد — بالیقیں حضرتِ عیسیٰ سے ہیں برتر حیدر
جس کے دل میں ہے سرِ مو بھی محبت انکی — اسکو لے جائیں گے بس خلد کے اندر حیدر

چمن

شیام بہادر ورما بی، اے، ال، ال، بی متخلص بہ چمن۔ ۲۳ ستمبر ۱۹۱۶ء کو آگرہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد بابو نراین پرشاد صاحب حال مقیم مٹھی گنج الہ آباد۔ نمونۂ کلام:-

وصفِ چشمِ شوخ کا آیا پسِ مردن خیال — اہلِ محشر حشر میں کہتے ہیں سودائی مجھے

حامد

مولوی سید حامد علی ولد سید واجد علی رئیس قصبہ مصطفےٰ آباد ضلع رائے بریلی
الٰہ آباد میں بسلسلۂ ملازمت قیام پذیر تھے۔ شاعری کے ہر صنف پر قادر تھے۔
غزل بہت خوب کہتے تھے۔ کئی درسی کتابیں تالیف و تصنیف کیں جو محکمہ
تعلیمات نے کورس میں داخل کیں۔ مجمع الفوائد۔ بحر الفوائد۔ داستان عجم وغیرہ
آپ کی مشہور تصانیف میں سے ہیں۔ اپنے عہد کے شعرا کی بے راہ روی کی
اصلاح اور مذاق سلیم پیدا کرنے میں ہر ممکن طریقہ سے کوشاں تھے۔
فن شعر سے واقف اور مسلم الثبوت استاد تھے۔

گلی میں یار کے جاکر بہے مزار آئے — مگر وہاں گئے پیدل یہاں سوار آئے
اثر نہ جلوۂ جاناں کا ہو کہیں معدوم — جو غش ہی آیا ہے موسیٰ تو بار بار آئے

حسن

سید حسن عسکری قصبہ کرّہ سادات ضلع فتح پور کے رہنے والے ہیں۔ مگر
ملازمت کی وجہ سے اب الٰہ آباد میں قیام رہتا ہے۔

وادیِ ایمن کی جانب دیکھئے کیوں اے کلیم
کیوں نہ اپنے قصر دل میں نور عرفاں دیکھئے
شیخ صاحب راز عرفاں آپ پر کھل جائے گا
میری آنکھوں سے جمال روئے جاناں دیکھئے

حیرت

محمد یدیر خاں۔ گورنمنٹ پریس میں ملازم ہیں اور الٰہ آباد ہی کے باشندے
ہیں۔

تسکین اضطراب جگر چاہتا ہوں میں — ہر دم انھیں کو پیش نظر چاہتا ہوں میں

ہے دل کا تقاضہ شب غم دیدۂ تر سے — طوفان اٹھے اشک کا دامان نظر سے

حمّاد

ڈاکٹر محمد حماد فاروقی بیرسٹر ۔ الہ آباد کے مرجع امام صوفیہ خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ انگریزی کے ساتھ علوم مشرقیہ سے بھی واقف ہیں شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ کلام میں تصوف کی چاشنی زیادہ پائی جاتی ہے۔

کوئی گویا ہے اپنی زبان سے میں ہوں گویا لب بزبان غیر
سر بزم ناز قہقہہ کہ یہ دردِ دل کی پکار ہے

ٹکڑے ٹکڑے کرکے رکھدی داستانِ غم مری
زاہد خلوت نشیں کو یزداں سمجھا تھا میں

حنیف

محمد حنیف خاں رئیس دریاباد شہر الہ آباد ولد نقی علی خاں صاحب تعلقہ دار۔

اوج اعجاز و کرامت کے ہیں اختر حیدر
بحر ذخّار امامت کے ہیں گوہر حیدر
نہ کہیں درہم و برہم ہو نظام عالم
کھینچے غیظ میں ہیں تیغ دو پیکر حیدر

حلم

حکمت نراین شاگرد مرزا محبوب علی کوثر الہ آبادی۔

ہم نے مانا کہ تھے انسان منفرد حیدر
پر فضیلت میں فرشتوں سے تھے بڑھکر حیدر
خضر دنیا کے ہیں راہ بتانے والے
راہ گم گشتۂ عقبیٰ کے ہیں رہبر حیدر

حافظ

حافظ حبیب اللہ محلہ بہادر گنج الہ آباد کے رہنے والے ہیں۔

قفس میں مرا دل بہلتا نہیں ہے
کہ وہ چار تنکوں کی دنیا نہیں ہے

ہمیشہ جن کی رفاقت پہ دل کو ناز رہا
گئے وہ چھوڑ کے تنہا تہ مزار مجھے

حافظ

سید شاہ کمال الدین خلف حاجی سید شاہ نظام الدین احمد
دائرۂ یحییٰ پور شہر الہ آباد

گر بہ ظلمات شدے ہادیِ راہِ امید — چشمۂ خضر نمودے بہ سکندر حیدر
ہست واللہ بہ کونین بفرمانِ خدا — قاضیِ حاجتِ محتاج و تونگر حیدر

حسین

میر ابراہیم حسین ساکن موضع امرا پرگنہ کراری ضلع الہ آباد حال
مدرس اوّل فارسی مدرسۂ رفاہ عام کڑہ۔

صدقہ اس بزم کے میری بھی نکل جائے ہوس
راوقِ مہر سے بھر دو مرا ساغر حیدر
کھولدے تیغ زباں کے مرے جوہر حیدر
تاکروں ملکِ معانی کو مسخر حیدر

خاور

سید اولاد حسین ساکن شہر الہ آباد۔

اے زہے قوتِ بازوئے رسولِ مدنی — دستِ اقدس میں سلئے تھے درِ خیبر حیدر
زہد فی الدہر ہے ایثار بحالِ فاقہ — زور یہ تھا کہ اُکھاڑیں درِ خیبر حیدر

خالق

عبدالخالق نام ۱۹۳۳ء میں الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ نمونہ کلام:-

محبت کی تکلیف راحت ہے مجھکو   مصیبت میں بھی میں ہنسے جا رہا ہوں

دل نخچیر کے ٹکڑے ہیں خالق اشک رنگیں میں
ذرا دیکھیں انھیں لعل بدخشاں دیکھنے والے

دانش

ہنومان پرشاد شاگرد مرزا محبوب علی قوس۔

کیوں نہ سمجھوں انھیں امراض تفکر کا طبیب   مشکلوں میں مرے کام آتے ہیں اکثر حیدرؑ
نور اسلام چمکتا ہے دل میں میرے   دیکھ پاؤں جو کبھی روئے منور حیدرؑ

رنگین

جان محمد۔ الہ آباد کے باشندے ہیں۔

سبق لے شمع سوزاں آکے میرے ضبط کامل سے
جلا کرتا ہوں فرقت میں مگر گریاں نہیں ہوتا

رسوا

محمد صدر الدین۔ یکم جنوری ۱۹۱۲ء کو بمقام کٹرہ الہ آباد میں پیدا ہوئے آپ کے والد منشی محمد امیر الدین الہ آباد کے میونسپل بورڈ میں ملازم تھے تعلیم تربیت انھیں کے زیر عاطفت مکان ہی پر ہوئی۔ شعر و سخن کی طرف طبیعت کا رجحان پہلے ہی سے تھا شوق سخن بڑھائی نشتر صاحب سلونوی سے مشورہ کرتے ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

ہوئے نم دیدہ میری چشم گریاں دیکھنے والے
پریشاں ہو گئے حال پریشاں دیکھنے والے

ذرا اپنے تغافل پر بھی تھوڑی سی نظر کرلے
ارے حالِ مریضِ شام ہجراں دیکھنے والے

دمِ آخر بھروسہ اب کہاں ہے سازِ ہستی کا
سنبھل کر ہاتھ رکھ تارِ رگِ جاں دیکھنے والے

ضرورت ہی نہیں جام و سبو کی اُنکو اے ساقی
پڑے ہیں مست کیفِ چشمِ جاناں دیکھنے والے

کھلے گا رازِ دل اُن پر مرے اشعار سے رسوا
سنا ہے آج وہ ہیں میرا دیواں دیکھنے والے

رفیق

سید رفیق حسین نام۔ رفیقؔ تخلص۔ آپ کے والد سید محمد تقی صاحب مرحوم موضع بڑاگاؤں ضلع فیض آباد کے باشندے تھے۔ ملازمت کے سلسلے سے الہ آباد میں مقیم تھے۔ رفیقؔ نے تعلیم و تربیت الہ آباد ہی میں پائی۔ ہائی اسکول ودیا مندر اسکول سے۔ انٹرمیڈیٹ گورنمنٹ کالج سے اور ایم۔ اے۔ بی۔ اے آنرز کی ڈگری الہ آباد یونیورسٹی سے حاصل کی۔ محکمہ کوآپریٹو میں کئی سال انسپکٹر رہے۔ فی الحال الہ آباد یونیورسٹی میں ریسرچ اسکالر ہیں اور ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری کی تیاری کر رہے ہیں۔ طبیعت شعر و سخن کی طرف ابتدا سے مائل تھی۔ اردو سے خاص دلچسپی ہے۔ ابتدا میں بھائی حامد علی صاحب مرحوم سے اصلاحِ سخن لیتے تھے۔ اُن کے انتقال کے بعد شعر و سخن میں بھی مجھ سے مشورہ کرنے لگے۔ صاحبِ تصنیف و تالیف ہیں، اور آجکل کی شاعری میں عہدِ حاضر کے رجحانات؛ زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

خموشی نے تو کر دی اور شانِ دلبری پیدا
تری تصویر مجھسے بھی حسیں معلوم ہوتی ہے

اُبلتا ہے لہو رہ رہ کے ہر اک سنگریزے سے
شہیدِ ناز کی تربت یہیں معلوم ہوتی ہے

نظر میں چھپ گیا ہے اس قدر حسنِ جہاں آرا
کہ ہم کو کوئے جاناں ہر زمیں معلوم ہوتی ہے

نکلتے ہیں رو زلالہ وگل ہجر یار میں — پس ہو مرا تو آگ لگا دوں بہار میں
کیا کیا عنایتیں ہیں مرے حال پر کریم — اک دل ملا تھا وہ بھی نہیں اختیار میں

رہِ الفت میں اتنے ہو گئے خوگر بلاؤں کے
جہاں کوئی نہ ٹھہرے ہم اُسے منزل سمجھتے ہیں

تماشا کچھ نہیں ہے حال بیمارِ محبت کا — جگر کو تھام لیں بیتابیِ دل دیکھنے والے

روح

بشیشر دیال ۱۸۸۱ء میں پیدا ہوئے۔ وطن لکھنؤ تھا۔ بسلسلۂ ملازمت الہ آباد آئے۔ ہائی کورٹ میں پیشکار رہے۔ اب پنشن لیکر بادشاہی منڈی میں رہتے ہیں عالی خاندان ہیں۔ والد کا نام ٹھاکر پرشاد صاحب تھا۔ آپ درویش خصلت اور صوفی مشرب آدمی ہیں۔ نمونۂ کلام:

ہوا سے عدل جب چلتی ہے تو انصاف ہوتا ہے
دبے رہتے ہیں فتنے چین سے مظلوم سوتا ہے

رحمت

شیخ رحمت اللہ۔ تجارت پیشہ عمر تقریباً ۷۰ سال۔ اوائل عمر میں ایک مہجبین سے عشق ہوا جو ملکۂ جان و دل بن کر شعر گوئی کا باعث ہوئی۔ صاحب دیوان ہیں۔ غزل۔ سلام۔ نوحہ۔ نعت۔ منقبت۔ دادرا۔ ٹھمری سب کچھ کہتے ہیں۔ نمونۂ کلام:

اب اس آئینہ رو کی کچھ عنایت ہونے والی ہے
کوئی دم میں سکندر میری قسمت ہونے والی ہے

ہجر تہمت فراق سہہ دل سے — زندگی کٹ رہی ہے مشکل سے

زاہد

منشی تربینی سہائے۔ الہ آباد میں وکالت کرتے ہیں۔ شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ عمر کے ساتھ ساتھ مشق سخن بھی بڑھتی گئی۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

ہوں جو آنکھیں عالمِ گورِ غریباں دیکھئے ۔۔۔ سیکڑوں منظر ہیں اس منظر میں پنہاں دیکھئے
ہم نے وہ راحت اٹھائی خانۂ صیاد میں ۔۔۔ جی نہیں اب چاہتا سوئے گلستاں دیکھئے
دل کا اک اک داغ اب اپنی جگہ ہے باغ باغ ۔۔۔ یوں تو دیکھے ہیں بہت یہ بھی گلستاں دیکھئے

زخمی

سید عباس علی ساکن محلہ گڈھی شہر الہ آباد۔

مجھ کو پہنچایئے واں بہر پیمبر حیدر ۔۔۔ چرخ بھی جس کے لئے کھاتا ہے چکر حیدر
بات کی بات میں جا پہنچیں گے ہم منزل پر ۔۔۔ فضل خالق سے ملے ہیں ہمیں رہبر حیدر

سجاد

سجاد حسین الہ آبادی شاگرد والا جاہ عالی جناب شاہزادۂ مرزا قیصر بخت فروغ

ٹوٹتی تھی کمر گاو زمیں صدمے سے ۔۔۔ جب قدم رکھتے تھے چلنے میں زمیں پر حیدر
کیوں نہ کونین کمن الملک بجا دے نصرت ۔۔۔ فوج میں امت احمد کے ہیں افسر حیدر

سجاد

میر سجاد علی محلہ راجہ پور شہر الہ آباد کے رئیس تھے۔ علوم متداولہ میں دستگاہ تھی۔ فارسی ادبیات سے زیادہ شغف رکھتے تھے۔ اردو میں شعر کہتے تھے کرتے اور ترویج اردو کے خیال سے عظیم الشان مشاعرہ منعقد کرتے تھے۔ بڑے خوبیوں کے بزرگ تھے ۱۹۳۲ء میں انتقال ہوا۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

فرقت عذاب جاں ہے دل بیقرار کو ۔۔۔ مر مر کے کاٹتا ہوں شب انتظار کو

آنکھوں سے راہ عشق میں میرا مذاق درد　　دل میں اُٹھا کے رکھتا ہے ہر غم کے خار کو
الفت میں رنگ لاتے ہیں سٹ کر جگر کے داغ　　اُجڑے ہوئے چمن کی بھی دیکھو بہار کو
میں چاہتا ہوں نالے باندازِ نَو کردں　　طرزِ فغاں چمن میں سکھا دوں ہزار کو

دنیا سے یوں مٹا ہے سجادؔ کا نشاں
ڈھونڈے اگر کوئی تو نہ پائے مزار کو

سراجؔ

سید سراج الحق آپ کے والد کا نام سید محمد حسین تھا۔ سلسلہ نسب شاہ غلام علی رحمۃ اللہ علیہ سے ملتا ہے۔ عربی و فارسی میں اچھی استعداد رکھتے ہیں جمنا مشن ہائی اسکول الہ آباد میں علوم مشرقیہ کی تعلیم دیتے ہیں۔ شعر و شاعری سے فطری ذوق ابتدا سے تھا۔ شرف تلمذ حضرت نوحؔ ناروی سے ہے۔ غزلوں کے علاوہ قطعات۔ رباعی اور نظمیں بھی کہا کرتے ہیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

مذمت میکدہ میں اور ست کی تو بہ کرو واعظ　　کہیں ایسا نہ ہو رندوں سے کچھ تقصیر ہو جائے

حریفِ عشق بن کر حسن کی رسوائیاں توبہ　　پتنگے اپنی لو میں جل بجھے فریاد کیا کرتے

جنازہ نکلنے لگے میرا جس دم　　اگر جی میں آ جائے آ جائیے گا

راہ میں وہ کہیں مل جائیں تو پوچھوں اتنا
جی یہ بن جاتی ہے جس وقت تو کیا کرتے ہیں

یہ نرالی چھیڑ انوکھی شوخی بیداد ہے　　پوچھتے ہیں قصۂ فرہاد تم کو یاد ہے

لگ جائے آگ ایسی محبت کی آگ کو　　افشا نہ کر سکے اسے پنہاں نہ کر سکے

سعدیؔ

انتخاب حسین دریاآباد کے رہنے والے ہیں۔ آپ کے والد کا نام محمد حنیف خاں

مرحوم تھا۔ گورنمنٹ اسکول میں ماسٹر ہیں تجلی صاحب سے شرف تلمذ ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

اے ساقیِ بزمِ ہوش رُبا مخمور نگاہی کا صدقہ
کچھ ایسا جام مست پلا دنیا سے مجھے غافل کر دے

اے گلِ نوخاستہ اے صنعتِ پروردگار
قلبِ بلبل کے سکوں، روحِ چمن جانِ بہار
غیرتِ حورِ جناں بوپیرہن رنگیں عذار
حسنِ فطرت جوہرِ خوبیِ گلستانِ بہار

دستِ بیضائے چمن میں آتش رو ئیدہ ہے
تیرے آگے برق سینا اک خس کاہیدہ ہے

سعید

سعید الدین الہ آبادی۔

آمدِ فصلِ بہار اور راہ میں بجلی کی کوند
آج گلشن میں مری حسرت کا ساماں دیکھیے
گلشنِ ناپائدار اور ابتسامِ رنگ و بو
شبنمِ انجام میں ہے اشک افشاں دیکھیے

سلامت

عبد السلام نام عمر ۴۵ سال۔ نمونۂ کلام:۔

یوں کسی کی انجمن میں ہم رہے
گل میں جیسے قطرۂ شبنم رہے

مجھ کو لے چل اے اجل ایسی جگہ
جس کے آگے پھر کوئی منزل نہ ہو

سنجر

سید رضا احمد۔ آپ کے والد مولوی سید محمد محسن مرحوم تھے۔ اصل باشندے موضع کراری الہ آباد کے ہیں لیکن آپ کے آبا و اجداد دریا آباد میں آکر مقیم ہوگئے سنجر صاحب کی تعلیم و تربیت الہ آباد ہی میں ہوئی تجلی صاحب سے شرف تلمذ

حاصل ہے ٹی الحال کورٹ آف وارڈس میں ملازم ہیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

حریم ناز سے نکلا ہے بے نقاب کوئی ۔۔۔ نگاہ شوق سے کہدے کہ ہوشیار رہے

پیدا ہوئی ہے کیوں صف محشر میں برہمی ۔۔۔ چھیڑی کسی غریب نے کیا داستان دل

سیّد

سید نوازش حسین۔ محلہ دریاآباد الہ آباد کے معززین میں سے ہیں پیدائش ۱۸۶۸ء میں ہوئی۔ تعلیمی زمانے کے اختتام پر ہائی کورٹ الہ آباد میں ملازم ہوئے جہاں سے تیس سال فرائض منصبی ادا کرنے کے بعد ۱۹۲۳ء میں پنشن پائی۔ چند کتابیں نظم و نثر میں شائع کرا چکے ہیں۔ کلام میں مذہبی رنگ جھلکتا ہے۔ مداح اہلبیت ہیں اور زیارت عتبات عالیات سے مشرف ہو چکے ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

رباعی

کیا بتائیں آپ سے کیا رہ گیا ۔۔۔ نیک و بد اعمال اپنا رہ گیا
ہو گئے سب عمر کے درجے تمام ۔۔۔ اک فقط مرنے کا جھگڑا رہ گیا

بس نہیں چلتا ہے کچھ بھی سامنے تقدیر کے ۔۔۔ سیکڑوں پھندے بنا یا کیجئے تدبیر کے

آگ پینے کو گئے موسیٰ پیمبر ہو گئے ۔۔۔ دیکھ سکتا ہے کوئی جسکو خدا دینے لگے

الٰہی بخش دے اپنے کرم سے میرے عصیاں کو
کہ میں سید ہوں اور مداح ہوں ائمہ ہوں ذاکر ہوں

سیماب

سید ببر علی شاگرد جناب راجی سید تعشق حسین صاحب تعشق رئیس مانک پور۔

خواہش جام نہ ہے خواہش ساغر حیدر ۔۔۔ میرے ہونٹوں سے ملا دو لب کوثر حیدر
لب کوثر بھی یہ مستانہ صدا ئیں ہوں گی ۔۔۔ ہاں ادھر بھی کوئی جام مئے کوثر حیدر

شاد

شیو پرشاد سنہا الہ آباد ہائی کورٹ کے کامیاب اور نامور وکلا میں سے ہیں۔ اردو شاعری کا فطری ذوق رکھتے ہیں۔

یہ کہاں ایک ایک کر کے سب چمن میں چھپ گئے
ان گلوں کو تو بہارِ جاوداں سمجھا تھا میں
اس نے آ کر دیدیا دل کو سکونِ دائمی
موت کو تو اک بلائے ناگہاں سمجھا تھا میں

شاد

گلاب سنگھ الہ آباد میں کایستھ پاٹ شالہ میں تعلیم پاتے ہیں۔ اُردو سے دلچسپی ہے اور مشاعروں میں شرکت کرتے ہیں۔

انھیں سے پوچھے کوئی بزم ناز کا عالم گئے جو ہنستے ہوئے اور اشکبار آئے

شریف

محمد شریف۔ دائرہ شاہ اجمل کے رہنے والے سرکاری شفاخانہ میں ملازم ہیں۔

شام فرقت جب مری نظروں سے وہ روپوش تھا
میں تھا وحشت تھی جنوں تھا اور جنوں کا جوش تھا

شاداں

ہدایت حسین خاں۔ آپ کے والد کا نام قمر علی خاں صاحب تھا۔ دریاآباد کے رہنے والے ہیں۔ فی الحال بہ سلسلہ ملازمت بمبئی میں مقیم ہیں۔ مضمون نگاری اور افسانہ نویسی سے بھی شوق ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

بکھرتا جا رہا ہے رفتہ رفتہ دل کا شیرازہ یہ کون انگڑائیاں لیتا ہوا اُٹھا ہے بستر سے

کچھ نہ صیاد کا شکوہ ہے نہ گلچیں کا گلہ   اپنے ہاتھوں سے جلایا ہے نشیمن اپنا

ہمیں غرض کیا ہے دورِ ساغر اگر تری بزمِ ناز میں ہے
وہ سازِ عشرت میں بات کیا ہے مزا جو سوز و گداز میں ہے

روٹھنے والے میں نادم ہوں خطا کو بخش دے   اب نہ دل شکوہ کرے گا عمر بھر بیداد کا

ہوا ہے موقوف شورِ عالم فلک نے تاروں کی چھاؤں کر دی
یہ کون مستِ شبابِ شاداں پڑا ہوا خوابِ ناز میں ہے

شاکر

محمد شاکر نام شاکر تخلص ساکن محلہ بہادر گنج ۱۹۱۱ء میں پیدا ہوئے۔

نمونۂ کلام :-

یہ کیسے مان لوں کانٹا نکالا آپ نے دل کا   جہاں پر تھی خلش اب تک وہیں معلوم ہوتی ہے

جوانی میں موت آ گئی مجھ کو شاکر   چھلک ہی گیا جام بھرنے سے پہلے

شاطر

منشی بدری ناتھ الہ آبادی۔ کایستھ پاٹھشالہ کالج میں ملازم ہیں اُردو شاعری سے دلی ذوق ہے۔ طبیعت شگفتہ پائی ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

آپ بھی ناراض اب ہے موت بھی اس سے خفا   کون ہوتا ہے مریضِ غم کا پرساں دیکھئے
نبض گرتی سانس اکھڑی تن پہ چھائی مُردنی   آ بنے جانے ہوئی دنیا کے ساماں دیکھئے
ایک دنیا دیکھئے ہنگامۂ ہستی کے ساتھ   دوسرا عالم سرِ گورِ غریباں دیکھئے

شاہد

شاہ سید محمد شاہد فاخری۔ دائرہ شاہ اجمل کے سجادہ نشین ہیں۔ علوم مشرقیہ میں کافی دستگاہ رکھتے ہیں۔ شاعری کا ملکہ فطرت سے عطا ہوا تھا۔ شوقِ سخن نے

چار چاند لگا دئے۔

بل کھا رہی ہے پھر رسنِ زلفِ یار آج — ہوتا ہے جلوہ دہ اوجِ دار آج

شاہد امیدِ عفو نگہبان عجز ہے — عصیاں کا خوف مجھ کو ڈرائے ہزار آج

شریف

شریف الرحمن۔ آپ کے والد عبدالحلیم خاں صاحب ٹیکا لگانے کے محکمہ میں اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ ہیں۔ شریف صاحب ۱۹۱۴ء میں پیدا ہوئے۔ ہائی اسکول پاس کرنے پر ہائی کورٹ میں بطور کلرک ملازم ہوگئے۔ شعروشاعری سے بھی دلچسپی ہے۔ حضرت شفق عماد پوری سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

کیا طرفہ کشاکش ہے اس عمرِ دو روزہ میں — مرنے کا ابھی ارماں ہے جینے کی بھی حسرت ہے

تجھکو ہم دونوں جہاں سے ہو کے غافل دیکھتے — دیکھ سکتے کاش تو جینے کا حاصل دیکھتے

اب آتی ہے منزل اب آتی ہے منزل — اسی دھن میں بڑھتا چلا جا رہا ہوں

مَیں اس انداز کے صدقے کہ دکھا کر جلوہ

طالبِ دید سے کہتے ہیں ذرا ہوش رہے

قفس سے ہو کے نہ گذری کبھی نسیمِ چمن — بہار میں بھی گمانِ بہار ہو نہ سکا

شعلہ

سید مومن حسین قصبہ کراری ضلع الہ آباد کے رہنے والے ہیں اور ملازمت کی وجہ سے زیادہ تر الہ آباد ہی میں رہتے ہیں۔ کہنہ مشق شاعر ہیں اور ذوق سلیم رکھتے ہیں۔ کلام میں صفائی و پختگی ہے۔

دردِ جگر کا پہلے مداوا کرے کوئی — جب تو مسیح ہونے کا دعویٰ کرے کوئی

شعلہ محال ہے کہ بڑھے دل کی روشنی . جب تک خیالِ دوست نہ پیدا کرے کوئی

اس نے نظر جو پھیر لی رنگِ جہاں بدل گیا   قوتِ انقلاب تھی چشمِ کرشمہ ساز میں

زندگی قلب کی حرکت ہی سے وابستہ ہے   دل جو ٹھہرے گا تو ایک اور قیامت ہوگی

شفق

سید حسن مرتضیٰ۔ آپ کے والد سید حسن رضا صاحب مرحوم صدر الصدور کے عہدہ پر فائز تھے۔ شفق صاحب کی جائے پیدائش عاد پور ضلع گیا صوبہ بہار ہے۔ لیکن آپ کے جد امجد مولوی سید کرامت علی صاحب شہر الہ آباد کے مفتی عدالت تھے اور متعدد مکانات کے مالک تھے آپ کی ولادت سنہ ۱۲۸۹ھ میں ہوئی اس وقت ستر برس کا سن ہے سنہ ولادت آپ کے تاریخی نام "مظہر سعید" سے نکلتا ہے۔ شعر و شاعری سے فطری دلچسپی ہے۔ شرف تلمذ حضرت امیر مینائی لکھنوی سے تھا۔ ہر صنف سخن میں طبع آزمائی فرماتے ہیں۔ خزینۂ رباعیات آپ کی چار سو رباعیوں کا شائع شدہ مجموعہ ہے۔ "مرقع عاضرہ" ایک مطبوعہ مثنوی ہے۔ اس کے علاوہ غزلوں کے دو دیوان۔ قصیدوں کا مجموعہ۔ نظموں کا مجموعہ غیر مطبوعہ ہے۔ آپ نے کئی مرثیے بھی کہے ہیں۔

شفق صاحب نہایت خلیق۔ وضعدار اور ذی مروت بزرگ ہیں مشق سخن کافی ہے۔ پُرگوئی اور زورگوئی آپ کا حصہ ہے۔ نو مشق شعرا کی رہبری میں آپ کو کافی مہارت ہے۔ کبرسنی کی وجہ سے ثقل سماعت ہو گیا ہے۔ غزلیں اور نظمیں مختلف رسالوں میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

اک آہ جو کرے دلِ دیوانہ ہمارا   دو حرفوں ہی میں ختم ہو افسانہ ہمارا
ٹوٹا بھی تو کعبہ کی بنا ڈال کے ٹوٹا   بگڑا تو بنا اور بھی بت خانہ ہمارا

اک جام دمِ نزع تصدق ترے ساقی   لبریز ہوا جاتا ہے پیمانہ ہمارا
دنیا کے الٹ جائیں ورق ختم نہ ہوگا   وہ دفترِ غم ہے شفق افسانہ ہمارا

آنکھوں نے فقط نادانی سے جو دیکھ لیا وہ مان لیا
دل نے تو بڑی دانائی کی بے دیکھے تجھے پہچان لیا
اللہ کے گھر کی دولت تھی اللہ کے گھر کے ساتھ گئی
پہلے تو بتوں نے دل کو لیا پھر دین لیا ایمان لیا

کیوں طور پہ جائیں اے موسیٰ وہ دل میں نظر آجائے گا
نزدیک سے جو دیکھا نہ گیا کیا دور سے دیکھا جائے گا
جب آخری منزل آئے گی وہ سامنے خود آجائے گا
اک اک پردہ دوری کا ہر سانس پہ اُٹھتا جائے گا

دیر و حرم کے پھیر میں اپنا بھرم گنوائے کیوں
گھر پہ جو بے نیاز ہو در پہ کسی کے جائے کیوں
غم کا ہے مستحق وہی جس کو نصیب ہو خوشی
جو نہ ہنسا ہو عمر بھر کوئی اُسے رُلائے کیوں
تو جو سُنے نہ التجا۔ دست نگر ہو کیوں نزا
جب نہ قبول ہو دعا ہاتھ کوئی اُٹھائے کیوں

شمسی

مولوی محمد متین۔ آپ ٹی۔ اے۔ وی ہائی اسکول میں ہیڈ مولوی ہیں اور کہنہ مشق شاعر ہیں۔ حضرت نوح ناروی سے شرف تلمذ حاصل ہے نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

پہلے نظروں کا جمال ورنگ عریاں دیکھئے
اور پھر حسن تبسمہائے پنہاں دیکھئے
پیشتر کچھ کفر میں بھر دیجئے عرفاں کا رنگ
پھر تماشائے فروغ ذوق عصیاں دیکھئے

شکوۂ ظلم و ستم آسان ہے اسے دل مگر
اُن کو کن آنکھوں سے محشر میں پریشاں دیکھئے

ہے زمیں پر لالہ و گل آسماں پر ہے شفق
جلوہ ہائے حسن کا رنگِ نمایاں دیکھئے

دید جلوہ کے لئے محدود ہے شمسی نظر
اقتضائے شوق ہے بے حد پایاں دیکھئے

شمشیر

شمشیر، شاگرد مرزا محبوب علی قوس الہ آبادی۔

منحصر یوسف و سلمان و سلیماں پہ ہے کیا — کس کی مشکل میں نہ ہو جاتے تھے یاور حیدر
لاکھ آفت میں پھنسی ہے مری اک جانِ حزیں — کیجئے امداد مری بہرِ پیمبر حیدر

شمیم

شریعت اللہ۔ اصل وطن گورکھپور لیکن بہ سلسلۂ ملازمت الہ آباد میں مقیم ہیں۔ آپ ڈاکٹر ولی اللہ صاحب ایڈوکیٹ کے بھانجے ہیں اور ۱۹۳۵ء سے شعر کہتے ہیں۔ نشتر صاحب سلونوی سے اصلاح لیتے ہیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

کبھی تو بوئے گل ہو کر کبھی موجِ صبا ہو کر — چمن میں پھر رہا ہے آج کوئی کیا سے کیا ہو کر
نگاہِ غور سے دیکھو تو عقدہ فاش کھل جائے — وفا کے بھیس میں بیٹھا ہے کوئی بے وفا ہو کر
یہ کس کی رہگذر ہے جو معطر ذرہ ذرہ ہے — اِدھر سے کون گذرا ہے گلستاں کی ہوا ہو کر

شمیم اس سخت منزل سے آخر کیوں سراساں ہو
قدم جب اُٹھ پڑے بڑھتے چلو صبر آزما ہو کر

شوق

پنڈت جگموہن ناتھ رینہ۔ ڈپٹی کلکٹری کے عہدہ پر فائز تھے اب پنشن پاتے ہیں۔ نہایت کہنہ مشق اور ریختہ کا رشاعر ہیں۔ صاحب دیوان ہیں۔ جناب شمشیر پھلی شہری سے شرف تلمذ تھا۔ نہایت وسیع الاخلاق اور خوش وضع بزرگ ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

وحشت برس رہی ہے فضائیں ہیں مضطرب ہے کس کا سوگ تجھ کو شب انتظار آج؟
او آنے والے آتا اگر ہے تو آ بھی جا ہونے دے اب تو خاتمۂ انتظار آج

شوق

پنڈت پرتھی ناتھ۔ شاعری سے فطری ذوق ہے۔ کلام میں شگفتگی اور ترنم ہے۔ جو دل پر گذرتی ہے اسے نظم کرتے ہیں اور مزے لے لے کر پڑھتے ہیں جس سے شعر کی رونق بڑھ جاتی ہے۔

کبھی اس کا دور وجود تھا یہی وجہ نام و نمود تھا
پڑا اب کسی سے زمین پہ جو پھرا یہ مشت غبار ہے
یہ کہاں نصیب میرے کہ میں اسے اپنی بزم میں دیکھ لوں
یہی کم نہیں ہے شرف مجھے ترے عاشقوں میں شمار ہے

شوق

منشی دیو نراین۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں بمقام جھونسی ضلع الہ آباد پیدا ہوئے ۱۹۲۱ء میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ پہلے دارا گنج ہائی اسکول میں اردو پڑھانے پر مقرر ہوئے لیکن تھوڑے دنوں کے بعد کائستھ پاٹھ شالہ کالج میں ملازم ہو گئے۔ پرائیوٹ طریقہ سے بی۔ اے اور ایم۔ اے کے امتحانات آگرہ یونیورسٹی سے پاس کئے۔ انجمن اردو کائستھ پاٹھ شالہ کالج کے صدر اور رسالہ کائستھ سماچار کے ایڈیٹر ہیں۔ کتب بینی سے خاص شوق ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

عمر بھر ناکامیوں سے دل کو میرے کام تھا
موت سے پہلے مرا یہ عشق کا انجام تھا

آرزو کے چار حرفوں میں نہاں تھا راز عشق
اس معمہ کو سمجھتا کون ایسا کام تھا

دل میں دو ہیں حرف وہ آپس میں مل سکتے نہیں
دل کو پھر دل سے ملانا کتنا مشکل کام تھا

گو سزائیں اور بھی تھیں حسن کے قانون میں
موت تھی جس کی سزا وہ عشق کا الزام تھا

زندگی میں بھی وظیفہ شوقؔ کا تھا روز و شب
مرتے دم بھی لب پہ اُس کے آپ ہی کا نام تھا

شمیم

سید فضل حسین نقوی ساکن سادات منوری پرگنہ چائل ضلع الہ آباد شاگرد فیض مآب والا جاہ جناب حضرت شاہزادہ مرزا قیصر بخت فروغ بہادر دام اقبالہٗ۔

نور معنی سے ہے آئینہ قمر کی صورت
نقش ہے لوح جگر پر مرے حیدر حیدر

کیا نکیرین کریں بعد فنا مجھ سے سوال
ہے لب گور پہ بھی کلمۂ حیدر حیدر

چمکتا ہے محاسن میں سخ پر نور حیدر کا
گذر ہے یا کہ برج سنبلہ میں مہر انور کا

شاکر

سید شاکر علی زمیندار از سوبا پرگنہ کراری ضلع الہ آباد شاگرد شاہزادہ مرزا قیصر بخت صاحب فروغ۔

کونین میں ہر شخص پہ روشن ہے یہ
ہیں شہر نبی علم کے اور در حیدر

مدت سے تری زیارت کی ہے خواہش اسکو
شاکر کو دکھا دو شہنشاہ اطہر حیدر

شوکت

سید شوکت علی ساکن موضع کہرا پرگنہ ضلع الہ آباد شاگرد جناب میر علی حیاد صاحب نیساں۔

ہو تی رفعت نہ امامت کی جو منظور نبی
پاؤں رکھتے نہ سر دوش پیمبر حیدر

عرش ہل جائے مگر یہ نہ ہلے نام کو بھی
ہاتھ رکھدیں جو تڑپتے ہوئے دل پر حیدر

شفا

حکیم عبدالغنی رئیس بسکی شہر الہ آباد۔

قتلِ کفار کو جب جاتے تھے راکب ہوکر　　آگے چلتے تھے صبا سے بھی شبکتر حیدر
حملہ کرتے تھے بہ تکرار صفِ اعدا پر　　کیوں نہ ہوں حیدرِ کرار مکرر حیدر

شیدا

نثار حسین خاں دریا آباد میں رہتے ہیں اور گورنمنٹ پریس میں ملازم ہیں ریختی گو ہیں۔ کلام نہایت پختہ ہے۔ آپ کا دیوان موسوم بہ "آرسی" شائع ہو چکا ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

یہ بہن بیٹھی ہے سمدھن اور وہ ماں دیکھئے
دیکھنے آئی ہیں لڑکی کو تو ہاں ہاں دیکھئے

ایسی پھوا اللہ پڑیگی بی کہ بس توبہ بھلی
کیا دکھاتی ہے انھیں کو ان کی نہیاں دیکھئے

دولھا بھائی کے بغل میں ٹوپیاں لے بھائی نہیں
مرغی دابے آرہے ہیں خانساماں دیکھئے

لے اڑا گھر سے چڑ بلوں کو یہ انگریزی فیشن
نانی اماں وہ چلیں سائے کی پریاں دیکھئے

کھیلتی ہیں کیسے کیسے کھیل ان مردوں کے ساتھ
اس گھروندے میں یہ مٹی کی گجریاں دیکھئے

دستکار بار سمدھن نے جو سمدھی کو دیئے
کھلکھلا کر ہنس پڑیں بیبنے کی کلیاں دیکھئے

ریختی شیدا کی سن کر بولے سارے مرد وے
پڑھ رہے ہیں شیخ سعدی کی گلستاں دیکھئے

قاضی کی داڑھی پھر نہ ملے گی یہ سوچ لو　　ایک ایک بال اس کا تبرک ہے نوچ لو

شیدا

خواجہ عبدالمجید بیرسٹر۔ علوم مشرقیہ میں کافی دستگاہ رکھتے ہیں۔ شاعری کا ذوق فطری ہے۔ کلام میں سادگی و روانی پائی جاتی ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

افسانہ بے کسی کا ہے ہونے کو کیا تمام — یہ کیوں بھڑک رہا ہے چراغِ مزار آج
شیدا وہ دیکھو کوچہ جاناں ہے سامنے — کیوں بیٹھے ہو تھک کے سرِ رہ گزار آج

شیفتہ

رائے بہادر سوہن لال سریواستو۔ کلکٹری کے عہدہ پر فائز رہے۔ پنشن لے کر الہ آباد میں سکونت اختیار کی۔ کہنہ مشقی پختگی مضمون آفرینی کلام سے ٹپکتی ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

سُن لی کیسے بات یارب تو نے مجھ بدبست کی — تجھ کو خود بدبست ظالم دردِ ہاں سمجھا تھا میں

صادق

سید صادق علی۔ آپ الہ آباد میں وکالت کرتے ہیں اور مستقل سکونت دریاآباد میں ہے۔ شعر شاعری سے بھی دلچسپی ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

درد اُٹھ اُٹھ کر دلِ ناشاد کا — دل بڑھاتا ہے ستم ایجاد کا
ہم ہیں چپ بلبل ہے مصروفِ فغاں — اپنا اپنا ڈھنگ ہے فریاد کا
شمع پروانوں پہ روتی بزم میں — ہے کچھ دل نہیں فولاد کا

چپ ہو صادق چپ ہو ہلتا ہے فلک
کچھ ٹھکانا ہے تری فریاد کا

ضامن

سید ضامن علی شاگرد میر ممتاز حسین صاحب شہر الہ آباد محلہ سبزی منڈی۔

کیوں نہ اغیار سے ہوں رتبہ میں بڑھ کر حیدر   بندۂ خاص خدا خویش پیمبر حیدر
فلک عز و شرافت کے ہیں اختر حیدر   ناصر دین نبی فاتح خیبر حیدر

ضامن

سید محمد ضامن نقل نویس تحصیل کھیرا گڑھ ضلع آگرہ ساکن قصبہ کراری ضلع الہ آباد۔

باعث اوج سلیمان و سکندر حیدر   حاکم جن و بشر بندۂ داور حیدر
پار ہو جائے گا بیڑا نہیں کچھ خوف دلا   کشتی دین محمد کا ہے لنگر حیدر

طیب

مولوی سید طیب حسین ابن مولوی سید امیر حسین صاحب ساکن کراری ضلع الہ آباد

زور بازوئے نبی قدرت داور حیدر   ہے پیمبر کا برابر کا برادر حیدر
قمر برج امامت ہے مقرر حیدر   چاند گیارہ ہیں تو اک مہر منور حیدر

طاہر

طاہر حسین خاں رئیس دریا آباد شہر الہ آباد شاگرد جناب صادق حسین خاں صاحب شائب۔

ہیں مرے ہادی دیں بعد پیمبر حیدر   مرے مولا مرے رہبر مرے سرور حیدر
نقشۂ کرب و بلا نظروں میں پھر جاتا تھا   دیکھ لیتے تھے جو ملعونوں کے خنجر حیدر

طاہر

سید یوسف حسین ۱۸۶۶ء میں بمقام مٹیا برج شہر کلکتہ پیدا ہوئے۔ ننھیالی محلات میں پرورش پائی۔ مڈل تک تعلیم پائی ۱۸۹۷ء سے الہ آباد میں مقیم ہیں ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۴ء تک سید محمد ضامن صاحب رئیس الہ آباد کے یہاں

دیوان رہے۔ کچھ دن جمنامشن اسکول میں ملازم رہے۔ ۱۹۳۱ء سے شاعری کرنے لگے۔ مولوی سید حامد علی صاحب مرحوم سے اصلاح لیتے تھے۔ غزلوں کے علاوہ سلام اور قصیدے بھی کہتے ہیں نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

شناورِ بحرِ الفت کے تلاطم سے نہیں ڈرتے ۔۔۔ ہر اک گرداب کے آغوش کو ساحل سمجھتے ہیں
فریبِ دہرِ فانی کے کرشموں سے جو ہیں واقف ۔۔۔ حقیقت میں وہی کچھ معنیِ منزل سمجھتے ہیں
ٹپک پڑتے ہیں آنسو ٹوٹتا ہے جب کوئی چھالا ۔۔۔ جو اہلِ درد ہیں ہر آبلہ کو دل سمجھتے ہیں

تو ہی ہے عشق کا مرجع تو ہی ہے حسن کا مبدا ۔۔۔ خدا جانے تجھے کہتے ہیں کیا کیا دیکھنے والے
کوئی انگڑائیاں لیتا ہوا محشر میں آتا ہے ۔۔۔ جگر تھامے رہیں ہاتھوں سے اپنا دیکھنے والے

مدعائے دلِ طاہر کا اگر کوئی حرف
آپ سن لیں تو وہی لفظ تمنا ہو جائے

طالب

سید طالب علی میر عابد علی صاحب مرحوم ایڈوکیٹ کے صاحبزادے ہیں۔ الہ آباد یونیورسٹی سے ایم۔ اے کی ڈگری اردو ادب میں حاصل کرنے کے بعد امتحان قانون بھی اسی درسگاہ سے پاس کیا۔ اور اب خود بھی ایڈوکیٹ ہائیکورٹ ہیں۔ طالب صاحب اپنی طالبعلمی کے زمانہ ہی میں متعدد کتابوں کے مصنف ہو گئے تھے۔ اکبر الہ آبادی [illegible] پر ایک پُر مغز پیش لفظ [illegible] تھا جو کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔ شعر و شاعری سے بھی فطری انس ہے۔ نظمیں بھی کہی ہیں اور غزلیں بھی۔ طبیعت خوب پائی ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

تھے مری آنسو مرے آنکھیں مری ساغر مرے ۔۔۔ کیا غضب ساقی ہے [illegible] کیا کام ساغر سے مجھے

اُمنڈ آتے ہیں آنسو خیال آتے ہی ۔۔۔ شبِ فراق کا کس طرح ماجرا کہئے

انتظارِ یار میں کیا بیخودیِ شوق ہے ۔۔۔ چونکہ [illegible] خود اپنی سانس کی آواز سے

شرطِ الفت ہے یہی لے دل کہ وہ رسوا نہ ہوں — گھٹ کے مرجائیں مگر روئیں نہ ہم آواز سے
سامنے آئینہ رکھا ہے عجب انداز سے — کھیلتے جاتے ہیں وہ اپنی نگاہِ ناز سے

کبھی پانی برس اُٹھا کبھی بجلی چمک اُٹھی — مزا برسات کا ہے آہِ سوزاں چشمِ گریاں میں
کلیجے کے پھپھولے جل اُٹھے سب تپشِ دل سے — چراغِ زیرِ داماں ہے لگی اک آگ داماں میں

عقیل

سید عبدالرؤف کانپوری حال مقیم پھول پور شاگرد والا جاہ شہزادہ مرزا قیصر بخت فروغ۔

بانیِ دینِ نبوی کے ہیں صفدر حیدر — بالیقیں ہیں چمنِ دین کے گلِ تر حیدر
مقتدا تھا دمِ جنگ جو کوئی خود سر — ایک ہی وار میں دو کرتے تھے پیکر حیدر

عارف

سید عارف حسین ساکن ودیاپ قصبہ کڑا ضلع الہ آباد شاگرد سید تعشق حسین صاحب تعشق۔

چشمِ خورشیدِ فلک دیدۂ اختر حیدر — رنگِ گلزارِ جناں بوئے گلِ تر حیدر
نغمۂ بلبلِ دل کیوں نہ ہو حیدر حیدر — گلشنِ نورِ خدا کے ہیں گلِ تر حیدر

عزیز

عبدالعزیز خاں ساکن بہادر گنج شاگرد مرزا محبوب علی صاحب قوس۔

دیجئے تسکین اسے بہرِ پیمبر حیدر — اب سنبھلتا ہی نہیں ہے یہ دلِ مضطر حیدر
مست و سرشار رہا پھر وہ مئے الفت سے — پی لیا جس نے مئے عشق کا ساغر حیدر

شکیلہ

بی عمدہ جان ساکن محلہ سرائے داؤد خاں شہر الہ آباد۔

دو جہاں میں تو انھیں کا ہے سہارا مجھ کو ‌ ‌ ‌ ‌ میرے مولا مرے آقا مرے سرور حیدر
ان کی کہلاتی ہوں میں ہے یہ مرے دل کو نقیں ‌ ‌ ‌ ‌ نہ پھرائیں گے جہاں میں مجھے در در حیدر

عاشق

تقی علی خاں تعلقدار و رئیس دریا آباد الہ آباد۔

حق نما خلق کے ہیں روئے زمین پہ حیدر ‌ ‌ ‌ ‌ ہیں خدائی کے لئے حجت داور حیدر
اس وجہ سے بخدا کہتا ہوں حیدر حیدر ‌ ‌ ‌ ‌ مشکلوں میں مرے کام آتے ہیں اکثر حیدر

عرفاں

سید ہاشم علی۔ آپ کے والد میر کاظم علی صاحب زمیندار تھے۔ ہاشم صاحب نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور اس وقت ہائی کورٹ میں مترجم کے عہدہ پر مامور ہیں۔ شعر و شاعری سے بھی دلچسپی ہے۔ تجمل صاحب کے شاگرد ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

دونوں ہیں مبتلائے غم گردشِ روزگار میں
مرغ چمن قفس میں ہے گل ہے کنار خار میں
کہنا تھا مدعائے دل پر نہ کوئی سمجھ سکا
ملتے تھے لب مریض کے حالت اختصار میں

صبر و قرار ہے نہ وہ تاب و توانِ دل ‌ ‌ ‌ ‌ کس کی نظر نے لوٹ لیا کاروانِ دل

عشرت

رگھوراج بلی سنہ ۱۹۱۵ء میں پرتاب گڈھ میں پیدا ہوئے۔ کالیستھ سری واستو ہیں۔ کالیستھ پاٹھ شالہ اسکول میں ماسٹر ہیں۔ آپ کا وطن موضع منتے پور ریاست بھوا ضلع رائے بریلی ہے۔ والد کا نام منشی برج بہادر لعل صاحب ہے۔ آپ کے دادا منشی اودھ بہاری لعل صاحب انگریزی فارسی

اردو، ہندی میں اچھی استعداد رکھتے تھے اور اچھے شاعر تھے۔ ان کے فیض صحبت سے شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ آپ کو ناخدائے سخن جناب نوح ناروی سے تلمذ ہے۔
نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

گل کو خنداں دیکھ کر بلبل کو گریاں دیکھ کر
رو پڑا صیاد بھی رنگِ گلستاں دیکھ کر

مرجھا کے پھول کتنے ہیں غنچوں سے باربار
پھولو نہ تم چمن کی دو روزہ بہار پر

دیر و حرم کا دہر سے مٹ جائے تفرقہ
دونوں گھروں میں کاش ہو روشن چراغ دل

شفق پھولی فلک پر گل کھلے صحن گلستاں میں
یہ سب رنگینیاں پیدا ہوئیں خون شہیداں سے

غضنفر

میر غضنفر حسین خلف اصغر جناب میر عبد اللہ صاحب صدر قانون گو ضلع الہ آباد شاگرد سید فضل حسین صاحب شمیم۔

گو بنا دیتے تھے مفلس کو تونگر حیدر
آپ قانع تھے مگر نانِ جویں پر حیدر

جب مصیبت میں پھنسی روز ازل عقلِ کل
دستگیری کے لئے آئے برابر حیدر

غفور

شیخ عبد الغفور ساکن موضع بیلی شہر الہ آباد شاگرد جناب محمد نواب خاں صاحب باسل الہ آبادی۔

کس طرح کشتیِ اسلام نہ محفوظ رہے
ناخدا ہیں جو محمد تو ہیں لنگر حیدر

چمن ملک تمی کے جو طرفہ گل تھے
جسم میں رکھتے تھے خوشبوئے پیمبر حیدر

غیاث

غیاث الدین نام۔ غیاث تخلص سنہ ۱۹۱۶ء میں الہ آباد میں پیدا ہوئے۔
نمونہ کلام ملاحظہ ہو:-

نظر کو وہ ذوقِ نظر دے الٰہی — کہ ہر شے میں دیکھوں میں صورت کسی کی

جہاں اُن کا خیال آیا کئے وہیں سجدے کر ڈالے — نہیں منت کشِ حسنِ جبیں دیوانگی میری

فراق

جناب رگھوپتی سہائے صاحب ایم۔ اے گورکھپوری۔ گورکھپور کے رہنے والے ہیں۔ الہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی کے لکچرار ہیں۔ غزلیں۔ قطعات اور نظمیں کہتے ہیں۔ مشقِ سخن بہت عرصہ سے جاری ہے۔ نئے مضامین کی تلاش اور نئی طرزِ ادا کی کوشش میں غرق رہتے ہیں۔ کلام کا اثر دل کے چوٹ کی غمازی کرتا ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

تھی یوں تو شامِ ہجر مگر پچھلی رات کو — وہ درد اٹھا فراق کہ میں مسکرا دیا

کبھی پابندیوں سے چھٹ کے بھی دم گھٹنے لگتا ہے — در و دیوار ہوں جس میں وہی زنداں نہیں ہوتا
فراق اک اک سے بڑھ کر چارہ سازِ درد ہیں لیکن — یہ دنیا ہے یہاں ہر درد کا درماں نہیں ہوتا

دل دکھ کے رہ گیا ہو الگ بات ہے مگر — ہم بھی ترے خیال سے مسرور ہو گئے

اک فسوں سامانِ نگاہِ آشنا کی دیر تھی — اس بھری دنیا میں ہم تنہا نظر آنے لگے

اب فضا میں وہ اک کسک سی نہیں — مٹ چلی ہیں نشانیاں تیری

نثار پرسشِ غم کے ترے کرم کے نثار — ہیں غیرتیں بھی کچھ اے دوست عشقِ رسوا کو

بتا کہ دولتِ کونین کیا کرے وہ دل — کہ تجھ سے بھی جو نہ بدلے تری تمنا کو

یہ عجیب جاگتا خواب ہے کبھی چھپتے مُردے نظر پڑے
یہ جہاں ہے کہ فراق یہ کبھی جہانیوں کا مزار ہے

فراق

عبدالجلیل خاں نام۔ فراق تخلص۔ اُردو، فارسی کی تعلیم اپنے نانا حکیم حافظ محمد قمرالدین صاحب سے حاصل کی۔ شعر و شاعری کا شوق ۱۹۳۰ء سے ہے۔ مرزا محمد محسن مرحوم سے شرف تلمذ تھا۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

نالے جب بیقرار کرتے ہیں — چرخ کو ہوشیار کرتے ہیں
آپ غیروں کو پیار کرتے ہیں — جبر ہم اختیار کرتے ہیں
ایک دن بھی نہ آئے وعدہ پر — روز ہم انتظار کرتے ہیں
تو وہ گل ہے کہ باغ عالم میں — دل فدا دل نثار کرتے ہیں

آئے فراق آج وہ سر مقتل
دیکھئے کس پہ وار کرتے ہیں

فروغ

حکیم فضل حسین رئیس الہ آباد۔

المدد غیبی اے شہ صفدر حیدر — یا علی قوت بازو سے پیمبر حیدر
قلعہ سر کرکے بڑھے تھے مع لشکر حیدر — کیوں نہ پل تختہ بنا دے در خیبر حیدر

قاصر

محمد علی نام قاصر تخلص۔ آپ کے والد کا نام شیخ بخشش علی تھا۔ ۱۸۸۳ء میں محلہ چک الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ عربی و فارسی کی تعلیم گھر پر حاصل کی اور ملا فاضل کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۰۱ء میں جمنا مشن اسکول الہ آباد میں بحیثیت معلم فارسی ملازم ہوئے لیکن ۱۹۱۵ء سے ماڈرن ہائی اسکول میں ہیڈ مولوی کے معزز عہدے پر فائز ہیں۔ مشق سخن تیس بتیس سال سے جاری ہے۔ میر علی عباد صاحب نیستاں الہ آبادی کے ممتاز شاگردوں میں سے ہیں۔ بہت سیدھے سادے خلیق آدمی ہیں۔ اصناف شاعری میں سے قصیدہ، غزل۔

سلام - قطعہ - رباعی اکثر کہتے رہتے ہیں۔ ان کے شاگرد بھی کافی ہیں۔ کہنہ مشق شاعر ہیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو -

فصلِ بہار کیا ہے - کیا موسمِ خزاں ہے
اک ہے خوشی کا قصہ اک غم کی داستاں ہے

آئیے دل میں بہارِ داغِ ہجراں دیکھئے
زندگی بھر کی ریاضت کا گلستاں دیکھئے

دل کے آئینے میں پہلے حسنِ عرفاں دیکھئے
جس طرف پھر دیکھئے تصویرِ جاناں دیکھئے

رہ گیا بعدِ فنا بھی ارتباطِ حسن و عشق
جم گیا ہے تیغ پر خونِ شہیداں دیکھئے

آبرو رکھتی ہے میری یاد ہوتی ہے مجھے
کیا دکھاتی ہے شبِ غم چشمِ گریاں دیکھئے

ہند میں قاصر بہت اب دل ہے گھبرایا ہوا
عزم ہے اپنا کہ بس چل کر خراساں دیکھئے

قطعہ

گلشنِ رنگیں بیاں کو گل بداماں دیکھئے
مدتوں کے بعد پھر رنگِ گلستاں دیکھئے

کہہ رہی ہے حضرتِ بیرو سے یہ ہر ہر کلی
تہنیت کے پھول لائے ہیں سخنداں دیکھئے

قرار

آغا عبدالرحمٰن خاں کابلی حال وارد الہ آباد۔ شاگرد حافظ ظہور احمد صاحب سوداگر وقار -

پس از حمدِ خدا لکھوں میں وصف اپنے پیمبر کا
وسیلہ دو جہاں کا ہے سہارا روزِ محشر کا

دلا لازم ہے تجھکو انکے در پر جبہہ سائی کر
سرِ مغفور کو محتاج پایا جن کی ٹھوکر کا

قمر

سید مظفر حسین محکمہ ڈاک میں انسپکٹر تھے - پنشن لیکر الہ آباد میں سکونت اختیار کی - شعر گوئی سے بہت دلچسپی رکھتے تھے۔ ۱۹۱۸ء میں انھیں کی تحریک سے ماہانہ بزم مشاعرہ کی بنیاد میں نے ڈالی جو آج تک برابر میرے مکان پر ہوتا ہے

نہایت خوش خلق سادہ مزاج اور پُر خلوص بزرگ تھے۔ شعر بھی بڑی محنت سے کہتے تھے۔ بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے خدا مغفرت کرے۔

اک نئے شان سے عالم میں بہار آئی ہے　　دوشِ بوئے گلِ رنگیں پہ سوار آئی ہے

تلاش کوئے جاناں ہی میں مر جائیں تو اچھا ہے

حیاتِ چندروزہ کو حیاتِ جاوداں کر لیں

شبِ ایفائے وعدہ ہے کوئی دم میں وہ آتے ہیں

نئے ارماں قمرؔ کچھ اور دل میں میہماں کر لیں

قمر

عبدالحمید نام قمرؔ تخلص ۱۹۲۲ء میں الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ نمونہ کلام:-

پریشانی مری اتنی بڑھی تیری محبت میں　　پریشاں ہو گئے مجھکو پریشاں دیکھنے والے

یہ شوریدہ بختی یہ قسمت کا چکر　　کہ منزل سے واپس چلا آرہا ہوں

نقاب اُلٹ کے جو صورت دکھائی جاتی ہے　　کسی غریب کی ہستی مٹائی جاتی ہے

قاسم

میر قاسم حسین رئیس سنجر پور ضلع جونپور حال وارد الہ آباد شاگرد نسیمؔ الہ آبادی۔

قاسم خلد بریں مالک کوثر حیدر　　حامیِ دینِ مبیں شافعِ محشر حیدر

شبِ معراج عجب جادۂ معنی تھا عیاں　　مصطفےٰ پردہ کے باہر رہے اندر حیدر

قمیر

میر بندہ حسن مقیم بلیش کالی کرتی الہ آباد۔ شاگرد مرزا محبوب علی فوسؔ۔

سقفِ دینِ نبی کے ہیں ستوں گر حیدر　　قصرِ اسلام کے در بھی ہیں مقرر حیدر

سونگھ کر آپ کا گیسوئے معنبر حیدر　　حالتِ وجد میں تھا خالقِ اکبر حیدر

قدیر

محمد قدیر خاں رئیس دریاباد الٰہ آباد۔

ہاتھ اللہ کے احمد کے برادر حیدر — کیوں نہ ہوں قوت بازوئے پیمبر حیدر
کون ہے بعد نبی کوئی جو پوچھے تو کہو — میرا مولا مرا آقا مرا سرور حیدر

قیوم

محمد عبد القیوم خلف ڈاکٹر کریم بخش صاحب کیٹ گنج الٰہ آباد شاگرد محمد نواب خاں یاس۔

کیوں نہ عالم میں ہوں مشہور دلاور حیدر — وادی قہر خدا کے ہیں غضنفر حیدر
ایک ساں ظاہر و باطن ہو جو کوئی شاغل — آئنہ وش ہیں نفس کے مگر حیدر حیدر

قیس

مرزا محمد سعید علی رئیس بہادر گنج شہر الٰہ آباد شاگرد شہزادہ مرزا قیصر بخت فروغ۔

آرزو ہے کہ لگاؤں میں مزار آنکھوں سے — مجھ کو بلوا تو نجف بہر پیمبر حیدر
آرزو ہے یہی یا رب کہ پس کلمۂ پاک — ہو دم نزع زباں پر مرے حیدر حیدر

کوثر

زین العابدین خاں نام، کوثر تخلص۔ آپ ارشاد حسین خاں صاحب کے صاحبزادے ہیں۔ ماڈرن اسکول الٰہ آباد میں کچھ دنوں سے تعلیم دینے پر مامور ہیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

ضبط غم سے کام لیکر دل مرا خاموش تھا — حسن کی رسوائیوں کا عشق پردہ پوش تھا
انتہائے ضعف نے پایا اسے وارفتگی — ہوش میں آتے ہی پھر بیمار غم بیہوش تھا

کاملؔ

قصبہ کراری ضلع الہ آباد کے باشندے ہیں بچپن ہی سے شعر گوئی کا شوق تھا۔ ابتدا میں جناب جاوید صاحب لکھنوی سے اصلاح لیتے تھے پھر جناب تحمل صاحب دریاآبادی سے مشورہ سخن کرنے لگے۔ غزل۔ قصیدہ۔ نوحہ۔ سلام۔ مرثیہ۔ غرض ہر صنف شاعری میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

خود کو ذلیل و خوار کیا ہائے کیا کیا　　اس دل کا اعتبار کیا ہائے کیا کیا

کمالؔ

شیخ کمال الدین احمد رئیس موضع بیدلاہی ضلع الہ آباد۔

کوندجاتی ہے لعینوں کی نظر میں بجلی　　ہاتھ میں لیتے ہیں جب تیغ دوپیکر حیدر
دنگ ہوتے تھے فصیحان عرب سن کے بیاں　　وعظ فرماتے تھے جس دم سر منبر حیدر

کمیلؔ

حکیم سید اطہر حسین رئیس قصبہ کراری ضلع الہ آباد۔

فاتحہ پڑھ کے یار اٹھتا ہے　　حشر قریب مزار اٹھتا ہے

کھرےؔ

منشی بھگوان دین۔ تاریخ پیدائش ۴ جولائی ۱۹۰۵ء مقام پیدائش موضع بندہری ضلع الہ آباد۔ ایم اے کی ڈگری آگرہ یونیورسٹی سے حاصل کی۔ بہ سلسلۂ ملازمت الہ آباد آئے اور ڈی۔ اے۔ وی اسکول میں انگریزی کے استاد ہیں۔ پڑھنے کا شوق درجۂ چہارم سے اور شعر کہنے کا ذوق درجۂ نہم سے ہوا۔ آپ صرف غزل ہی کہتے ہیں۔ نمونۂ کلام :-

جزا کا خون کیا ہو مجھ کو پیش داورِ محشر　　وہ دل لائے ہیں میر ائیں بھی انکا تیر لایا ہو

خوش ہیں سب کیوں حالِ زارِ عندلیباں دیکھ کر
میں ہوں سرگرمِ فغاں رنگِ گلستاں دیکھ کر
بارور ہوگا کسی دن نخلِ آزادی ضرور
کہہ رہے ہیں غیر بھی خونِ شہیداں دیکھ کر

گلزار

شاہ ولایت احمد عرف گلزار شاہ رئیس الہ آباد۔

غرب سے چاہیں تو اک ہاتھ بڑھا کر حیدر
شرق میں چھین لیں بھری سے کبوتر حیدر
دم میں ہو واصل حق اور شہادت ہو نصیب
دیکھیں گر جانب خوں ریز ستمگر حیدر

گدا

گدا حسین خاں رئیس دریا آباد۔ ظریفانہ شاعری کرتے تھے قصیدہ۔ غزل۔ رباعی۔ سب اسی رنگ میں کہتے تھے اور خوب کہتے تھے کلام کمیاب ہے۔

ہر اک عاشق وہاں اپنے کو افلاطوں سمجھتا تھا
بس اتنی بات پر بلوہ ہوا ہے بزمِ جاناں میں

گلشن

دیوان پنڈت رادھے ناتھ کول۔ لاہور کے مشہور رئیس ہیں الہ آباد میں عرصہ سے قیام رکھتے ہیں۔ بڑے عالی حوصلہ ہیں اور اُردو کی ترقی و اشاعت میں برابر کوشاں رہتے ہیں۔ آپ نے بڑے بڑے عالی شان مشاعرے منعقد کئے اور

اب بھی کرتے ہیں۔ ایک مجموعہ کلام شائع ہو چکا ہے۔ آپ کے اشعار میں ہمیشہ پند و نصائح کا کوئی نہ کوئی پہلو رہتا ہے۔ اسی وجہ سے 'سعدیِ ہند' کے لقب سے مشہور رہیں۔ کلام میں پختگی اور دل آویزی ہے۔ بہت خوبیوں کے بزرگ ہیں۔

دنیا میں پہلے آنا دنیا سے چلے جانا | وہ تلخیِ فرقت ہے یہ وصل کی لذت ہے
خدمت ہی کو آئے ہیں ہے فرض بھی خدمت ہی | خواہاں نہ صلہ کے ہوں خدمت ہی عظمت ہے
یہ کم نہ کبھی ہوگا تم صرف کئے جاؤ | یہ علم کا گنجینہ بڑھتی ہوئی دولت ہے

محبت کا مجھ کو اثر دیکھنا ہے | دلِ یار میں اپنا گھر دیکھنا ہے
خدا کے حوالے کرو کام اپنا | مقدر کا لکھا اگر دیکھنا ہے
چمن دل کا اَبرِ محبت سے سینچو | جو تدبیر کو کارگر دیکھنا ہے

بے سفر پہونچا نہ منزل پہ کوئی بھی سالک | خوش نہ ہو کوئی نقط راہ کے پا جانے پر

آنے کی اک تھکن ہے جانے کی اک مہم ہے | دم لیتا ہے مسافر مہمان سرائے تن میں
کثرت میں دیکھتے ہیں وحدت کا رنگ گلشن | رونق ہے ایک گل ہوں گو سیکڑوں چمن میں

منظورؔ

منظور علی خاں ولد عاشق علی صاحب محلہ دریا باد الٰہ آباد، شاگرد میر عزیز الدین حیدر صاحب افسرؔ۔

ہم گنہگاروں کی کشتی کے ہیں لنگر حیدر | فیض و بخشش کے سمندر کے ہیں گوہر حیدر
کس طرح جان و دل اپنے نہ فدا ان پر کروں | مشکلوں میں مرے کام آتے ہیں اکثر حیدر

مرشدؔ

سید شاہ ابو الحسنین گوشوارہ نویس کلکٹری الٰہ آباد تخلص الحسن الحسینی ساکن سادات کرو ضلع فتحپور ہسوہ حال وارد چک پور الٰہ آباد۔

خاصۂ حضرتِ حق بود و تولد شدہ است اندرونِ حرمِ خالقِ اکبر حیدر
بلبلِ باغِ مدینہ شدہ شیدائے رُخش بود در تازگیِ روئے گلِ تر حیدر

مجنوںؔ

رادھے شیام نام۔ مجنوں تخلص ۱۹۲۰ء میں الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ باپ کا نام کرشنا پرشاد صاحب ہے۔

نالہ و فریاد میں تاثیر تو پاتا ہوں میں دل ہوا میں اور دل کے ساتھ اڑا جاتا ہوں میں

محبؔ

شاہ محمد عثمان نام محبؔ تخلص۔ آپ شاہ محمد علاء الدین ابن شاہ قدرت اللہ ابن شاہ حجۃ اللہ قدس سرہ کے فرزند تھے۔ آپ کی پیدائش کی تاریخ ۷ مارچ ۱۸۷۷ء ہے۔ فارسی و عربی کی تعلیم حاصل کرکے ۱۸۹۰ء میں شاعری کا شوق ہوا تو افسرؔ الہ آبادی کو کلام دکھانے لگے۔ مذاقِ سخن صوفیانہ تھا۔ یکم نومبر ۱۹۲۷ء کو انتقال فرمایا۔ اور اپنے جد اعلیٰ حضرت شیخ محب اللہ قدس سرہ کے پائین مزار کدیٹ گنج میں دفن ہوئے آپ کے فرزند شاہ حبیب الرحمٰن اخترؔ نے مہربانی فرما کر چند اشعار منتخب کرکے مرحمت فرمائے ہیں جو ذیل میں درج ہیں۔

عیاں ہیں صاف سامانِ قیامت اُن کے تیور سے
الٰہی خیر ہو خنجر بکف نکلے ہیں وہ گھر سے
محبؔ کے حال پر سچ پوچھئے تو فضلِ رحمٰن ہے
کہ راہِ حق جو پوچھی بھی تو احمد ایسے رہبر سے

جان بھی دیں حضرتِ عیسیٰ کو کہا آپ کا بیمار اچھا ہو چکا

ہوس کیمیا سے خاک پائے پیر کیا کم ہے
جلائے قلب طالب کو یہی اکسیر کیا کم ہے
وسیلہ ہم سے بخشش کا اگر پوچھا تو کہہ دیں گے
ہمارے واسطے یہ الفت شبیر کیا کم ہے

مرتضیٰ

مرتضیٰ حسین خاں عرف پٹو میاں رئیس محلہ دریا باد، شہر الہ آباد۔

چرخ پر کھولیں اگر تیغ کے جوہر حیدر کاٹ ڈالیں سپر مہر منور حیدر
دل گرفتہ کبھی ہوئے نہ دیا آفت میں مشکلوں میں مری کام آئے برابر حیدر

مظہر

ظہور حسن خاں ساکن محلہ دریا باد، الہ آباد شاگرد جناب نثار حسین خاں صاحب شیدا رئیس دریا بادی۔

کرتے ہیں ذرہ کو خورشید منور حیدر مہربانی سے بدلتے ہیں مقدر حیدر
اے فلک چشمۂ حیواں سے نہ پھرتا ناکام کاش ہوتے خضر راہ سکندر حیدر

مداح

سید سلطان حسین ساکن مصطفےٰ آباد ضلع الہ آباد شاگرد شاہزادہ فرخ۔

انبیا کے نہ ہوں کس طرح برابر حیدر پہنچے کس شان سے تا پردۂ داور حیدر
آپ کے دست زبردست نے باندھی یہ ہوا لے لیا ہاتھوں پہ بالائے ہوا در حیدر

محسن

محسن زماں خاں نام محسن تخلص۔ آپ کے والد قاسم زماں خاں صاحب رؤسائے دریا آباد الہ آباد میں سے تھے۔ محسن صاحب کے نسد

سخن سے دلچسپی بچپن ہی سے تھی۔ عشق سخن بھی عرصہ سے جاری ہے۔ حضرت نیساںؔ مرحوم الہ آبادی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ خوش خلق و بار باش آدمی ہیں۔ غزلوں کے علاوہ قطعات و رباعیات بھی موزوں کرتے ہیں جو اپنے ترنم انداز میں غزلوں سے پیشتر حاضرین مشاعرہ کو سناتے ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

جگر و دل فگار ہیں دونوں — اک نظر کے شکار ہیں دونوں
اس طرف شمع ہے اُدھر میں ہوں — بزم میں اشکبار ہیں دونوں
کچھ نہیں ہستی گل و بلبل — ایک مشت غبار ہیں دونوں
جلوۂ حسن و آتش الفت — دشمن قلب زار ہیں دونوں
وعدۂ دوست شیخ کی باتیں — قابل اعتبار ہیں دونوں

دل کی اُلجھن ہیں ادھر تو ہم رہے — اُن کے گیسو اس طرف برہم رہے
دل جگر وقف نشاط و غم رہے — زندگی بھر کشمکش میں ہم رہے

شاعری کے ہر طرف چرچے ہوئے
جبکہ اے محسنؔ سخندان کم رہے

محسنؔ

مرزا محمد محسن نام محسنؔ تخلص۔ آپ کے آبا و اجداد شاہان مغلیہ کی فوج میں معزز عہدوں پر فائز تھے۔ تعلیم و پرورش الہ آباد میں ہوئی اردو فارسی کی اچھی خاصی قابلیت تھی میونسپل بورڈ الہ آباد میں بعہدۂ پیشکاری فائز تھے۔ بڑے خلیق۔ وضعدار اور منکسر مزاج انسان تھے۔ سنہ ۱۹۴۱ء میں تقریباً ساٹھ سال کی عمر پاکر فوت ہوئے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

اے آہ دیکھ صبر و تحمل گئے ہوئے — ٹوٹیں نہ ٹانکے زخم جگر کے سئے ہوئے
غم دیدہ کون ہے جو ترے ہاتھ سے نہیں — گل تنگ ہیں اپنا چاک گریباں کئے ہوئے
اس چشم مست ناز کی اللہ رے مستیاں — دور رند ہیں کہ جھوم رہے ہیں پئے ہوئے
گردش فلک کی آئے اگر پاؤں میں مرے — آغوش میں پھرا کروں دنیا لئے ہوئے

سمجھے نہ سمجھے کوئی مگر رہروِ عدم — جاتے ہیں فاش پردۂ دنیا لئے ہوئے
قاروں کے سر پہ بارِ زر و مال کا نہیں — پُشتارہ ہے گناہ کا سر پر لئے ہوئے

محشرؔ

فرزند علی نام محشرؔ تخلص۔ آپ انسپکٹر جنرل پولیس کے دفتر میں ملازم ہیں۔ شعر و شاعری سے دلچسپی بہت دنوں سے ہے۔ پہلے حامدؔ صاحب مرحوم سے اصلاحِ سخن لیتے تھے۔ موصوف کے انتقال کے بعد حضرت شفقؔ عماد پوری سے مشورہ کرنے لگے۔ غزلوں کا دیوان قریب قریب مکمل ہے۔ کلام میں سوز و گداز اور بیان میں روانی پائی جاتی ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

عشرتِ عالمِ فانی پہ کوئی شاد نہ ہو — اس پہ کیا ناز کہ جس کی کوئی بنیاد نہ ہو
دل کے مالک تو یہ احساس مٹا دے دل سے — عیش میں شاد نہ ہو رنج سے ناشاد نہ ہو
ابتدا سے یوں ہی قائم ہے نظامِ عالم — بزمِ ہستی جو نہ اُجڑے عدم آباد نہ ہو
عہد و پیمانِ وفا تم نے کئے تھے جو کبھی — میں تمھیں یاد دلاؤں جو تمھیں یاد نہ ہو
تم ہی انصاف کرو میں نے تمھیں پر چھوڑا — کس سے فریاد ہو پھر تم سے جو فریاد نہ ہو

بہار آئی چلے گلشن سے پابندِ ستم ہو کر
نویدِ صبحِ عیش آئی پیامِ شامِ غم ہو کر
وہ دل جس نے تری رسمِ پرستش کی بنیاد ڈالی
مرے پہلو میں آیا نازشِ دیر و حرم ہو کر
بہت نازاں ہیں محشرؔ آپ جس ہستی کی ہستی پر
وہ دو دن کے لئے آئی ہے ممنونِ عدم ہو کر

متینؔ

سید محمد متین رئیس کڑا ضلع الہ آباد حال مقیم محلہ چک شہر الہ آباد۔

زور و قوت میں نہ بے مثل ہوں کیونکر حیدر | ہاتھ خالق کے ہیں بازوئے پیمبر حیدر
سرخی چہرۂ کفار اُڑا دیتے ہیں | تیغ سے کاٹتے ہیں رنگ گلو تر حیدر

مضطر

سید روشن علی کراری ضلع الہ آباد۔

نقش انگشتر دل پر ہے مقرر حیدر | لب پہ ہر حال میں ہو کیوں نہ مکرر حیدر
جان و دل آٹھ پہر رہنا ہے قربان اپنا | کام آئے مری مشکل میں نہ کیونکر حیدر

مضطر

شیخ قدرت اللہ الہ آبادی شاگرد والاشان شاہزادہ مرزا قیصر بخت فروغ۔

ہے زباں پر مرے جو کلمۂ حیدر حیدر | ملتا ہے ذائقۂ قند مکرر حیدر
دم تحریر ہوا وصف شجاعت اعجاز | بن گیا میرا قلم تیغ دو پیکر حیدر

محفوظ

محمود علی نام محفوظ تخلص۔ عمر ۲۳ برس محلہ بہادر گنج میں رہتے ہیں۔

پی پی کے بہائیں فصل بہار کو | کچھ اور خوشگوار کئے جا رہا ہوں میں

یہ کب جانتا تھا خبر کیا تھی اس کی | مجھے اپنے دل سے بھلا دیجئے گا

متین

مولوی سید محمد متین بی۔ اے الہ آباد میں وکالت کرتے ہیں۔ قصبہ کڑا ضلع الہ آباد کے رہنے والے ہیں۔ عربی۔ فارسی۔ اُردو۔ انگریزی وغیرہ میں فارغ التحصیل ہیں۔ لاطینی و فرانسیسی زبانوں سے بھی واقف ہیں۔ فارسی عربی اور اردو میں شعر کہتے ہیں۔ قصیدہ۔ غزل۔ مثنوی۔ رباعی۔ مسدس۔

سلام۔ نوحہ۔ مرثیہ۔ نظمیں۔ غرض سب کچھ کہتے ہیں اور بہت خوب کہتے ہیں۔ فن شاعری سے بخوبی واقف ہیں۔ فکر بلند اور طبع رسا رکھتے ہیں۔ کلام پختہ ومضبوط ہے۔ استعارہ وتشبیہ کے ساتھ ساتھ زبان میں سادگی۔ بندش میں چستی اور طرز ادا میں دلآویزی ہے۔ حضرت نیساں الہ آبادی کے شاگرد ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

دل تک پہونچتی تیغ ادا ان کی دیر میں
پڑتی جو کوچۂ رگ گردن کے پھیر میں

وہ بد دماغ بوئے محبت سے ہوتے ہیں
گلہائے داغ بھیجے کس کو چنگیر میں

ان کی نظر سے داغ جگر اور جل اٹھے
بجلی سے آگ لگ گئی پھولوں کے ڈھیر میں

جلوے ہیں تیرے داغ محبت کے مختلف
شمعیں لگن میں ہیں نہ گل زر چنگیر میں

کس طرح پہونچے کعبہ ابروئے یار تک
دل پڑ گیا ہے کوچۂ گیسو کے پھیر میں

سامان عیش کس کے ہے آنے کا منتظر
ہر پھول چشم شوق بنا ہے چنگیر میں

کیا لطف دے مری غزل مختصر متینؔ
یہ چند شعر میں نے کہے تھوڑی دیر میں

محمودؔ

محمود علی خاں نام۔ آغا علی خاں عرفیت۔ محمودؔ تخلص۔ آپ الہ آباد کے معزز رئیس وزمیندار ہیں۔ پبلک مفاد کے کاموں میں بہت دلچسپی لیتے ہیں اور نہایت ہر دلعزیز ہیں۔ کئی مرتبہ میونسپل کمشنر منتخب ہوئے۔ برسوں آنریری مجسٹریٹ رہے۔ شعر وشاعری سے فطری تعلق ہے۔ مشق سخن بھی کافی ہے۔ غزلیں۔ قصیدے۔ اور نظمیں برابر کہتے رہتے ہیں جو بلند پایہ رسالوں میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

مستوں نے کیا ایسا اک نعرۂ رندانہ
پھرتا ہے نگاہوں میں میخانہ ہی میخانہ

میں اُن کا پجاری ہوں اور عشق ہے لا ندانہ
سجدوں سے مجھے مطلب کعبہ ہو کہ بتخانہ

سر اپنا پٹکتا تھا سنگ در جاناں پر
میں نے جو اُسے روکا ہنسنے لگا دیوانہ

دامن پہ لیا بڑھ کر خود شمع نے رو رو کر — گرنے لگا جب ہنس کر جلتا ہوا پروانہ
میں حد سے نہ بڑھ جاؤں مدہوش کہلاؤں — چونکا دے سرِ محفل اسے لغزشِ مستانہ
ہے رقص میں ہر ذرّہ دنیائے محبت کا — گونجا ہے فضا میں یوں اک نعرۂ مستانہ

مدّن

جناب سید محمد اسمٰعیل صاحب الہ آبادی۔ بڑے خوش مذاق و زندہ دل آدمی تھے نیمۂ شعبان کا مقاصدہ بڑے اہتمام سے کرتے تھے ۱۹۴۲ء میں انتقال کر گئے۔ اپنی باتوں کی طرح شعر بھی مزاحیہ کہا کرتے تھے۔

سمجھا میں دیکھتے ہی سفر میں ملا جواب — پہنچا کے خط پھرا جو کبوتر نُچا ہوا
تخئیل کی دماغ نے اور دل نے تخلیہ — ہر ایک ان میں شعر کا بیت الخلا ہوا
پیدا ہو جس سے مردہ دلوں میں بھی گرمی — وہ شعر پھر طلا نہ ہوا اور کیا ہوا

دیکھ کر تیور بُرے مجنوں کے لیلیٰ نے کہا — گھورتا ہے یہ نگوڑا ہم کو اماں دیکھئے

مسیح

سید مسیح الزماں جائسی، جائس کے رہنے والے ہیں اور مولوی سید مہدی الزماں صاحب کے لڑکے ہیں۔ ایم۔ اے (فائنل) میں پڑھتے ہیں خیاباں اور نیساں (الہ آباد یونیورسٹی کا سہ ماہی رسالہ) کی بزم ادارت کے رکن ہیں۔ ان کے مضامین ملک کے رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں شعر بھی کبھی کبھی کہہ لیتے ہیں ۱۹۲۵ء میں پیدا ہوئے تھے۔

بخششِ التفاتِ یار نہ پوچھ — کوئی اب مدعا رہا ہی نہیں

قطعہ

دیکھ کر اپنے ہمنشیں کو جب — کوئی رہ رہ کے مسکراتا ہے
پلک پہ یک میں لرزسا اٹھتا ہوں — اپنا انجام یاد آتا ہے

نزہتِ جلوۂ حسیں رخصت — میرے ماضی کو ہوش آتا ہے

کیوں ہنستے ہنستے رو بیٹھا کیوں ایسا روگ لگا بیٹھا
سمجھاتے ہیں نہ تھے تجھکو یہ کھیل نہیں ہے جانے دے

مضطر

راجیندر سنگھ نام مضطر تخلص، ڈی اے وی اسکول میں علم ریاضی کے اُستاد ہیں، شعر و شاعری سے خاص ذوق ہے۔ ہندی کے ممتاز ادیب ہیں۔ اُردو میں بھی شعر خوب کہتے ہیں۔ اردو تصانیف میں چند ترجمے ہیں۔ اصلی وطن نظام آباد ضلع اعظم گڈھ۔ تاریخ پیدائش ۱۵ راگست ۱۹۰۵ء۔ آپ کے والد کا نام ملکھنی سنگھ صاحب ہے۔ آپ یہاں بہ سلسلۂ ملازمت عرصے ہیں اور اب یہیں کے ہو گئے ہیں۔ نمونۂ کلام:-

مرکر بھی نہ بھولے ہم تجھ کو شبِ تنہائی — تو نے تو ہمیں اپنا دیوانہ بنا ڈالا

یوں تو لاکھوں حسرتیں ہیں اس دلِ ناشاد میں
ہاں مگر اک آرزو لپٹی ہے اُن کے نیر سے

وہ نہ آئے خیر مضطر موت تو آ ہی گئی — کچھ تو پوری ہو گئی حسرت دلِ بیمار کی

بسائی جا رہی ہیں بستیاں شہرِ خموشاں میں — وہ اُجڑی منزلوں کو اس طرح آباد کرتے ہیں

معطر

سید زاہد حسین ساکن منوری شاگرد والا شان شہزادہ مرزا قیصر بخت فروغ۔

جب ید اللہ ہوں اور قوتِ بازو بھی — دشمنِ دیں پہ نہ کس طور سے ہوں وہ حیدر
پرِ جبریل پہ رکھتے نہ اگر خیبر میں — ٹھکتی شمشیر سر گاوِ زمیں، یہ حیدر

مشتاق

شیخ رحیم بخش ساکن محلہ چک گھسیاری ٹولہ شاگرد مرزا محبوب علی صاحب قوس الہ آبادی۔

آپ کے حسن خدا داد کے آگے واللہ
ماہ ہے کرمکِ شب تاب سے بدتر حیدر

میں ازل سے ہوں مئے عشق سے سرشار لیے دل
خلد میں دیں گے مجھے ساغرِ کوثر حیدر

مظفر

سید مظفر علی نام مظفر تخلص والد کا نام سید مشرف علی۔ آپ کے بزرگ شاہجہاں پور کے رہنے والے تھے۔ لیکن مظفر صاحب کی پیدائش الہ آباد ہی میں ہوئی اور یہیں تربیت و تعلیم حاصل کی۔ کٹرہ میں قیام پذیر ہیں۔ پانچ چھ سال سے شعر و شاعری کی طرف رجحان طبع ہے۔ حضرت سرشار کسمنڈوی سے تلمذ ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

اُن کی مرضی میرا انجام ہوئی جاتی ہے
مطمئن گردشِ ایام ہوئی جاتی ہے

آرزو حسرتِ ناکام ہوئی جاتی ہے
زندگی موت کا پیغام ہوئی جاتی ہے

نظر آتا نہیں دل کی رگوں میں اب لہو مجھکو
بڑی مہنگی پڑی نشو و نماءِ آرزو مجھکو

گذرتا ہوں یوں روز اُن کی گلی سے
کہ جیسے تعلق نہیں کچھ کسی سے

جہاں بند کیں تھک کے آنکھیں کسی نے
بدل دی گئی زندگی زندگی سے

جہاں عزم مصمم سے مظفر نے قدم رکھا
ظفر یابی نے اُس کے پاؤں چومے آکے منزل سے

موج

برج بہادر لال خلف منشی ماتا غلام صاحب۔ قوم کایستھ آپ ۱۹۰۱ء میں الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ آپ کے باپ دادا موضع برونہ ضلع الہ آباد کے رہنے والے تھے۔ آپ بہ سلسلہ روزگار و ملازمت الہ آباد آئے اور یہیں رہ گئے۔

سید محبوب حسین تحمل الہ آبادی سے تلمذ ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

قائم رہی دنیا میں جوانی کس کی ۔ پیری نہ ہوئی دشمن جانی کس کی
ہر شخص کو جینے کی ہے خواہش لیے موج ایسی ہے مگر ہستی فانی کس کی

گھوم پھر کر چمن دہر کا نقشہ دیکھا ضیق فرصت تھی مگر پھر بھی نہ کیا کیا دیکھا
کہیں شادی نظر آئی کہیں ماتم لیے موج خوب ان آنکھوں سے دنیا کا تماشا دیکھا

ماجد

سید ماجد علی ایڈوکیٹ قصبہ نگرسن ضلع الہ آباد کے رہنے والے تھے۔ الہ آباد یونیورسٹی کے ممتاز گریجویٹ تھے۔ اسی شہر میں وکالت کرتے رہے۔ پھر گورنمنٹ پلیڈر ہو گئے۔ خدمات کے صلے میں خانصاحب کا خطاب گورنمنٹ سے عطا ہوا۔ نہایت خلیق اور بار باش آدمی تھے۔ حلقہ احباب بہت وسیع تھا۔ اور خلوص کی وجہ سے ہر دل میں گھر تھا۔ شاعری کا شوق بچپن سے تھا مشق سخن برابر جاری رہی۔ میر علی عباد صاحب نیساں سے شرف تلمذ تھا۔ غزل۔ قصیدہ۔ رباعی۔ نظم۔ سلام۔ مرثیہ غرض سب کچھ کہتے تھے اور خوب کہتے تھے۔ صاحب دیوان ہیں۔ کلام میں سوز و گداز ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

کچھ تو ہے جس کی بدولت کہہ رہا ہوں حشر میں دیکھئے ہاں ہاں یہ میری فرد عصیاں دیکھئے
سرنگوں کیوں آپ ہیں باز آئے ہم فریاد سے ایک دنیا ہے سر محشر پشیماں دیکھئے
پیشوائی یوں کیا کرتے ہیں اہل عشق کی خود بخود ہلنے لگی زنجیر زنداں دیکھئے

موسیٰ

محمد موسیٰ خاں نام۔ موسیٰ تخلص۔ آپ کے والد کا نام شاد حسین خاں صاحب تھا۔ دریا آباد الہ آباد کے باشندے ہیں۔ گورنمنٹ پریس میں ملازم ہیں۔ زیادہ تر غزلیں کہتے ہیں نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

نئی نویلی ادائیں اُن کی شباب پر اُن کا وہ زمانہ
نہیں ہیں آنکھوں میں لال ڈورے کھُلا ہے گویا شراب خانہ
کسی کے ناز و ادا نے ایسا کیا ہے پہلو میں گھر ہمارا
کہ دل جو پہلے تھا اُجڑی منزل بنا ہے اب وہ نگار خانہ
شباب بھی ہے حسین بھی ہو غرور زیبا نہیں ہے اتنا
یہ چاندنی چار دن کی سمجھو نہیں رہے گا یہی زمانہ
یہ بیخودی کا ہوا ہے عالم نہیں ہے کچھ فرق دوست دشمن
جبیں جھکائی وہیں پہ میں نے جہاں ملا کوئی آستانہ

مہدی

سید مہدی الزماں جائس کے رہنے والے ہیں عرصہ سے الہ آباد میں وکالت کرتے ہیں۔ کہنہ مشق شاعر ہیں، ماہنامہ "خیابان" کے نگران و سرپرست ہیں علم معانی و بیان میں "شعر و شاعری" کے نام سے ایک قابل قدر کتاب لکھی ہے۔ اور بھی کئی رسالے آپ کی تصنیف سے ہیں۔

عرصۂ حشر میں اک شان تھی یکتائی کی تجھ سا غفار نہ تھا مجھ سا گنہگار نہ تھا

اس اشتیاق دید پہ غش کھا کے گر پڑے کیوں اے کلیم طور یہ کیا ماجرا ہوا

کم ظرفی منصور رہے دعویٰ انا الحق دے اتنی ہی جتنا کہ پیمانہ بنا ہے

غبارِ رہ فلک ٹھہرا ہے گرد کارواں جس کا ذرا اس رفعتِ منزل کو دیکھ ہاں دیکھنے والے

طور سینا ہی پہ کیوں برق گری تھی یارب کیا کہیں اور کوئی طالب دیدار نہ تھا

منصور گیا ہوش سے موسیٰ کو غش آیا وہ شکل کسی کو بھی دکھائی نہیں جاتی

تم ظلم جو کرتے ہو فطرت یہ وہ عصیاں ہے عصیاں نہیں کچھ داخل انسان کی فطرت میں

میکش

شبیر علی خاں نام میکش تخلص۔ آپ ریاض حسن خاں رئیس دریاآباد کے صاحبزادے ہیں۔ شعر و شاعری سے دلچسپی ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

دل میں کچھ التفاتِ نظر دیکھتا ہوں میں ۔۔۔ لے عشق ربط برق و شرر دیکھتا ہوں میں
تعمیر آشیاں ابھی پوری نہیں ہوئی ۔۔۔ صبا دکی کچھ اور نظر دیکھتا ہوں میں

میکش دم اخیر وہ بالیں پہ ہیں مری
یہ کس دعا کا اپنی اثر دیکھتا ہوں میں

ناظم

ناظم ہندی قصبہ کرالی ضلع الہ آباد کے باشندے ہیں۔ آبا و اجداد کا پیشہ سپہ گری تھا۔ آپ سیف زبان کے جوہر دکھاتے ہیں۔ صاحب دیوان ہیں۔ کئی مثنویاں تصنیف کی ہیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

یہ خوب کرتے ہیں زلفیں جو وا نہیں کرتے ۔۔۔ ہمارے دل کو اسیر بلا نہیں کرتے
جناب شیخ ہیں کیوں فکر سے میں سرگرداں ۔۔۔ خیال بنت عنب پارسا نہیں کرتے

نگاہ ناز سے بچتے نہ ہو ذرا ناظم
یہ تیر وہ ہیں جو ہرگز خطا نہیں کرتے

گالیاں دے چکے تو فرمایا ۔۔۔ اب نہ ہم کو خفا کرے کوئی

ناظم

سید ناظم حسین نام ناظم تخلص۔ آپ دریاآباد کے رہنے والے ہیں۔ والد کا نام احمد حسین تھا۔ شاعری تفریح طبع کے لئے کرتے ہیں اور مشاعروں میں بڑی دھوم دھام سے پڑھ کر سامعین کی ضیافت طبع کرتے ہیں۔

نثار

عبدالعزیز نام۔ نثار تخلص۔ پیدائش ۱۴ر ذی الحجہ ۱۳۴۲ھ۔ نمونۂ کلام:۔

جیسے آئے بہار گلشن میں　　یوں مرے دل میں آرہا ہے کوئی
کہہ سکا کچھ بھی نہ رعبِ حسن سے　　ہونٹ دونوں تھرتھرا کر رہ گئے

نثار

حافظ نثار احمد خلف الصدق حافظ عبداللہ صاحب مہتمم نامور پریس الہ آباد شاگرد شہزادہ قیصر بخت فروغ۔

آپ کی یاد میں ہے اشک مژہ پر حیدر　　یا چڑھا دار پہ منصور کا ہے سر حیدر
ہجر میں دفع ہو گیا صاف تنوں کی الجھن　　سلجھے کیا آئینہ کا گیسوئے جوہر حیدر

نادر

نادر حسین خاں خلف الصدق جناب صادق حسین صاحب رئیس الہ آباد۔

کیوں نہ ہوں منتظم عرصۂ محشر حیدر　　قاسمِ نار و جناں ساقیٔ کوثر حیدر

نشتر

بابو لالتا پرشاد۔ شاگرد مرزا محبوب علی صاحب نوشؔ۔

کافروں سے نہ رہے دہر میں دب کر حیدر　　جنگ میں رہتے تھے منصور و مظفر حیدر
سب کو لے جائیں گے وہ خلد بریں بے شک　　کیونکہ ہیں گلشنِ فردوس کے سرور حیدر

نوانجان

محمد نواب خاں شاگرد شاہ ولایت احمد صاحب گلزار۔

خیبری کہتے تھے حیرت سے کہ بل بے طاقت　　مثل دامن ہے اُٹھائے درِ خیبر حیدر
تکیہ جو آپ کے اوپر فقرا رکھتے ہیں　　بھیجدیتے ہیں انھیں زر تہ بستر حیدر

نشتر

محمد ظہور نام ولادت ۱۹۰۵ء۔ آپ کے آباواجداد قوم شیوخ سے قصبہ سلون ضلع رائے بریلی کے رہنے والے تھے۔ والدین کے انتقال کے بعد گردش زمانہ نے وطن سے دور رکھا۔ ۱۹۱۹ء سے شعر و شاعری کی طرف توجہ کی پہلے حضرت رضی بدایونی کو کلام دکھاتے تھے اب جناب شفق عماد پوری سے اصلاح سخن لیتے ہیں۔ کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

تفس میں چھیڑ نہ اے ابر نو بہار مجھے　　رُلا چکی ہے خزاں جب ہزار بار مجھے
بلا کی مست ہے کیف آفریں نگاہ تری　　سرور بھی ہے باندازۂ خمار مجھے
چمک کے برگ گل تر پہ قطرۂ شبنم　　دکھا رہے ہیں اک آئینۂ بہار مجھے
زبان بند کھلی آنکھیں لب پہ مُہر سکوت　　بنا گئے ہیں وہ تصویر انتظار مجھے
نگاہ لطف مرے حال پر نہیں نہ سہی　　وہ جانتے تو ہیں اپنا گنہگار مجھے

صدائیں سنتا ہوں نشتر میں ساز فطرت کی
سنا رہا ہے کوئی نغمۂ بہار مجھے

نظام

نظام الدین ساکن محلہ بہادر گنج ۱۶ مارچ ۱۹۱۵ء کو پیدا ہوئے۔

نمونۂ کلام:-

کیا اُن کی تیغ تا ستم نے بسمل　　دم نزع بھی مسکراتا رہوں گا

پڑے تھے حلق میں کانٹے بڑی تھی بکلی میری　　بجھا دی آب خنجر سے کسی نے تشنگی میری

نوح

محمد نوح۔ آپ کے والد بزرگوار مولوی عبد المجید صاحب مرحوم سب جج کے معزز عہدے پر ممتاز تھے۔ اور بڑے نیک نام حاکم تھے پنشن پانے کے

بعد موضع نارہ ضلع الہ آباد میں مستقل سکونت اختیار کی اور متعدد مواضعات میں حقوق زمینداری حاصل کئے ۔ اولاد ذکور میں صرف نوح صاحب تھے ۔ اپنے سایۂ عاطفت میں پرورش و پرداخت کی ۔ انتقال کے بعد نوح صاحب ساری ملکیت کے مالک وقابض ہوئے ۔ خود بھی جائداد بڑھائی ۔ اسوقت الہ آباد کے معزز زمینداروں میں سے ہیں اور ہر طبقہ میں سر آنکھوں پر بٹھائے جاتے ہیں ۔ شعروشاعری سے فطرتاً دلچسپی تھی حسن اتفاق سے فصیح الملک حضرت داغ دہلوی کا ایسا خوشگو استاد ملا ۔ بہت دنوں تک شرف حضوری حاصل رہا ۔ مشق سخن بڑھتی رہی ۔ فکر طبع پر جلا ہوتی رہی زبان پر قدرت حاصل ہوگئی ۔ قریب قریب ہر صنف سخن میں طبع آزمائی فرماتے ہیں ۔ غزلیں ۔ قصیدے ۔ رباعی ۔ قطعات ۔ سلام سب کچھ موزوں فرماتے ہیں ۔ غزلیات کے دو دیوان موسوم بہ سفینۂ نوح، اور 'طوفان نوح' زیور طبع سے آراستہ ہوکر شائقین اردو کی نظروں کے سامنے ہیں ۔ ان کے علاوہ بہت سا کلام غیر مطبوعہ ہے ۔ شاگردوں کی تعداد بہت کافی ہے اُن میں سے بعض بعض صاحب دیوان ہیں اور کافی مشہور ہیں ۔ نوح صاحب کے کلام میں بہت کچھ اُستاد کا رنگ جھلکتا ہے ۔ فصاحت اور لطف زبان کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے ۔

کیا اُن پر اثر میری فغاں کا نہیں ہوتا — ہوتا ہے تو یوں ہوتا ہے گویا نہیں ہوتا
یہ بات نئی عشق میں ہم کو نظر آئی — سب ہوتے ہیں جس کے وہ کسی کا نہیں ہوتا

میں پا کے مخاطب اُنھیں خاموش ہوں کیا — سب کچھ مجھے کہنا ہے کہوں کیا نہ کہوں کیا

بعدِ فنا مزار سر رہ گذر بنا — جب ہم بگڑ گئے تو ہمارا یہ گھر بنا

ادا آئی جفا آئی غرور آیا حجاب آیا — ہزاروں آفتیں لیکر حسینوں کا شباب آیا
شب غم کس طرح گذری شب غم سطرح گذری — نہ تم آئے نہ چین آیا نہ موت آئی نہ خواب آیا

واعظ بھی مست بادہ و پیمانہ ہو گیا — ظاہر کمال ساقی میخانہ ہو گیا

رنج بھی دیکھا خوشی بھی دیکھ لی — سیر دنیا سے مزاجی بھر گیا
اضطراب شوق کا ممنون ہوں — میرے دل پہ ہاتھ کوئی دھر گیا

بدل کر بھیس ارمان دل مضطر نکلتے ہیں — ادا ہو کر سماتے ہیں دعا بن کر نکلتے ہیں

وہ بھی برہم مرے احباب بھی مجھ سے بدظن — سرگذشت دل ناشاد سناؤں کس کو

مرے دل میں ہوتا رہا درد عشق — اسی سے طبیعت بہلتی رہی

تجویز کی تھی آپ نے جس پر سزائے موت — تقصیر مرتے وقت بھی مجھ سے وہی ہوئی

مقتول تیغ ظلم و جفا کون ہے حسین — مقبول بارگاہ خدا کون ہے حسین
اے اہل شام کس پہ یہ برسا رہے ہو تیر — بحر کرم سحاب عطا کون ہے حسین
لٹ جائے گھر کہ سر ہو جدا کچھ بھی غم نہ ہو — ایسا مطیع حکم خدا کون ہے حسین
ذرے بھی فیض حسن سے خورشید بن گئے
اس وقت رن میں جلوہ نما کون ہے حسین

وارث

میر وارث علی رئیس ساکن قصبہ کراری ضلع الہ آباد۔

ان کے باعث سے بڑھی اور حرم کی حرمت — متولد جو ہوئے کعبے کے اندر حیدر
فقر ایسا کہ نہ کچھ کھائیں بجز نان جویں — زور ایسا کہ اکھاڑیں در خیبر حیدر

وقار

حافظ ظہور احمد سوداگر الہ آباد متوطن قصبہ آنولہ ضلع بریلی شاگرد والاجاہ شہزادہ مرزا قیصر بخت فرخ ڈپٹی انسپکٹر مدارس۔

ہمہ تن چشم تمنا سے زیارت میں ہوں غیرتِ نار نظر ہے تنِ لاغر حیدر
کچھ نہ پوچھو شبِ فرقت کی مصیبت ہم سے صبح تک آنکھ جھپکتی نہیں اکثر حیدر

واحد

منشی عبدالوحید الہ آبادی شاگرد جناب شاہزادہ قیصر بخت فروغ ۔
صورتِ ابر روانی ہے مجھے سوئے نجف پاؤں کی طرح سے پھرتا ہے مرا سر حیدر
آپ کے دردِ جدائی میں ہے بجلی کی چمک بند ہوجاتی ہے چشمِ دلِ مضطر حیدر

وفا

شیخ ریاض الدین احمد باشندہ پھولپور ضلع الہ آباد شاگرد والا شان مرزا قیصر بخت فروغ ۔
آپ کا حسن مبارک ہے مرا نورِ نظر مردمک بن کے رہیں آنکھوں کے اندر حیدر
نام نامی ہے ترے نادِ علی کی صورت کیوں نہ میں نقش کروں تختیِ دل پر حیدر

وفا

محمد عبداللہ خاں نام وفا تخلص ۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو ۔
بعدِ محبوبِ خدا دامنِ رحمت تیرا پرتو افگن رہا دنیا میں برابر حیدر
حشر میں شور کریں گے یہ محبانِ علی وقتِ امداد ہے احمد کے برادر حیدر

واحد

واحد حسین خاں سنہ ۱۸۶۰ء میں پیدا ہوئے اور سنہ ۱۹۳۶ء میں انتقال فرمایا ۔ آپ کے والد اشرف علی خاں صاحب الہ آباد کے معزز رئیس اور بڑے زمیندار ہونے کے علاوہ شاعر بھی تھے ۔ واحد حسین خاں صاحب کو عربی و فارسی کی اچھی خاصی لیاقت تھی ۔ باوجود خاندانی وجاہت اور ذاتی قابلیت کے نہایت درجہ خلیق ۔ وضعدار اور منکسر مزاج واقع ہوئے ۔

فن شاعری میں نواب صادق حسین خاں صاحب شاگرد حضرت رشک سے تلمذ تھا۔ آخر عمر میں سوائے سلام وقصیدے کے کچھ اور نہ کہتے تھے۔ ہر مشاعرے کی طرح میں وہ خواہ کیسی ہی مشکل ہو سلام کہتے اور خاص طور سے میرے ماہانہ مشاعرے میں شرکت فرماتے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

رباعی

مطلب نہیں کچھ مجھکو ہمہ دانی سے ہے کام فقط شہ کی ثنا خوانی سے
کیوں خوف جہنم سے نہ روؤں واحد گل ہوتی ہے یہ آگ اسی پانی سے

تصور دل میں رہتا ہے علی کے روئے تاباں کا مرا سینہ ہے مطلع آفتاب نور یزداں کا

جام دلا نے بیخود و سرشار کر دیا خلد بریں کا ہم کو سزاوار کر دیا
عقل سلیم دے کے خدائے کریم نے بندوں کو اپنے فعل کا مختار کر دیا
یہ کون آیا چہرہ سے اُلٹے ہوئے نقاب مُردوں کو جس نے قبر سے بیدار کر دیا
نکلے غم حسین میں جو قطرہائے اشک خالق نے اُن کو گوہر شہوار کر دیا

وزیر

وزیر علی خاں۔ آپ کے والد کا نام شاہ میر خاں صاحب ہے۔ دریاباد میں رہتے ہیں۔ وزیر صاحب سررشتہ تعلیم میں بطور کلارک ملازم ہیں شعر و شاعری سے کافی دلچسپی ہے۔ خانصاحب محمود علی خاں صاحب محمود سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

رنج و محن اُٹھائے جا چوٹ پہ چوٹ کھائے جا
درد اُٹھے تو اُف نہ کر دل کی کسک دبائے جا
لطف حیات اے حبیب مجھکو اسی میں ہے نصیب
عشق ستم سے روز و شب دل کو مرے دُکھائے جا

جس میں گداز ہو نہ سوز، ساز وہ ساز ہی نہیں
قلب و جگر میں آہ سے آگ سی اک لگائے جا
روٹھیں اگر وہ ایکبار قدموں پہ گر ہزار بار
ہے یہی راز حسن و عشق جیسے بنے منائے جا

وفا

مہادیو پرشاد نگم ۱۹۱۶ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام منشی بدھو لال صاحب ہے۔ محکمہ صفائی میں انسپکٹر ہیں۔ چند دنوں سے شعر و شاعری کا شوق پیدا ہوا ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

یہ جوشش تمنا یہ حیرت کا غلبہ — نہ تو ہے نہ میں ہوں نہ میں ہوں نہ تو ہے
تجسس میں تیری ہوا ہوں میں ایسا — کہ اب جستجو کو مری جستجو ہے

بے نقاب اس شمع رو پر روئے تاباں کر دیا
آج ہم نے گل چراغ شام ہجراں کر دیا

ہادی

سید محمد ہادی مچھلی شہری۔ الہ آباد میں وکالت کرتے ہیں۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ کلام میں پختگی، مضمون آفرینی، روانی اور مضبوطی پائی جاتی ہے۔

میری ہی دل کی تباہی پر ہوا افسانہ تمام — عشق کو ہنگامہ آرائے جہاں سمجھا تھا میں

تجھے کیا سکون نصیب ہو تجھے صبح دیکھ کے آئے گیا
کہ مرے ہی خون شدہ دل کا رنگ چمن بھی آئینہ دار ہے

جنون شوق کا یہ رنگ ہے گلستاں میں — بہار کھیل رہی ہے مرے گریباں میں
میں قید ہو کے بھی آزاد ہی رہا ہادی — خیال یار کی تھیں وسعتیں جو زنداں میں

قطرہ ہے مرے خون کا ہر نوکِ خار پر   اللہ آج وحشت بھی ہے کس بہار پر

ہنر

سید ظہور حسن ساکن منوری ضلع الہ آباد۔ شاگرد جناب شہزادہ والا جاہ مرزا قیصر بخت صاحب فروغ۔

شبِ معراج درِ خلد پہ دیکھ آئے نبی   کہیں لکھا تھا علی اور کہیں حیدر حیدر
صاف کرتے ہیں صفیں چیرتے ہیں اژدر کو   نام اسی وجہ سے ہیں آپ کے صفدر حیدر

یقین

مرزا تصدق حسین الہ آباد شاگرد جناب سید فضل حسین صاحب شمیم۔

گنج اسرار الہی کے ہیں گوہر حیدر   ہیں یم علم لدنی کے شناور حیدر
ہے زیارت کا طلبگار یقینِ خستہ   کیجئے اس پر کرم بہر پیمبر حیدر

نوٹ

افسوس ہے کہ باوجود کوشش بلیغ کے تمام شعرا کا کلام حاصل نہ ہو سکا۔ بعض حضرات تک میری رسائی نہ ہوئی اور بعض حضرات نے باوجود طلب و تقاضا میری درخواست پر نمونہ کلام عطا نہیں فرمایا۔

شامن

مخلوط زبان

جنابِ صدر و حضرات!

اُردو پر ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ یہ مخلوط زبان ہے۔ یہاں کی خالص زبان نہیں۔ دوغلی ہے۔ اس سے تو کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ یہ ٹھیٹ ہندوستانی زبان ہے اور سوا ہندوستان کے کسی دوسرے ملک میں نہیں بولی جاتی۔ اب رہی یہ بات کہ یہ مخلوط ہے، تو مخلوط ہونا کوئی عیب نہیں، بلکہ ایک اعتبار سے خوبی ہے۔

یوں تو دنیا میں کوئی زبان خالص نہیں۔ ہر زبان نے کسی نہ کسی زمانے میں دوسری زبانوں سے کچھ نہ کچھ لفظ لئے ہیں، یہاں تک کہ جو زبانیں مقدس کہلاتی ہیں وہ بھی اچھوتی نہیں۔ لیکن جسے ہم مخلوط زبان کہتے ہیں۔ اس کی خاص حیثیت ہوتی ہے۔ مخلوط زبان سے مراد وہ زبان ہے جو دو زبانوں کے آپس میں گھل مل جانے سے ایک نئی صورت اختیار کرلے۔ اور اس کا اطلاق اُن دو زبانوں میں سے کسی پر بھی نہ ہو سکے جس سے مل کر وہ بنی ہے۔ اس کی مثال بعینہٖ ایسی ہے جیسے دو اجزا کیمیائی طور سے اس طرح ترکیب دی جائیں کہ وہ اپنی ہیئت، تاثیر اور خاصیت میں ایک نئی چیز بن جائیں۔ اب اس کا اطلاق اُن دو اجزا میں سے کسی پر بھی نہ ہو سکے گا۔ یہی حال اردو کا ہے جو فارسی اور ہندی کے سنجوگ سے بنی لیکن اب ہم اسے نہ تو ہندی کہہ سکتے ہیں اور نہ فارسی۔ اردو ہی کہیں گے۔

اس قسم کی مخلوط یعنی کھچڑی زبانوں کے وجود میں آنے کے کئی سبب بیان کئے گئے ہیں۔ منجملہ اُن کے ایک ملک گیری تو یہ ہوئی کہ حملہ آور آیا اور لوٹ کھسوٹ کے چل دیا۔ دوسری قسم ملک گیری کی یہ ہے کہ فاتح نے کسی ملک کو فتح کر کے اس کا الحاق اپنے ملک سے کرلیا یعنے آ کے

اپنی سلطنت کا صوبہ بنا لیا۔ پہلی صورت میں ظاہر ہے کہ فاتح قوم کا کوئی اثر مفتوح قوم پر نہیں ہوتا اور اگر ہوتا بھی ہے تو نہایت خفیف اور عارضی جو قابل اعتبار نہیں۔ دوسری صورت میں یا تو یہ ہوتا ہے کہ فاتح جبراً اپنی زبان اُس دیس میں جاری کر دیتا ہے یا اُسے اپنے حال پر چھوڑ دیتا ہے دونوں صورتوں میں زبان کے مخلوط ہونے کا امکان نہیں ہوتا۔

لیکن ملک گیری کی ایک تیسری قسم بھی ہے وہ یہ کہ فاتح مفتوح ملک میں آکر بس جاتا اور اس ملک کی قوم سے مل جل کر زندگی بسر کرنے لگتا ہے۔ اس کا اثر دیرپا اور مستقل ہوتا ہے۔ اور اس صورت میں دو قوموں کے ملنے سے اُن دونوں کی زبانوں میں بھی ٹکر ہوتی ہے۔ اگر فاتح میں رواداری ہے اور مفتوح سے برابر کا برتاؤ کرتا ہے تو دونوں کے ملنے سے ایک نئی تہذیب اور نئی زبان پیدا ہو جاتی ہے۔ اُسے ہم نہ فاتح کی تہذیب اور زبان کہہ سکتے ہیں اور نہ مفتوح کی۔ بلکہ ان میں دونوں کی تہذیبیں اور زبانیں برابر کی شریک ہوتی ہیں اور دونوں قومیں اس کی بانی اور اس کی وارث ہوتی ہیں۔ اگر یہ نہیں تو پھر کسی مخلوط زبان یا تہذیب کے پیدا ہونے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ مثلاً انگریز اس ملک میں ڈیڑھ دو سو برس سے حکمراں ہیں اور انگریزی کا رواج بھی ملک بھر میں غیر معمولی طور پر پایا جاتا ہے۔ دفتروں، عدالتوں، اسکولوں، کالجوں، اسمبلیوں، کونسلوں اور تجارت خانوں میں اسی کا راج ہے۔ یہانتک کہ ذریعۂ تعلیم بھی انگریزی ہے اور باوجودیکہ وہ گھر گھر پہنچ گئی ہے اس پر بھی وہ یہاں اپنا گھر نہ کر سکی اس کا اثر ہماری زبانوں پر ضرور ہوا اور بہت کچھ ہوا لیکن اس نے ہماری کسی زبان سے میل نہ کھایا، اس لئے کہ حکومت کے غرور اور تفوق فاتحانہ نے انگریزوں کو ہندوستانیوں سے الگ الگ رکھا اور وہ یگانگت اور معاشرتی بے تکلفی جو ہم مذاقی اور ہم آہنگی سے پیدا ہوتی ہے نہ ہونے پائی۔ اور تیل پانی کا ملاپ نہ ہو سکا۔ مولانا حالی کا قول صحیح نکلا:-

سانپ سے جس طرح رہتا ہے سپیرا دور دور
حکمراں تیرے یونہیں تجھ سے رہیں بر کراں

لیکن مسلمانوں کی حالت جدا تھی۔ انھوں نے ہندوستان فتح کیا اور کچھ عرصے کے بعد یہیں بس گئے اور یہیں کے ہو گئے اور جب دلی میں انکی حکومت کو استقلال ہوا اور ان میں اور اہل ملک میں ربط ضبط بڑھا تو اسکے ساتھ ساتھ فارسی اور مقامی زبان میں بھی ربط ضبط بڑھتا گیا۔ اور جیسا کہ دستور ہے کاروباری اور ملکی اور معاشرتی ضرورت سے مسلمان بول چال میں ہندی لفظ استعمال کرنے کی کوشش کرتے اور ہندو فارسی لفظوں کی۔ ہوتے ہوتے بغیر کسی ارادے اور خیال کے خود بخود ایک نئی زبان کا ڈھول پڑنا شروع ہو گیا۔ اس وقت کون کہہ سکتا تھا اور کسے معلوم تھا کہ آئندہ یہ دوغلی بولی جسے اہل علم اور اہل فکر حقیر سمجھتے تھے ایک دن مسند ادب و انشا پر جلوہ گر ہوگی۔

مخلوط زبان میں ہوتا یہ ہے کہ "غیر زبان جو کسی قوم کو سیکھنی پڑتی ہے مخلوط نہیں ہوتی بلکہ اس کی اپنی زبان غیر زبان کے میل سے مخلوط ہو جاتی ہے۔ بعینہ یہی حال مسلمانوں کے آنے کے بعد ہوا۔ فارسی مخلوط نہیں ہوئی بلکہ مقامی زبان فارسی مخلوط ہو کر ایک نئی زبان بن گئی۔ اور ہندی میں فارسی مخلوط کرنے والے ہندو تھے۔

بات یہ ہے کہ جب کبھی ہم غیر زبان کے سیکھنے یا بولنے کی کوشش کرتے ہیں تو اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ ہماری اپنی زبان کا کوئی لفظ نہ آنے پائے۔ ہماری کوشش ہمیشہ یہ ہوتی ہے کہ جہانتک ممکن ہو صحیح اور فصیح زبان بولیں اور اس بات کی سخت احتیاط کرتے ہیں کہ ہماری گفتگو یا تحریر میں ہماری زبان کے الفاظ یا طرز ادا کا شائبہ نہ پایا جائے۔ غیر زبان کے بولتے یا لکھنے میں ہم جس بات سے اس قدر پرہیز کرتے ہیں اس کا ہم اپنی زبان میں مطلق خیال نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ جب کوئی

ہندوستانی، انگریزی بولتا یا لکھتا ہے تو تا امکان اپنی گفتگو یا تحریر میں اپنی زبان کا لفظ یا اسلوب بیان نہیں آنے دیتا اور جہاں تک ہو سکتا ہے اہل زبان کی تقلید کرتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ انگریزی لب ولہجہ کی نقل اُتارنے کی بھی کوشش کرتا ہے (شروع شروع میں تو بعض ہندوستانی جنھیں انگریزی بہت چڑگئی تھی اپنی زبان بھی انگریزی لہجے میں بولنے لگے تھے)۔ برخلاف اس کے اپنی زبان میں بیسیوں انگریزی لفظ بلا تکلّف استعمال کر جاتا ہے۔ یا تو اس سے اپنی مشیخت یا علمی فضیلت جتانی مقصود ہوتی ہے یا پھر ناواقفیت یا کاہلی کی وجہ سے ایسا کرتا ہے۔ ناواقفیت اس لئے کہ اپنی زبان سے پوری طرح واقف نہیں اور کاہلی اس معنے میں کہ اُسے اتنی توفیق نہیں ہوتی کہ اپنی زبان میں اُنکے مترادف تلاش کرے۔ اس میں وہ کسی قدر مجبور بھی ہے۔ فاتح قوم کی زبان کے متواتر مطالعہ، لکھنے بولنے اور سننے سے معمولی اور عام ضروریات کے لفظ بھی اس کی زبان پر اس طرح چڑھ جاتے ہیں کہ بلا ارادہ بھی اپنی زبان میں بول جاتا ہے۔ چنانچہ تیس چالیس برس پہلے سویلزیشن، ریفارم، پولیٹکل، سیلف رسپکٹ وغیرہ الفاظ ہماری زبان میں عام ہو گئے تھے۔

یہ عام اصول ہندوستان کے اسلامی عہد میں بھی حرف بحرف عمل میں آیا۔ ملکی تسلط کے وقت فاتح قوم کی زبان فارسی تھی۔ امرا، بادشاہ، دربار اور دفتر میں رسائی کے لئے بڑا ذریعہ یہی زبان تھی۔ اور جیسا کہ ہونا چاہئے اور ہوتا آیا ہے۔ فارسی سیکھنی شروع کی اور ایسی سیکھی کہ اُستاد ہو گئے۔ فارسی کا جاننا حصول علم ومعاش ہی کی خاطر نہ تھا بلکہ فارسی تہذیب وشائستگی کی علامت سمجھی جاتی تھی اور جیسا کہ دستور ہے فیشن میں داخل ہو گئی تھی۔ متواتر مطالعہ انشا وشعر وسخن کی مشق، سرکاری اور دفتری نوشت وخواند کی وجہ سے اہل ملک کی طبائع میں ایسی رچ گئی تھی کہ انھوں نے فارسی لفظ ملکی زبان میں بلا تامل داخل کرنے شروع کر دئے۔

یہ بھی ایک مسلم اصول ہے کہ غیر زبان کے لفظ جو کسی زبان میں داخل ہو جاتے ہیں یا کسی زبان کو مخلوط کرتے ہیں تو وہ اصلی زبان کی صرف ونحو کو ہاتھ نہیں

لگاتے۔ یہی صورت اس مخلوط زبان اُردو میں پیش آئی کہ فارسی کا اثر اسماء و صفات تک رہا البتہ بعض حروف عطف مثلاً اگر، مگر اگرچہ لیکن وغیرہ آگئے۔ اصل صرف و نحو بالکل دیسی زبان کی رہی اور جب ضرورت پڑی، فارسی عربی لفظ کو ہندی قالب میں ڈھال کر اپنا بنا لیا۔ مثلاً عربی الفاظ بدل، کفن، دفن، قبول، بحث سے بدلنا، کفنانا، دفنانا، قبولنا، بحثنا۔ مصدر بنا لئے۔ اسی طرح فارسی کے بخشنا، فرمانا، نوازنا، داغنا وغیرہ بنا لئے گئے۔ یہ سب اُردو ہوگئے فارسی عربی نہیں رہے۔

زبان کے خالص ہونے کا خیال درحقیقت سیاسی ہے لسانی نہیں۔ اس کا باعث قومیت کا بیجا فخر اور سیاسی نفرت ہے۔ جرمنوں نے فرانسیسی لفظوں کے خلاف جہاد کیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک مدت تک اُن کے ملک میں فرانس کا ادبی اور سیاسی تسلّط رہا۔ یہ خیال اُن کے دل میں کھٹکتا تھا اور اس غصّے میں انھوں نے فرانسیسی لفظ نکالنے شروع کئے۔ اسی طرح اور اسی بنیاد پر زکس نے جرمنی لفظوں اور یونانیوں نے ترکی لفظوں کا اخراج شروع کیا۔ سیواجی کے زمانے میں مرہٹی سے فارسی لفظوں کے خارج کرنے کی تحریک ہوئی۔ آئرلینڈ میں محض انگریزوں کی مخالفت میں آئرش زبان کے زندہ کرنے کی جدوجہد جاری ہوئی۔ ترکوں نے عربی فارسی لفظوں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کیا۔ ایرانیوں نے بھی ایک زمانے میں عربی لفظوں کے نکال دینے کی کوشش کی تھی مگر ناکام رہی مگر اب ترکوں کی دیکھا دیکھی عربی لفظوں کے نکال دینے پر آمادہ ہوگئے ہیں۔ ان سب کی تہ میں سیاسی غم و غصّہ ہے۔ اگر بدگمانی نہ سمجھی جائے تو غالباً یہی خیال بعض جماعتوں میں ہماری زبان سے عربی فارسی الفاظ کے اخراج کا محرک ہے۔ لفظ جب ایک بار زبان میں آگیا اور رائج ہوگیا تو وہ ہمارا ہو جاتا ہے، غیر نہیں رہتا۔ اُسے غیر سمجھ کر نکال دینا سخت بیدردی ہے۔ وہ اب جائے تو کہاں جائے۔ کیونکہ اب اس کا رنگ روپ بدل گیا ہے، بعض وقت اس کا تلفظ اور

مفہوم بھی کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ اصلی وطن میں تو اس کا ٹھکانا نہیں رہا اور یہاں سے دلیس نکالا مل گیا۔ اس کی حالت یہودیوں کی سی ہو جاتی ہے یعنی تگھر اندرا۔ زبان میں یہ ہٹلری جائز نہیں۔ مثلاً 'منصوبہ' کا لفظ ہے ہے تو عربی نسل کا مگر ہماری زبان میں اس کے معنے ہی اور ہو گئے ہیں۔ ارادہ، تجویز وغیرہ۔ یہ اک ہیئت اور معنوں میں اردو لفظ ہے اور اسے نکالنے کا ہمیں کوئی حق نہیں۔ یہی حال اور بہت سے لفظوں کا ہے جو ہماری زبان میں آکر ہمارے ہو گئے ہیں۔

ان وطن پرستوں کا یہ خیال ہے کہ بدیسی لفظوں سے ہماری زبان ناپاک اور خراب ہو جائے گی۔ ہمارے قومی احساس کو ٹھیس لگے گی۔ اس سے ہماری زبان کی بے مائگی ظاہر ہو گی۔ نیز غیر زبانوں کے الفاظ سے زبان بوجھل اور بھدّی ہو جائے گی۔

لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ بدیسی لفظوں سے زبان خراب نہیں ہوتی بلکہ برخلاف اس کے اس میں وسعت اور قوت اور شان پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ بہت سے غیر ضروری الفاظ بھی باہر سے آکر داخل ہو جاتے ہیں غیر ضروری سے میری مراد اُن لفظوں سے ہے کہ جن کے ہم معنی لفظ پہلے سے زبان میں موجود ہیں۔ لیکن مترادف الفاظ سے کوئی نقصان نہیں بلکہ زبان میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اور زبان کی فطرت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ ایک مدت کے استعمال کے بعد مترادف الفاظ کے مفہوم میں خود بخود ایسے نازک فرق پیدا ہو جاتے ہیں جس سے زبان کی لطافت بڑھ جاتی ہے۔ اور وہ لفظ جو پہلے غیر ضروری سمجھے جاتے تھے ضروری ہو جاتے ہیں۔

یہ خیال بھی صحیح نہیں کہ بدیسی الفاظ سے زبان بوجھل اور بھدّی ہو جاتی ہے۔ وہ لفظ جو غیر زبان سے آکر داخل ہو جاتے ہیں وہ اِس نوعیت کے ہوتے ہیں کہ زبان میں پوری طرح کھپ جاتے ہیں اور اُن کی اجنبیت بالکل جاتی رہتی ہے اور اُن میں اور دیسی لفظوں میں کوئی فرق نہیں

رہتا۔ اس لئے وہ زبان پر بار نہیں ہوتے بلکہ اس میں آسانی اور وسعت پیدا کرتے ہیں۔

انسانی خیال کی کوئی تھاہ نہیں اور نہ اس کے تنوّع اور وسعت کی کوئی حد ہے۔ زبان کیسی ہی وسیع اور بھرپور ہو، خیال کی گہرائیوں اور باریکیوں اور نازک فرقوں کو صحت کے ساتھ ادا کرنے میں قاصر رہتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اُن کے ادا کرنے کے لئے طرح طرح کے جتن کئے جاتے ہیں مترادف الفاظ ایسے موقعوں پر بہت کام آتے ہیں۔ مترادف الفاظ سب ہم معنیٰ نہیں ہوتے، اُن کے مفہوم اور استعمال میں کچھ نہ کچھ ضرور فرق ہوتا ہے۔ اس لئے ادائے مطالب میں ان کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

خاص کر شاعری کے اغراض کے لئے مترادف الفاظ کا کثرت سے ہونا بہت کام آتا ہے۔ شاعر اُن کے ذریعہ سے لطیف سے لطیف خیال اور نازک سے نازک جذبات کو ادا کر سکتا ہے۔ پھر اُسے ردیف و قافیہ کے لئے بہت سہولت ہو جاتی ہے۔

ادیب اور شاعر کے لئے لفظ کا انتخاب بڑی اہمیت اور قدر و قیمت رکھتا ہے۔ ایک برمحل صحیح لفظ کا انتخاب کلام میں جان ڈال دیتا ہے۔ مخلوط زبان میں انتخاب کی بہت گنجائش ہوتی ہے۔ ذوقؔ کا شعر ہے

مزے جو موت کے عاشق بیاں کبھو کرتے
مسیح و خضر بھی مرنے کی آرزو کرتے

خاصا شعر ہے۔ مگر کوئی خاص بات نہیں۔ میر تقی میرؔ اسی مضمون کو یوں ادا کرتے ہیں۔

لذت سے نہیں خالی جانوں کا کھپا جانا
کب خضر و مسیحا نے مرنے کا مزا جانا

یہاں "کھپا جانا" کے لفظ نے کیا کام کیا ہے! کوئی دوسرا لفظ رکھ کر دیکھئے یہ بات نہیں آسکے گی۔ اسی شعر میں "لذت" اور "مزہ"، دو مترادف لفظ ہیں

اگر ایک ہی لفظ دونوں جگہ استعمال ہوتا تو شعر سست اور بے مزہ ہوجاتا۔

محبت ہے یا کوئی جی کا ہے روگ
سدا میں تو رہتا ہوں بیمار سا

ہماری زبان میں مرض، بیماری، روگ تینوں مترادف ہیں۔ لیکن ایک سچا شاعر یا ادیب خوب سمجھتا ہے کہ کون لفظ کہاں استعمال کرنا چاہیئے۔ اسی شعر میں "روگ" کی جگہ مرض یا بیماری یہ لطف نہ دے گا۔

غرض فارسی کے میل سے ہماری لغت میں بے بہا اضافہ ہوا ہے۔ الفاظ کے ساتھ ساتھ خیالات بھی آجاتے ہیں صرف لفظوں کا ذخیرہ کوئی چیز نہیں، بڑی چیز اُن کا استعمال ہے جو خیال کے صحیح طور پر ادا کرنے میں سے مترادفات کے نازک فرق خیالات میں صفائی اور صحت بیان پیدا کرنے میں بڑی مدد دیتے ہیں۔ اور یہ نہ بھی ہو تو ایک فائدہ یہ ہے کہ بار بار ایک لفظ کے اعادے سے جو بیان میں بھدا پن آجاتا ہے وہ رفع ہوجاتا اور کلام میں حُسن پیدا ہوجاتا ہے۔

اگر زبان کی قدر و منزلت اُن مقاصد کے پورا کرنے میں ہے جن کے لئے زبان بنی ہے تو ہمیں اس امر کو ماننا پڑے گا کہ غیر زبان کے الفاظ داخل ہونے سے ہماری زبان کو بے انتہا فائدہ پہنچا ہے۔ عوام کی زبان یعنی کھڑی بولی جس پر اردو کی بنیاد ہے اس قدر محدود تھی کہ اگر اس میں فارسی عنصر شریک نہ ہوتا تو وہ کبھی علم و ادب کے کوچے سے آشنا نہ ہوتی اور اس وقت جو اردو میں اظہار خیال کے نئے نئے ڈھنگ پیدا ہوگئے ہیں وہ ان سے محروم رہتی۔

اردو میں ہندی اور فارسی لفظ مل جُل کر شیر و شکر ہوگئے ہیں اور عام بول چال، محاوروں اور کہاوتوں میں بے تکلف آ گئے ہیں۔ مثلاً تم کس باغ کی مولی ہو۔ اِکے دُکے کی خیر۔ اشرفیاں لُٹیں اور کوئلوں پر مہر۔ ایک آنکھ میں شہد ایک آنکھ میں زہر۔ لاکھ کا گھر خاک ہوگیا۔ اللہ کا دیا سر پر۔ خدا کی لاٹھی میں آواز نہیں۔ بد اچھا بدنام بُرا۔ بدن پر نہیں لتّا پان کھائیں

البتہ - باہمن مشری بھاٹ خواص - اس راجہ ہوسے ناس وغیرہ وغیرہ سیکڑوں کہاوتیں ہیں - یہی حال محاوروں کا ہے - مثلاً

اللہ بیلی - آنکھوں میں خار لگنا - خدا لگتی کہنا - آنکھوں پہ پردہ پڑ جانا - لہو لگاکے شہیدوں میں ملنا - اللہ میاں کی گائے -

مخلوط زبان میں ایک آسانی مرکب الفاظ کے بنانے میں بھی ہوتی ہے دیکھئے ہندی فارسی کے میل سے کیسے اچھے اچھے مرکب لفظ بن گئے ہیں مثلاً دل لگی - نیک چلن - جگت اُستاد - بھتیج داماد - گھر داماد - سمجھ دار - گنڈے دار - اُگالدان - عجائب گھر - کفن چور - جیب گھڑی - امام باڑہ - مُنہ زور وغیرہ وغیرہ ہزاروں مرکبات ہیں -

مخلوط زبانوں کے بننے کے دوران میں ایک اور بات بھی عمل میں آتی ہے جو قابل غور ہے - یعنے اُن میں سے ہر زبان کو اس خیال سے کہ جانبین کو ایک دوسرے کی بات آسانی سے اور جلد سمجھ میں آجائے - اپنی بعض خصوصیات ترک کرنی پڑتی ہیں اور صرف ایسی صورتیں باقی رکھنی پڑتی ہیں جو یا تو مشترک ہوتی ہیں یا جن کا اختیار کرنا دونوں کے لئے سہل ہوتا ہے اور اس طرح دونوں میں ایک توازن سا پیدا ہو جاتا ہے جو فریقین کے لئے سہولت کا باعث ہوتا ہے - اردو کے بننے میں بھی یہی ہوا - فریقین یعنے ہندو مسلمان دونوں نے اپنی اپنی زبانوں میں کتر بیونت کی - اپنی مخصوص خصوصیات ترک کیں اور اس قربانی کے بعد جو نئی زبان بنی اُسے اختیار کیا جو اب بھی ہماری ملکی اور قومی زبان ہے اور ہندوستان کی مشترک اور عام زبان ہونے کا درجہ حاصل کر چکی ہے - ہم نے اِسے قربانی کرکے حاصل کیا ہے اور کسی کا یہ مُنہ نہیں ہو سکتا کہ اسے ہم سے چھڑا لے -

ایک حکیم کا قول ہے کہ "غیر اقوام کے لوگوں کو اپنی قوم میں اس طرح جذب کر لینا کہ اپنے اور غیر میں امتیاز نہ رہے بلا شبہ مشکل ہے لیکن غیر زبان کے الفاظ کو اپنی زبان میں اس طرح جذب کر لینا کہ معلوم تک نہ ہو کہ یہ غیر ہیں اُس سے بھی زیادہ مشکل کام

ہے۔" یہ استعداد اردو میں بدرجۂ کمال موجود ہے۔ اس میں سیکڑوں ہزاروں لفظ غیر زبانوں کے اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ بولنے اور پڑھنے والوں کو خبر تک نہیں ہوتی کہ دیسی ہیں یا بدیسی، اپنے ہیں یا پرائے۔

غرض ہماری زبان ایک خوشنما اور ہرا بھرا گلدستہ ہے جس میں رنگ برنگ کے خوبصورت پھول اور نازک پتیاں ہیں۔ کیا ہم اس وہم سے کہ اس میں گلاب بدیسی ہے اور کچھ پتیاں باہر کے پودوں کی ہیں انھیں نوچ کر پھینک دیں گے؟ اگر کوئی ایسا کرے تو سراسر نادانی ہے۔

مجھے سر تیج بہادر سپرو کے اس قول سے حرف بحرف اتفاق ہے کہ "یہی زبان جسے ہم اردو کہتے ہیں تنہا وسیلہ ہے جس سے ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کی تہذیب کو سمجھ سکتے ہیں۔ یہی وہ ذریعہ ہے جس سے ہندو مسلمانوں میں اتحاد پیدا کیا جا سکتا ہے۔ میرے خیال میں اس سے بڑھ کر کوئی غلطی نہیں ہو سکتی کہ اس زبان کو مٹانے اور اس رشتے کو توڑنے کی کوشش کی جائے۔"

ڈاکٹر عبدالحق صاحب

توسیع زبان کے متعلق چند مشورے

حضرات! میرے عزیز دوست سر تیج بہادر سپرو کا حکم ہے کہ آج کے جلسہ میں آپ کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کروں۔ سر تیج بہادر کی خدمت میں میری نیاز مندی کو حق قدامت حاصل ہو چکا ہے اور اس چالیس برس کی طویل مدت میں مجھے یاد نہیں کہ میں نے کبھی اُن کے کہنے کو ٹالا ہو۔ اب بڑھاپے میں اس بدعت کا گنہگار ہونا پسند نہیں کرتا اس لئے باوجود بیماری اور بے بضاعتی کے آپ صاحبوں کے سامنے اپنے چند خیالات کے اظہار کی جرات کرتا ہوں۔

پہلی بات جو مجھے عرض کرنی ہے وہ اُردو زبان کے توسیع کے متعلق ہے دنیا ترقی کر رہی ہے یا تنزل اس میں بہت کچھ بحث کی گنجائش ہے خصوصاً جب کہ ہم روزمرّہ ہٹلر اور مسولینی کے جبر وظلم کی داستانیں سنتے ہیں اور اُن کی خونریزی اور ستم شعاری کے قصّے اخباروں میں پڑھتے ہیں مگر اس میں شک نہیں کہ روز بروز انسان کے خیالات میں اور زبان میں جو ان حالات کے اظہار کا ذریعہ ہے وسعت ہوتی جاتی ہے نئے ملک دریافت ہوتے ہیں نئے آلے اور کلیں ایجاد ہوتی ہیں چاہے ان سے قتل اور غارت گری ہی کا کام لیا جاتا ہو۔ ادب سائنس اور فلسفہ میں نئے مسائل اور نئے اسلوب وجود میں آتے ہیں اور ان کے اظہار کے واسطے اہل زبان کو نئی بندشیں اور نئی ترکیبیں ایجاد کرنی پڑتی ہیں اگر آپ زیادہ نہیں پچھلے سو برس کی تاریخ پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اس زمانہ میں اردو کی وسعت کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد جن کی تضحیک کو بعض نئے زمانہ کے کم مایہ اور ناسمجھ اُردو دانوں نے اپنا

مذہب بنا رکھا ہے۔ اپنی بے نظیر کتاب "آبِ حیات" میں ایک مقام پر فرماتے ہیں:۔

"اسی زبان کو ریختہ بھی کہتے ہیں کیونکہ مختلف زبانوں نے اسے ریختہ کیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس میں عربی فارسی ترکی وغیرہ کئی زبانوں کے الفاظ شامل ہیں اور اب انگریزی داخل ہوتی جاتی ہے اور ایک وقت ہوگا کہ عربی فارسی کی طرح انگریزی زبان قابض ہو جائے گی۔ چنانچہ میں ایک خاندانی نواب زادے کی گفتگو لکھتا ہوں جس کی پرورش اور تعلیم گھریلو ہے یعنی نہ عربی نہ فارسی کی لفاظی نے اس پر رنگ چڑھایا ہے نہ انگریزی نے روغن پھیرا ہے فقط ہندوستانی بے تکلفانہ باتیں ہیں "بڑے آغا کی پنشن لینے کل کچہری گیا تھا ڈپٹی صاحب کے کمرے کے آگے کچھ قرقی کا مال نیلام ہو رہا تھا۔ کمریاں، کوٹ اور واسکٹیں نئی تھیں کنٹر اور گلاس بھی ولایتی تھے۔ کرسیاں مزین چقیں باریک خوش رنگ تھیں میں نے کہا چلو کوئی ڈھب کی چیز ہو تو لے لیں۔ منجھلے آغا بولے جانے بھی دو جس مال نے مالک سے وفا نہ کی ہم سے کیا وفا کرے گا۔ آتے ہوئے ریل کے اسٹیشن کے پاس دیکھتا ہوں کہ مرزا جان چلے آتے ہیں شکرم ٹھہرا کر بڑے تپاک سے چلے بڑھاپے نے بچارے کا رنگ روپ سب کھو دیا وہ شکل ہی نہیں وہ صورت ہی نہیں کیسے گورے چٹے چھبیلے جوان تھے۔ میں نے کہا ہم نے تو جانا تھا تم دکھن سے خوب چاق چوبند سرخ سفید ہو کر آؤ گے تم تو سوکھ کر قاق ہو گئے۔ غضب کیا اگلا جوبن بھی گنوا آئے ٹھنڈی سانس بھر کے بولے ہائے جوانی!" فارسی عربی کے الفاظ تو ظاہر ہیں مگر خیال کیجئے کہ قرق۔ چق۔ چاق۔ قاق۔ آغا ترکی ہیں۔ میز نامعلوم۔ نیلام پرتگالی ہے۔ کمرا اطالوی ہے۔ ڈپٹی۔ ریل اسٹیشن۔ کوٹ واسکٹ۔ کنٹر۔ گلاس انگریزی ہیں۔ چٹا، کھبا پنجابی ہے۔"

اُردو زبان کی شروع سے یہی کیفیت ہے اور اس میں نئے خیالات کے اظہار کے واسطے اور نئی ضرورتوں کے پورا کرنے کے لئے نئے الفاظ

اور نئی ترکیبوں کا داخل ہونا ناگزیر ہے مگر اس سلسلہ میں اتنا خیال رہے کہ انسان کی طرح زبان کی بھی سرشت ہوتی ہے مزاج ہوتا ہے جو الفاظ داخل کئے جائیں ان کے نسبت اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے۔ بعض الفاظ بجنسہ لے لئے جاتے ہیں بعض میں کچھ تصرف کرنا پڑتا ہے۔ غرض یہ کرنا ہے کہ جو نئے الفاظ یا نئے اسلوب بیان زبان میں داخل ہوں ان کے متعلق اس بات کو یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ کہاں تک ہماری زبان سے میل کھاتے ہیں اور کس طرح احسن طریقے سے ہماری زبان میں داخل ہو سکتے ہیں یہ نہیں کہ Dead Letter office کو مری چٹھی کا دفتر۔ Standing Congress Committee کو کھڑی کانگرس کمیٹی اور Loose morals کو ڈھیلا اخلاق کہہ کر زبان میں داخل کرنے کی کوشش کی جائے اس سے زبان کی توسیع نہیں ہوتی بلکہ زبان خراب ہوتی ہے۔

دوسری بات یہ عرض کرونگا کہ بقول مولانا آزاد زبان کا قانون، دھرم اور حکومت کے قانون سے بھی سخت ہے کیونکہ اسے گھڑی گھڑی اور پل پل کی ضرورتیں مدد دیتی ہیں جو کسی طرح بند نہیں ہوتیں جاننے والے جانتے ہیں کہ اردو کی اصل ہندی ہے دکن میں یہ زبان شروع ہوئی اور سیکڑوں برس وہاں رائج رہی اس زمانہ کی تصانیف پڑھئے تو ہندی کا غلبہ صاف نظر آتا ہے شمالی ہندوستان میں آکر فارسی کا زور بڑھا اور دلی اور پھر لکھنؤ نے اس کو ترقی دی یہاں تک کہ شیخ ناسخ نے فرمایا

مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا
طلوع صبح محشر چاک ہے میرے گریباں کا

نیام تیغ قضائے مبرم لقب ہے قاتل کی آستیں کا

پچاس برس ہوئے میں نے لکھنؤ کے ایک مشاعرہ میں ایک استاد جیدؔ کی غزل سنی تھی اس کا ایک مصرع ذہن میں ہے

گردوں قرابۂ عرق انفعال ہے

رفتہ رفتہ جب شیخ ناسخؔ اور مرزا رجب علی بیگ سرورؔ کا اثر کم ہوتا گیا تو اُردو کی حالت سدھرنے لگی یاد رکھئے کہ زبان مذہب کی قید سے آزاد ہے اور مذہب عشق کے سوا شاعر کو مذہب کے جھگڑوں سے واسطہ نہیں۔

پروانہ چراغ حرم و دیر نداند

شام اور مصر کے عیسائیوں کی زبان عربی ہے اور وہ اسی زبان میں تصنیف و تالیف کرتے ہیں۔ اُردو کے لئے ہندوستان کی زبانوں میں ہندی سب سے قریب ہے بلکہ یوں کہئے کہ اردو کی بنیاد ہندی پر ہے۔ بس ضرورت کے وقت جب نئے الفاظ اور نئی اصطلاحوں کی تلاش ہو تو سب سے پہلے ہندی سے مدد لینی چاہیئے۔ بعض قدیم شاعروں کے کلام میں مثلاً سوداؔ کے یہاں ہندی تلمیحیں اور ہندی کے لفظ کثرت سے ملتے ہیں جو آگے چل کر متروکات میں داخل ہوگئے۔ سودا کا ایک مصرع اور دو شعر سنئے:۔ ع مژگاں نے تیرے پیارے ارجن کا بان مارا

محبت سے کروں جھج بل کی میں تعریف کیا یارو
ستم پربت ہو تو اسکو اُٹھا لیتا ہے جوں رائی

دیکھ میداں میں تجھ کو روز نبرد　　منہ پہ راون کے پھول جاتے بسنت

شاید یہ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ سودا کے کلیات میں ایک پوری غزل ایسی ہے جس میں فارسی عربی کا کوئی لفظ نہیں ہے ایک شعر اس کا آپ کے تفنن طبع کے لئے حاضر ہے:۔

جنھوں کی چھاتی سے پار برچھی ہوئی ہے رن بن وہ سورما ہیں

بڑا وہ ساونت من میں جس کے برہ کا کانٹا کھٹک رہا ہے

اس کے بعد نواب سعادت علی خاں کے زمانہ میں لکھنؤ میں انشا اللہ خاں نے ایک کہانی نثر میں لکھی جس میں یہ التزام کیا کہ عربی فارسی کا کوئی لفظ نہ آئے اس کا ایک ٹکڑا آزاد نے "آب حیات" میں نقل کیا ہے اور اب پوری داستان نہ صرف رسالہ "اردو" میں چھپ گئی ہے بلکہ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو "انجمن ترقی اردو" نے اس کو کتاب کی شکل میں چھپوا دیا ہے۔ "انشا" یوں شروع کرتے ہیں

"ایک دن بیٹھے بیٹھے یہ بات اپنے دھیان چڑھی کوئی کہانی ایسی کہئے جس میں ہندی چھٹ اور کسی بولی کی پٹ نہ ملے باہر کی بولی اور گنواری کچھ اس کے بیچ میں نہ ہو تب میرا جی پھول کر کلی کی روپ کھلے"۔

زمانہ حال میں ناسخ کے خاندان کے شاعر سید انور حسین صاحب آرزو نے اس سنت کو رواج دیا ہے اس کا قصہ سید علی عباس حسینی صاحب یوں بیان کرتے ہیں کہ "آرزو صاحب کے ایک شاگرد نے ان کو لکھا کہ میر تقی میر کا یہ شعر

تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو رونا ہے یہ کچھ ہنسی نہیں ہے

جس زبان میں کہا گیا ہے اسی میں آپ پوری غزل لکھئے۔ آرزو صاحب نے پوری غزل لکھ ڈالی۔ جس جس نے سنا وہ پھڑک اٹھا پروفیسر مسعود حسن صاحب رضوی نے بھی سنا انھوں نے آرزو صاحب سے فرمائش کی کہ اس زبان میں سو غزلیں کہئے اردو کے مشہور پرچے "ادب" نے...... ان غزلوں کو ملک بھر میں پھیلانا شروع کر دیا اور میرے سے مہر پھر سے دوستوں نے آرزو صاحب کا سر کھا لیا کہ سب کچھ کہنا چھوڑ دیجئے بس یہی کہئے ان سب باتوں کا پھل یہ ہوا کہ آرزو صاحب نے لگ بھگ سو اسو غزلیں

اور دو ذہین کہانیاں اسی زبان میں لکھ ڈالیں۔" آرزو صاحب اس زبان کو "خالص اُردو" کہتے ہیں اور جو کچھ انھوں نے اس زبان میں لکھا ہے وہ کتاب کی شکل میں "سُریلی بانسری" کے نام سے انڈین بک ڈپو لکھنؤ سے شائع ہو گیا ہے۔ غزلوں کے چند اشعار سنئے:-

جو سامنے اب تک آئے نہیں کیوں دھیان میں آئے جاتے ہیں
آنکھوں سے ابھی تک اوجھل ہیں اور جی میں سمائے جاتے ہیں

ہو گئیں کیاریاں ہری جیسے کہ رُت پلٹ چلی کون یہ مسکرا دیا ہنسنے لگی کلی کلی

جو مار رکھا ہے جی کو تم نے نہ آرزو اب ہمسے دینا
ہوئی جو تھی ذرا بھی ڈھیلی یہ سانپ کاٹے کا پھر پلٹ گئے

اسی کتاب میں "پکھار کی لڑائی" کے نام سے ایک ٹکڑا مرثیہ کا ہے جس میں حضرت عباس کی لڑائی کا بیان ہے اس کے بھی چند شعر سنئے:-

رن میں گھوڑا جو اُڑاتے ہوئے پہنچے عباس
چوکیاں گھاٹ پہ بیٹھی نہیں رُکا تھا پانی
بل پڑے تیوریوں پر ہو گئی چتون کچھ اور
تمتمانے لگا منہ ماتھے سے ٹپکا پانی
کھنچ کے باہر ہوئی کاٹھی سے تڑپتی ناگن
لہریں لینے لگا تلوار کا ٹھیرا پانی
آگے جو بڑھ رہے تھے اُنکے اُکھڑنے لگے پاؤں
جیسے ٹکرا کے پلٹ جاتا ہے چڑھتا پانی
لڑکے جب چھین لیا گھاٹ تو چلا کے کہا
اب تمھارا ہے یہ پانی کہ ہمارا پانی

میری یہ غرض نہیں کہ اُردو کے شاعر عام طور سے اس زبان کو

برتنے لگیں کیونکہ اول تو اُردو ملی جلی زبان ہے اور اس کی شیرینی اور گھلاوٹ کا سبب بہت کچھ یہ میل جول ہے۔ میری غرض صرف یہ ہے کہ آپ پر واضح ہو جائے کہ اس زبان میں جس کو آپ اور ہم روز بولتے ہیں کیا کیا ممکن ہے اور ایک قادر الکلام اگر چاہے تو خالص اُردو میں بھی بہت کچھ کر سکتا ہے۔

تلوار کاٹتی ہے مگر ہاتھ چاہیئے

اتنا ضرور عرض کروں گا کہ زبان کو خواہ مخواہ دقیق بنانا اور شعر کو چیستاں کر دینا عقل کے خلاف ہے۔ منشی اسیر فرما گئے ہیں۔

جس کا مطلب صاف ہے اس بات کی کیا بات ہے
شعر وہ کہئے اِدھر پڑھئے اُدھر مشہور ہو

میر انیس اور خواجہ حالی کے یہاں بیسیوں ہندی لفظ جن سے عام شعرا احتراز کرتے ہیں بڑی خوبی سے سجے ہوئے ملیں گے۔ نظم میں صناعی اچھی ہے مگر اس طرح کہ گلاب کے پھول پر شبنم یا تصویر پر آئینہ یہ نہ ہو کہ مضمون کی بلندی اور بندش کی چستی کے پھیر میں تاثیر کا طلسم ٹوٹ جائے اور شاعر محض مرصع کار اور مینا کار ہو کر رہ جائے مثال کے طور پر چکبست مرحوم کی رامائن سے ایک شعر پیش کرتا ہوں جب رام چندر جی بن میں جانے کے لئے اپنی ماں سے اجازت لینے کو جاتے ہیں تو وہ جواب دیتی ہیں۔

کس طرح بن میں آنکھوں کے تارے کو بھیج دوں
جوگی بنا کے راج دلارے کو بھیج دوں

میں کہتا ہوں کہ جو خیال اور جو قلب کی کیفیت اس مقام پر "راج دلارے" کے لفظ سے ادا ہوتی ہے وہ آپ ساری قاموس و صراح۔ غیاث اللغات اور بہار عجم چھان ماریئے کسی فارسی عربی لفظ سے ادا نہیں ہو سکتی۔ اسی وجہ سے میری رائے ہے کہ اُردو والوں کو بے تکلف ہندی سے استعارہ کرنا چاہیئے۔ ایک تلسی داس کی رامائن کو لیجئے مذہبی خیال سے قطع نظر کر کے محض

شاعری اور ادب کی نگاہ سے دیکھئے تو اس ایک کتاب میں سیکڑوں نئی تشبیہیں نئے استعارے لطیف نکتے دلکش اسالیب بیان اور میٹھے اور رسیلے الفاظ ایسے آپ کو ملیں گے جن سے آپ اپنی زبان کو مالا مال کر سکتے ہیں اور لطف یہ کہ سب کے سب خالص ہندوستانی۔ نہ آپ کو کوہ قاف سے پریوں کے بلانے کی ضرورت ہے نہ عرب کے ریگستان میں ناقہ کے ساتھ دوڑنے کی یا بیستون سے جوئے شیر لانے کی حاجت۔ میں ہندو ہوں اس لئے ممکن ہے کہ میری اس رائے پر طرفداری کا الزام لگایا جائے اس لئے میں آپ کے سامنے اپنی رائے کی تائید میں خواجہ حالی کی رائے پیش کرتا ہوں ظاہر ہے کہ اردو کو سمجھنے اور جاننے کا حق اور اس کی بہبودی کا خیال خواجہ صاحب سے زیادہ کس کو ہو سکتا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"آجکل اہل ملک کی بدقسمتی سے جو اختلاف ہندو مسلمانوں میں اردو زبان کی مخالفت یا اس کی حمایت کی وجہ سے برپا ہے اس کی رفع دفع اگر ہو سکتی ہے تو اسی طریقے سے ہو سکتی ہے کہ ہندو تعلیم یافتہ اصحاب کشادہ دلی اور فیاضی کے ساتھ اردو زبان میں جو درحقیقت برج بھاشا کی ایک ترقی یافتہ صورت اور اس کی ایک پروان چڑھی ہوئی اولاد ہے تصنیف و تالیف کریں ... اور مسلمان مصنفین بے ضرورت اردو میں عربی فارسی کے غیر مانوس الفاظ استعمال کرنے سے جہاں تک ہو سکے پرہیز کریں اور ان کی جگہ برج بھاشا کے مانوس اور عام فہم الفاظ سے اردو کو مالا مال کرنے میں کوشش کریں اور اس طرح دونوں قوموں میں آشتی اور صلح کی بنیاد ڈالیں اور ایک متنازعہ فیہ زبان کو مقبول فریقین بنائیں جیسی کہ لکھنؤ جانے سے پہلے تقریباً اہل دہلی کی زبان تھی۔"

آخری بات مجھے یہ کہنی ہے کہ اردو شاعری پر ایک بڑا اعتراض یہ ہے کہ اس میں سوائے گل و بلبل کے اور رکھا کیا ہے۔ اول تو یہ کہنا واقعات کے خلاف ہے اردو شاعری میں غزل کے علاوہ اور بہت کچھ ہے۔ ایک مرثیہ کی

صنف کو لیجئے اوروں کے کلام کو چھوڑ کر میرانیس کی پانچ جلدیں اور مرزا دبیر کے دفتر ماتم کی ۱۴ جلدیں موجود ہیں دوسری بات قابل غور یہ ہے کہ اُردو کے شاعروں نے غزل کے پردہ میں کیا کچھ نہیں کہا ہے اور گل و بلبل کی کہانی میں کیسے کیسے حیات انسانی کے رمز اور کیسی کیسی پُر اثر اور ناخن بر جگر قلبی واردات نہیں بیان کی ہیں مرزا غالب نے اپنے اشعار میں اسی بات کی طرف اشارہ کیا ہے فرماتے ہیں:-

مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام ۔۔۔ چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر
ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو ۔۔۔ بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

یہ ضرور ہے کہ ان کے سمجھنے کے لئے اور ان کی قدر کرنے کے لئے پڑھنے والے کو تمثیلی انداز بیان کی خوبیوں کو سمجھنا اور ایک حد تک ادب کے کنایوں اور اشاروں اور شاعری کے طرز و دستور سے واقف ہونا لازم ہے۔ غزل کے ہر شعر میں پورا مطلب ادا کرنا ہوتا ہے اسی وجہ سے غزل گو شعرا کوئی ممکن طریقہ اختصار کلام کا ایسا نہیں جو اختیار نہ کرتے ہوں مرزا غالب کا یہ فرمانا کہ

میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق توضیح ۔۔۔ میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل

قطعی صحیح ہے اور عموماً اردو اساتذہ کے کلام پر صادق آتا ہے۔

اب زیادہ آپ کی سمع خراشی منظور نہیں صرف ایک درخواست آخر میں کروں گا اور وہ یہ کہ خدا کے واسطے مذہب اور ملت کے جھگڑوں کو شاعری اور ادب کے احاطہ سے دور رکھئے اور کسی شاعر کے اس شعر کو کبھی کبھی پڑھ لیا کیجئے:-

وہ ہندو ہوں جو کرتا ہے خدا کو دیر میں سجدہ
جو کعبہ میں بتوں کو پوجتا ہے وہ مسلماں ہوں

منوہر لال زتشی

چند غلط فہمیاں

از جناب علامہ پنڈت برجموہن صاحب کیفی دہلوی

تاریخ صاف بتاتی ہے کہ جب دو قومیں ملتی ہیں تو ایک کی کلچر کا دوسری کی کلچر پر اثر ہوتا ہے۔ اور جب ملنا عارضی نہ ہو یعنی مستقل ہو تو تاثر کا یہ لین دین اتنا ہی مستقل اور عام ہوا کرتا ہے۔ کچھ مدت بعد دیسی پردیسی اور فاتح مفتوح کا امتیاز کم، دور ہوتے ہوتے دور ہو جاتا ہے۔ اسی پانی پت کے میدان میں ابراہیم لودی کے ساتھ گوالیار کے ہندو راجہ کا بابر کے مقابلے پر آنا اور پھر مرہٹوں کا مسلمان سپاہ کی خاصی جمعیت کے ساتھ ابدالی سے جنگ کرنا تاریخی واقعات ہیں۔ ان واقعات سے یہ سوال اُٹھتا ہے کہ وہ کیا چیز تھی جس نے ہندوستان کی ان دو بڑی جماعتوں میں یکجہتی اور مشترکہ وطنیت کا جذبہ پیدا کر دیا جو ذاتیات پر غالب آ گیا۔ میں کہوں گا کہ اسکی علت غائی وہ باہمی اتحاد تھا وہ رواداری تھی جو ہندو مسلم کلچروں کے میل جول سے پیدا ہوئی اور اسی بارے میں چند باتیں اہل وطن کو یاد دلانی ہیں۔

یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ آج ان باتوں کے یاد دلانے کی ضرورت پڑی۔ سندھ کے قبضے سے قطع نظر جو مسلمان شمالی مغربی دروں سے اس ملک میں آئے اور یہیں کے ہو گئے ان کی قومیت اور مذہب چاہے کچھ ہو ان کی تہذیب اور کلچر کی نوعیت آرین تھی۔ آن پر پوری طور سے ایران کی کلچر اور زبان و ادب کا رنگ چڑھا ہوا تھا اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں، کہ ایرانی اُسی تنے کی ایک شاخ تھے جس کی ایک شاخ ہندوستان میں آکر پروان چڑھی۔ یہی وجہ تھی کہ جنگ و جدل اور دار و گیر میں جو سختیاں

ہوا کرتی ہیں وہ سب بھول گئیں اور ہندو مسلمان ہموطن ہونے کے جذبے
سے ایک دوسرے کی کلچر سے مستفید ہونے لگے۔ جب آپس میں ایک دوسرے
کی کلچر کا جائزہ لیا گیا تو نیک نیت اور صالح ارادے سے ایک ایسا مرکب
تیار کر دیا جس کی مکمل نظیر یونان اور روم، انگلستان اور نارمن فاتحوں کے
باہمی اتحاد میں بھی نہیں ملتی محققوں کی دریافت تو یہ ہے کہ اس بارے میں
مفتوح فاتحوں سے دور رہے۔ چنانچہ لکھا ہے:—

"During the Middle Ages, Hindu thought came in Conflict with the ideals of Islam in India. The clash between these two opposite systems resulted in the preponderance of the native culture, and Islamic thought was largely absorbed in Hinduism" The Story of Indian civilisation, by C.E.M goad. p 56.

ترجمہ:—

"قرون وسطیٰ میں ہندوؤں کے تخیل کا اسلامی خیالات سے تصادم ہوا۔
ہندوستان میں دو مختلف نظاموں کی اس مڈبھیڑ میں دیسی کلچر کو غلبہ
حاصل ہوا اور اسلامی ذہنیت بہت کچھ ہندو ذہنیت میں جذب ہو گئی"
یہ تحقیق ایسے شخص کی ہے جو نہ ہندو ہے نہ مسلمان۔ اور جو ہندوستانی
بھی نہیں۔

جو شخص تحقیق کی نظر سے گزشتہ حالات کو دیکھے گا وہ اسی نتیجے پر پہنچے گا۔
آج تک ہم ہندو معماروں کو مسجدوں کی تعمیر میں اور مسلمان معماروں کو مندروں کی تعمیر میں شریک
دیکھتے ہیں فیضی نے سریمد بھگوت گیتا کا ترجمہ کہہ سکتے ہیں اکبر کے حکم سے کیا۔ لیکن رحیم اور
رس خان وغیرہ کی برج بھاشا میں کبتا اور ملک محمد جائسی کی ضخیم تصنیفیں
کس کے حکم سے لکھی گئیں؟ اور فرحت۔ خوشتر اور تمنا وغیرہ ہندو شاعروں

سے رامائن، مہابھارت اور بہت سی پرانی کتابوں کے اُردو میں ترجمے کس کے حکم سے کئے گئے تھے؟ ان کا محرک وہی اتحاد کا جذبہ اور کلچروں کا شیر وشکر ہونا تھا جس کا چمتکار ہم کو ہندوستانی زندگی کے ہر شعبے میں اب تک ملتا ہے۔ معاشرت اور کلچر کے اسی اتحاد اور موالات کی پیداوار ہے جسے 'اُردو' کہتے ہیں۔

میں دیکھتا ہوں کہ بعض حضرات اُردو کا نام سن کر سنبھل بیٹھتے ہیں۔ گزارش ہے کہ اس بارے میں شاید انھیں مایوسی ہو کیونکہ میں یہاں مناظرے کی فضا پیدا کر دینا نہیں چاہتا۔ میں صرف اس معاملے کی روح پر روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا۔ ہمارے دوستوں کا ذہن کئی غلط فہمیوں کے جوش سے بہک رہا ہے۔ تحقیق کا زعم کئی صورتوں میں بے جا ہے اور بھی اس قسم کی کئی کیفیتیں ہیں جن کا دور کرنا وطن کے ہر محب کا فرض ہے کوشش ہو گی کہ اس ضمن میں صرف مسلمہ اور تاریخی واقعات اور اُردو والوں کو چھوڑ کر دوسرے اہل الرائے کی رایوں سے گفتگو ہو۔

جسے آج کل ہندی کہا جاتا ہے اس کا ابتدائی نام کھڑی بولی ہے اس کی پیدائش کی بابت پنڈت چندر دھر شرما گلیری کی یہ رائے ہے جو نہایت اہمیت رکھتی ہے:۔

''کھڑی بولی اُردو پر سے بنائی گئی۔ ارتھات مسلمانی بھاشا ہے''[۱۵]

کس سادگی اور بھولے پن سے کہا گیا ہے کہ یہ بات گلیری جی نے ہنسی میں کہہ دی۔ یہ معذرت یقین کے قابل نہیں کیونکہ اس کی شہادت اور ثبوت اور جگہ سے ملتے ہیں۔ بابو شیام سندر داس جو بنارس کی مشہور ناگری پرچارنی سبھا کے بڑے سکریٹری ہیں فرماتے ہیں:۔

''جہاں جہاں مسلمان پھیلتے گئے اس بھاشا (کھڑی بولی) کو اپنے ساتھ لیتے گئے۔ اس میں عربی فارسی کے شبد گھسنے لگے پر آرمبھ میں یہ

---

۱۵ اُردو کا مسئلہ ۔ مصنفہ چندر بلی پانڈے ۔ صفحہ ۶

ان کو سنگمنا سے گرہن کرتی اور اپنا روپ دیتی رہی۔ پیچھے یہ دھارا بدل گئی اور مسلمانوں نے اس میں کیول فارسی تتھا عربی کے شبدوں کی ہی ان کے تشدھ روپ میں اُدھکتا نہیں کر دی بلکہ اس کے دیاکرن پر بھی فارسی عربی دیاکرن کا پیٹ چڑھنا آرمبھ کر دیا
——اس سمیہ اس کھڑی بولی کے تین رُوپ ورتمان ہیں:—
(۱) شدھ ہندی۔ (۲) اُردو۔ اور (۳) ہندستانی[۱]
اسی کتاب میں بابو صاحب موصوف آگے چل کر لکھتے ہیں:—
"کھڑی بولی میں ساہتیہ (لٹریچر) کی رچنا ابھی تھوڑے دنوں سے ہونے لگی ہے۔" (صفحہ ۷۷)

اور اسی سلسلے میں فرماتے ہیں کہ "کھڑی بولی کا پہلا کوی امیر خسرو ہے۔"

اس اقتباس سے ثابت ہے کہ بابو صاحب کا یہ کہنا مسلمانوں نے "کھڑی بولی کے دیاکرن پر فارسی عربی دیاکرن کا پیٹ چڑھایا" کسی غلط فہمی کی بنا پر معلوم ہوتا ہے جب کہ وہ خود فرماتے ہیں کہ کھڑی بولی کا کوئی لٹریچر نہیں تھا۔ مسلمانوں نے اسے ادبی حیثیت بخشی۔ اُن کے لفظ ہیں:—

"انھوں نے (مسلمانوں) نے اس کو ساہتیک بھاشا بنانے کا گورب بھی پایا۔" (وہی صفحہ ۷۷)

پھر یہ کہنا کہ اس کی صرف و نحو کو عربی فارسی رنگ دیا کچھ معنی نہیں رکھتا جب لٹریچر ہی نہیں تو دیاکرن کہاں سے آگیا۔ یہ تو تھا ایک جملہ معترضہ۔ غور کی بات یہ ہے کہ ان صورتوں میں جو اوپر دئے ہوئے اقتباسوں میں ابھی پیش کی گئیں۔ گلکرسٹ صاحب مذکور کا یہ کہنا کہ "کھڑی بولی اردو سے بنی" ہنسی کی بات نہیں۔ سنجیدہ تحقیق کا نتیجہ ہے۔ لیکن چونکہ پانڈے جی کے پاس اس کے خلاف کوئی شہادت نہ تھی اس لئے یہ کہہ گئے۔ کچھ تو کہنا ہوا۔ اسی طرح ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے جو کہیں یہ کہدیا کہ "کھڑی بولی کے معنی ہندستانی میں عام طور پر

---

[۱] ہندی بھاشا کا وکاس مصنفہ بابو شیام سندر داس، سکریٹری ناگری پرچارنی سبھا بنارس صفحہ (۵)

گنواری بولی کہے ہیں" تو پانڈے جی کو ناک بھوں چڑھانے کا کوئی موقعہ نہ تھا۔ جو کچھ ڈاکٹر صاحب نے کہا برج بھاشا سے موازنہ میں تھا۔

انھیں سری چندر بلی پانڈے جی کی ایک اور کتاب بھی ناگری پرچارنی سبھا مذکور نے شائع کی ہے جس کا نام ہے بھاشا کا پرشن، اس کتاب میں فرماتے ہیں:۔

"ہندی کے ساتھ اس (اردو) کی نبھ نہیں سکتی وہ ہندی اور ہند کی بھاشاؤں کو مٹا کر بڑھنا چاہتی ہے (صفحہ ۵۲)

یہ صاحب ہندی کو بار بار راشٹر بھاشا کا من مانا خطاب دیتے ہیں لیکن ملک میں اور بھاشاؤں کا وجود بھی تسلیم کرتے ہیں جن کو ان کے قول کے مطابق اردو مٹانا چاہتی ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ ناگری پرچارنی سبھا کے ماہنامے ہندی کے ایک مضمون پر غور کرنا ہے۔ لکھا ہے:۔

"اب اپنے اپنے پرانت میں پرتھک پرتھک اردو کا ورودھ کرنے سے کام نہیں چلے گا۔ سب دیش بھاشا بھاشیوں کو سنگٹھت ہو کر ایک ساتھ ورودھ ایک دیش دیاپی آندولن کھڑا کرنا چاہیے"[۱]

آپ دیکھتے ہیں کہ یہ کیا بات ہے؟ یہ بہت گہری اور تہ کی بات ہے، یہ وہی ذہنیت ہے جس نے ہٹلر کو برِ اعظم یورپ میں جمہوریت کے خلاف نیا آرڈر قائم کرنے کی سجھائی۔ اسی طرح یہاں سب صوبوں کو اُکسایا جاتا ہے کہ سب ہمارے ساتھ مل جاؤ اور اردو کے خلاف عالمگیر جنگ شروع کر دو۔ ایسی ہی ذہنیت کے ہاتھوں آج کل دنیا جن مصیبتوں اور تکلیفوں میں ہے اس کے ذکر کی ضرورت نہیں۔ یہی درگت ہمارے برادران وطن ادبی اور لسانی پہلو سے ہندستان کی بنانا چاہتے ہیں۔ اس کی تہ میں کیا بات ہے؟ سنیے اسی رسالے میں جس کا ابھی ذکر ہوا لکھتے ہیں:۔

---

[۱] رسالہ ہندی۔ اپریل ۱۹۴۱ء

"جھگڑا ہندی اردو کا نہیں۔ سنسکرت اور عربی کا ہے"۔

حضرات۔ یہ الفاظ بہت دُور کی خبر لاتے ہیں۔ اسی کو کہا ہے:۔

جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے

یہ خیال ایک واحد شخص کا نہیں۔ سنئے آل انڈیا ہندو مہا سبھا کے سکریٹری جناب جی۔ وی کیتکر کا حکم ہے:۔

"مسٹر سنت رام کی رائے درست ہے کہ جو کتابیں کل ملک کے لئے شائع کی جائیں وہ سنسکرت آمیز زبان میں ہونی لازم ہیں" [۵۱]

یہ کہنا کہ "جھگڑا سنسکرت اور عربی کا ہے" اس میں آدھا ضرور سچ ہے یعنی یہ جھگڑا سنسکرت کا ہے اور اس کا ثبوت آل انڈیا ہندو مہا سبھا کے سکریٹری صاحب کے الفاظ میں ملتا ہے۔ جو ابھی پیش کئے گئے۔ یعنی سنسکرت کا احیا۔ اس طرف سے کسی نے کبھی عربی آمیز زبان کی تبلیغ نہیں کی بلکہ ہمیشہ اُس کو ان عربی لفظوں کے علاوہ جو ہندی کی مانند اردو میں گھل مل گئے ہیں، غریبہ اور فصاحت کے خلاف سمجھتے رہے۔ دوسری طرف جو ارادے اور منصوبے کیا جو کچھ عمل میں آرہا ہے آپ دیکھتے ہی ہیں۔ آپ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اپنے نزدیک انھوں نے کتنا خوفناک محاذ قائم کیا ہے۔ میں اسے خطرناک کہہ کر یہاں ایک شعر کے ساتھ ختم کروں گا۔

زباں کے مسئلے پر ہیں یہ تیر انداز یاں کیسی
کہیں یہ خاک تو دہ گنبد بابل نہ بن جائے

سنسکرت کے لفظ تو اردو میں بھی ہیں اور ساری صوبائی زبانوں میں بھی ہیں لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ہندی سے مشابہت کی وجہ اردو میں زیادہ ہے یا گجراتی اور مرہٹی وغیرہ میں۔

---

[۵۱] انگریزی اخبار مرہٹہ۔ پونا ۲۱ نومبر ۱۹۴۱ء۔

سنسکرت	ہندی	اُردو	مرہٹی
آمر	آم	آم	اَنبہ
شرکرا	شکّر	شکّر	ساکھر
..	بہن	بہن	بَہینڑ
..	ہاتھ	ہاتھ	ہات
..	سیاہی	سیاہی	شائی
..	پانی	پانی	پانڑی
..	بولنا	بولنا	بولڑیں

اب کچھ جملوں وغیرہ پر نظر ڈالیے :-

اُردو اور ہندی	مرہٹی
دانتوں تلے اُنگلی دبانا	توں ڈانت بوٹ گھالڑیں
ناک دبانے سے مُنہ کھلنا	ناک دابلن کیں توڑ اُگھڈتن
پار لگانا	پار کرڑیں
ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا	ناچتاں ییت ناہیں جھڑیں انگڑ واکنڈ
سب چنے تھے دانت نہ تھے	چنسرڑے آہیت تر دانت ناہیت
پونے سولہ آنے ٹھیک ہے	پونڑے سولا آنڑا سے برو بر آہے
میں ہاتھ سے کام کرتا ہوں	میں ہاتانیں کام کرتو
مالتی نے رام کو آم دیا	مالتی نے راما لا آمبا دِلا

اس ضمن میں زیادہ مثالیں محض طوالت ہے۔ بس گجراتی کی نسبت ایک بات اور کہی جائے گی۔

اُردو، ہندی اور مرہٹی کی عام لسانیاتی حالتیں آپ ابھی دیکھ چکے ہیں۔ اب اُردو ہندی اور گجراتی میں لفظوں کی جنس یعنی تذکیر و تانیث کی کیفیت ملاحظہ ہو۔ سب سے پہلے یہ بتانا ہے کہ مذکر اور مونث کے علاوہ گجراتی میں ایک تیسری جنس مخنث بھی ہے۔ اگرچہ اردو اور ہندی میں یہ تیسری جنس

نہیں۔ اسی سے علاوہ اور امور کے، مستشرقین کو یہ خیال ہوا کہ ہندی اُردو سے نکلی سنسکرت سے نہیں نکلی کیونکہ یہ تیسری جنس سنسکرت میں ہے، اردو اور کھڑی بولی میں نہیں۔ چنانچہ گجراتی زبان میں پُستک کا لفظ مخنث ہے جبکہ اُردو اور ہندی میں مونث ہے۔ اس جملہ معترضہ کو چھوڑ کر جنس کی مطابقت یا اسکے خلاف کو اُردو، ہندی اور گجراتی میں دیکھیے۔

لفظ	ہندی	اُردو	گجراتی
آتما	مونث	مونث	مذکر
ڈھنی	"	"	"
وایو	"	"	"
مرتیو	" (مونث)	"	"

اس لسانیاتی بیگانگی کے باوجود اُردو سے غیریت ہی نہیں دشمنی برتی جاتی ہے اور اسے ہندی کی سوت کہا جاتا ہے[۱] ایک صاحب لکھتے ہیں:-

"یدی اس (اُردو) میں سے پردیسی پن دور ہو جائے تو وہ خالص ہندی ہے"[۲]

اگر ان صاحب سے پوچھا جائے کہ اس ارشاد سے آپ کا مطلب کیا ہے؟ تو جواب یہی ہوگا کہ فارسی اور عربی کے لفظ۔ ایک صاحب کا قول پہلے آچکا ہے کہ جھگڑا عربی اور سنسکرت کا ہے۔

اس بارے میں بارہا لمبی لمبی فہرستیں اُن عربی اور فارسی الفاظ کی اہل وطن کے سامنے پیش کر چکا ہوں جو مہا کوی چند بردائی سے کی عظیم تصنیف میں آئے ہیں یا عام اور موجودہ ہندی میں داخل ہو گئے ہیں۔ ملاحظہ ہو میرا الکھرناگز یزنیل وقال ان فہرستوں کا دہرانا محض طوالت ہے۔ اسی جملے میں جو ابھی نقل کیا گیا ایک لفظ یدی تو سنسکرت ہے۔ دور فارسی اور خالص عربی ہے باقی سب لفظ اُردو

---

[۱] بھاشا کا پرشن صفحہ ۵۹

[۲] ہندی بنام اُردو، مصنفہ وینکٹیش نارائن تواری۔ دیباچہ۔

اردو ہیں۔ ملکی زبان۔ بلکہ زبانوں میں فارسی الفاظ کا شامل ہونا آج کی بات نہیں جہاں تک تاریخ کی روشنی پہنچتی ہے ایسا ہونا برابر پایا جاتا ہے یہاں تک کہ عربی فارسی لفظوں کا ہند و مخدّرات کے استعمال میں مسلمانوں کے راج سے پہلے پایا جاتا ہے۔

سنہ ١١٩٢ء میں ترائن کے میدان میں محمد غوری اور مہاراجہ پرتھی راج میں آخری لڑائی ہوئی۔ اس کا نتیجہ آپ کو معلوم ہے۔ پرتھی راج کی بہن راجکماری پرتھا بائی کی شادی چتور کے راول سمر سنگھ سے ہوئی تھی۔ یہ بھی اس لڑائی میں شہید ہوئے۔ پرتھا بائی نے ستی ہونے سے پہلے ایک خط اپنے بیٹے کو لکھا جو چتور میں تھا۔ یہ خط نہایت اہم دستاویز ہے جو اُردو کی ابتدائی حالت پر بہت کچھ روشنی ڈالتی ہے۔ غور سے سنئے:۔

"سری حضور سمر (جنگ) میں مارے گئے اور ان کے سنگ رشی کیش
جی بھی بیکنٹھ کو پدھارے ہیں۔ رشی کیش جی اُن چار لوگوں میں سے
ہیں جو دلی سے میرے سنگ دہیز میں آئے تھے۔ اس لئے انکے
منسنجوں (کُنبہ والوں) کی خاطر رکھنا۔ دوسرے (اور) پاپچھے ماراچیاری (راچاکری یعنی نوکرچاکر) گراں کے منتا
کی خاطر راکھجو۔ (ای) (یہ) مارا جیو کا چاکر ہے جو تھا (تم سے) سو سرکدی (کبھی) حرامخوری
نیہو یکا" (نہیں کریگا)

یہ خط ماگھ سدی دوادشی سمّت ١٢٤٨ بکرمی کا لکھا ہوا ہے جس کی انگریزی تاریخ سنہ ١١٩٢ء کے جنوری میں آکے پڑتی ہے۔ یہ تحریر اُردو نہیں تو اُردو آمیز ضرور ہے لیکن سنسکرت آمیز ہرگز نہیں۔

ان کی نظر میں کسی منشا سے ہوں، صرف ہندوستان کے مختلف پرانت یعنی صوبے ہیں ہماری نظر بین الاقوامی فضا تک پہنچتی ہے، ان کو معلوم ہونا چاہیئے کہ چالیس برس کے قریب مدّت گزر گئی کہ سینٹ پیٹرس برگ کے سرکاری

گزٹ میں یہ اعلان شائع ہوا:-

وسط ایشیا میں روسی تجارت کی آئندہ ترقی کے معاملے میں اُردو زبان کو خصوصیت سے دخل ہے۔ اور یہ ایک ایسی زبان ہے جسے ملکی فوائد کے لئے حاصل کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ہمیں اس زبان کی تعلیم کو ہر ایک صورت سے ترقی دینے کی کوشش کرنا چاہیے۔ اور اگر اسے لازمی قرار نہ دیا جائے تو پھر بھی وسط ایشیا کے امیدواران ملازمت کے لیے اس کا جاننا ضروری ہونا چاہیے۔ چونکہ ایشیا میں سمرقند سے لے کر افریقہ میں زنجبار تک زبان مذکور کے بولنے والے پائے جاتے ہیں۔ اس لیے سرکاری خرچ سے اس زبان کی تعلیم کے لیے مدارس قایم ہونے چاہئیں جہاں کے کامیاب طلبہ کو آئندہ زمانۂ ملازمت میں وسط ایشیا کی اقوام اور لوگوں سے گفتگو اور بات چیت کرنے میں سہولت ہوگی۔ چینی زبان کے بعد اُردو زبان سب سے دنیا کے بڑے حصے میں بولی جاتی ہے۔ اور سرحد ترکستان سے افریقہ تک یہی زبان حلّال مشکلات خیال کی جاتی ہے۔ روسی عہدہ داروں کے لیے زبان مذکور کی تعلیم کتنی کچھ ضروری نہ ہوگی جو ہمارے ایشیائی مقبوضات اور ہندوکش کے اُن دروں میں جو پنجاب کو جاتے ہیں بولی جاتی ہے۔ تمام روسی یونیورسٹیوں ٹکنیکل فوجی کالجوں اور وسط ایشیا کے خاص مدارس میں ادنیٰ اعلیٰ سب طالب علموں کے لیے ہندوستانی زبان اُردو کا سیکھنا لازمی ہونا چاہیے۔[۵]

آپ نے اُردو کی بین الاقوامی حیثیت ملاحظہ فرمائی۔ اس عظیم الشان زبان کو ہمارے مہربان مٹانا چاہتے ہیں۔ ان کے دل کے اندر جو بات ہے وہ

---

۵ مفصّل حوالۂ پیسہ اخبار، مورخہ ۲۱ جنوری ۱۸۹۹ء۔

پھوٹ نکلی ہیں کا ثبوت ابھی کچھ دیر ہوئی مہا سبھا کے سکریٹری اور دوسرے صاحبوں کی زبان سے پیش کیا گیا ہے۔ اردو زبان کے حامیوں کو خلیفہ اور منشی اور جانے کیا کیا طعن آمیز لقب دینا۔ جس کی تشریح ڈاکٹر عبدالحق بہتر کر سکتے ہیں۔ میں نہیں سمجھ سکتا کس مصلحت اور وطن کی خدمت پر مبنی ہے۔

یہ دیکھ کر بہت افسوس ہوتا ہے کہ لوگ غل غپاڑے اور ہیکڑی سے کام نکالنا چاہتے ہیں۔ جاہلوں میں ہو سکتا ہے کہ وہ کامیاب ہو جائیں لیکن سچے ملکی خیرخواہ اور تاریخی واقعات سے خبردار لوگوں میں ان کی بات کا چل نکلنا ممکن نہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ایک جذباتی بحران ہے کہ سروں کو جا رہا ہے جنھیں کل تک پوجتے تھے انھیں کی باتوں کو آج کل ٹال رہے ہیں۔ چنانچہ ایک صاحب لکھتے ہیں:

"دنیا جانتی ہے کہ بہار تھا مدھیہ پرانت میں کبھی مسلمان کنند رہا اردو کے اڈّے نہ تھے۔ سرکار کی اور سے کافی چھان بین کے بعد اردو وہاں سے ہٹا لی گئی تھی۔ پرنتو پنڈت جی (جواہر لال) نے پھر وہاں اسے چالو کر دینے کا اپنی اور سے ودھان کر دیا ہے۔"[۵۱]

اب دیکھیے یہ تحریر ایک ایسے صاحب کی ہے جو ایک ادبی رسالے کے اڈیٹر ہیں۔ اور جس میں سے یہ تحریر لی گئی ہے اسے بہار کی ناگری پرچارنی سبھا شائع کرتی ہے۔ یہ سب اس قدر بھی اپنی ذمہ داری محسوس نہیں کرتے کہ مسلمان کنندر کو جانے دیجیے بہار میں بقول ان کے اردو کا اڈّا کبھی تھا ہی نہیں۔ اڈے کا لفظ بھی غور طلب ہے۔ بغیر طوالت کے تو میں مدھیہ پرانت کو رہنے دیتا ہوں لیکن بہار کی نسبت اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ بہار اردو کا اڈّا نہیں۔ اردو کے ایک مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔ گیا کے رسالہ قدیم کا بہار ناگری پرچارنی سبھا کے دفتر میں موجود نہیں تو وہ انجمن ترقی اردو کے کتب خانے سے منگا کر اس کتاب کے فاضل مصنف کو ملاحظہ کرائیں تاکہ انھیں ذمہ داری کا کچھ احساس ہو۔

اس کے ساتھ ہی یہ دیکھ کر اطمینان ہوتا ہے کہ بعض گوشوں میں نقطہ صاف

---

۵۱ بھاشا کا پرشن۔ مصنف شری چندر بلی پانڈے صفحہ ۵۱

ہو رہی ہے۔ مسٹر راجگوپال آچاریہ کے یہ لفظ بہت معنی رکھتے ہیں۔ فرمایا ہے:۔

"خود وہ زبان (اُردو) اسلامی ہندستان اور ہندوؤں کے
ہندستان کے میل سے ہی تو پیدا ہوئی ہے۔ ہندستانی شاعری
موسیقی اور طرز تعمیر نتیجہ ہیں اتحاد کا" [۵۱]

شاعر ٹھیک کہہ گیا ہے ؎

صبح جو جائے اور آئے شام
اس کو بھولا ہوا نہیں کہتے

حضرات معاف کیجئے میں نے آپ کا بہت وقت لیا ہے ایک بات اور کہوں گا اس سے پہلے کہ بیٹھ جاؤں۔ اور وہ یہ ہے کہ ہم ہندو مسلمان آج اس ملک میں آکر نہیں بسے۔ ہم نے رواداری اور موالات سے رہنا سیکھا ہے ہم اس طرح رہ چکے ہیں۔ ہم ہندو اور مسلمان، اختلاف کے باوجود اتّحاد کو عمل میں لا چکے ہیں اور کثرت میں وحدت اور بھید ابھید وادصرت ہمارے تخیُّلی اور اعتقادی مسئلے نہیں بلکہ ہمارے فلسفہ حیات کے عملی اصول ہیں۔ اگر بعض برادران وطن ان گزری باتوں کو بھول گئے تو ہمیں ان کے حق میں دعائے خیر کرنی چاہئے۔ اگر کسی کو ان سے شکوہ ہو تو اس سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

دوستو۔ یہ وقت ہے کہ ہم سب مل کر اس خطرے کو نیست و نابود کرنے کی کوشش کریں جو ہمارے دروازے پر طوفان مچا رہا ہے۔ نہ یہ کہ راشٹر بھاشا کے وہم میں اپنی ذہنیتوں کو کھپا دیں۔

---

[۵۱] ہندوستان ٹائمز۔ ۲۶ مارچ ۱۹۴۰ء

تصوف اور اردو شاعری

تصوّف کیا ہے؟

حضرت جنید بغدادی فرماتے ہیں کہ تصوّف یہ ہے کہ خدا ہمیں ہمارے ہستی کے تخیل سے آزاد کر دے اور وہ کیفیت پیدا کرے کہ ہماری ہستی اس میں ضم ہو جائے۔

صاحب کشف المحجوب کہتے ہیں کہ صوفی وہ ہے جس کا قلب صفا سے لبریز ہو اور کدر (گندگی) سے خالی ہو۔

حضرت ذوالنون مصری کہتے ہیں کہ صوفی وہ ہے کہ جب گفتار میں آتا ہے تو اس کی زبان اس کے حقیقت حال کی ترجمان ہوتی ہے اور جب وہ خاموش ہوتا ہے تو اس کے اعضا شہادت دیتے ہیں کہ وہ علائق کو قطع کر چکا ہے۔

حضرت ابوالحسن نوری کا قول ہے کہ تصوّف تمام حظوظ نفسانی کے ترک کا نام ہے۔

ابوعمر دمشقی ارشاد فرماتے ہیں کہ تصوف نام ہے کائنات کی جانب نگاہ عیب جوئی سے دیکھنے کا۔

فی الحقیقت تصوّف روحانیت کا وہ درجہ ہے جس میں انسان نفس امارہ اور نفس لوامہ سے گزر کر نفس مطمئنہ حاصل کرے یا بقول مانی جائسی صوفی میں وہ حالت ہو جاتی ہے کہ ع

جو سانس ہے اک منزل عرفان و یقیں ہے

ایک صوفی کو چڑیوں کی چہک میں، پھولوں کی مہک میں، جواہرات کے دمک میں، سورج کی چمک میں، جانوروں کی آوازمیں، درختوں کے رنگ میں، پتھر کی سختی میں، زمین کی نرمی میں، دریا کے بہاؤ میں، پہاڑ کے ابھار میں

ایک ان دیکھی ہستی کا جلوہ نظر آتا ہے۔ اور یہ تصوف کی انتہائی منزل ہے۔ سودا خوب فرماتے ہیں۔ ؎

سودا نگاہ دیدۂ تحقیق کے حضور
جلوہ ہر ایک ذرہ میں ہے آفتاب کا

صوفی کہتے ہیں کہ یہ پودا حضرت آدم کے زمانہ میں لگا، حضرت نوح کے زمانہ میں اس پودے کی نشو و نما ہوئی، حضرت ابراہیم کے زمانہ میں اس میں شاخیں پھوٹیں، حضرت موسیٰ کے زمانہ میں یہ پروان چڑھا، حضرت عیسیٰ کے زمانہ میں یہ پھولا پھلا اور حضرت محمدؐ کے زمانہ میں اس کے پھلوں کے شراب طہور سے دنیا سرشار ہوئی۔ لیکن یہ بے انصافی ہوگی اگر میں یہ نہ کہوں کہ اس درخت کے بارآوری میں دیگر فلسفوں کا بڑا ہاتھ ہے، فلسفہ ویدانت کا فی الحقیقت ہمہ اوست کا اصول جو تصوف کی جان ہے وہ ویدانت کے جسم کی شہ رگ ہے۔

تصوف کے دو اسکول ہیں۔ ایک وحدت وجود یعنی ہمہ اوست کا قائل ہے اور دوسرا وحدت شہود یعنی ہمہ از اوست کا۔ مولانا روم ہمہ اوست کے مؤید ہیں اور منصور کا انا الحق کہنا ان کے نزدیک ایک لازمی نتیجہ تھا اس درجہ کا جہاں ماسوی اللہ کا گذر نہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ انا الحق تو انا العبد سے زیادہ متواضع ہے کیونکہ انا العبد میں تو انسان اپنی ہستی کو قائم رکھتا ہے اور انا الحق میں تو وہ اپنی ہستی کو بالکل فنا کر دیتا ہے اور بھول جاتا ہے۔ اگر وہ کیفیت جس سے انا الحق کی آواز نکلی استغراقی حالت کا نتیجہ ہے تو اس میں شبہہ کیا ہے کیونکہ ڈوبنے والے پر پانی کا تصرف ہوتا ہے اور اس کا پانی پر تصرف نہیں ہوتا۔ ایک شاعر اس خیال کو اس طرح ادا کرتا ہے۔ ؎

سمجھتے ہو جوش انا الحق کی مثلیں؟ وہ قطرہ نہیں ہے، جو دریا نہیں ہے
وہ دل کیا، جو دلبر کی صورت نہ پکڑے وہ مجنوں نہیں ہے، جو لیلیٰ نہیں ہے

ویدانت نوشیرواں اور بزرجمہر کے زمانہ میں ایران پہنچا اور تصوف کی شکل میں پھر ہند میں آیا۔ عیسائی مسٹی سیزم کا اثر جو اسلامی تصوف پر ہوا وہ عرب شام

اور روم وغیرہ سے ہندوستان میں آیا۔

ہمارے شعراء میں بھی شروع ہی سے ایسے لوگ رہے ہیں جن میں سے بعض دونوں اصول کے قائل تھے اور بعض صرف ایک کے۔ خواجہ میر نصیر عندلیب اور خواجہ میر درد وحدت شہود کے قائل تھے جیسا کہ میر نصیر اپنی کتاب "نالۂ عندلیب" اور خواجہ میر درد اپنی کتاب "واردات" میں لکھتے ہیں۔ دلی اور مظہر جان جاناں وحدت وجود اور وحدت شہود دونوں کے قائل تھے۔ مگر بڑی کھلی ہوئی مثال وحدت وجود کے موافق اور مخالف ہونے کی دو شاعروں کے حسب ذیل متضاد تخیل سے ملتی ہے۔ ؎

نمبر۱ منصور انا الحق بول اُٹھا تو اور نہیں میں اور نہیں
جب دار چڑھا تب آئی ندا، تو اور نہیں میں اور نہیں

نمبر۲ قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن ہم کو منظور تنک ظرفیِ منصور نہیں

تصوف کی بنیاد اصول محبت پر ہے، محبت اس کی دنیا ہے اور محبت اس کا عقبیٰ۔ وہ خدا کو بھی محبوب کے نام سے یاد کرتا ہے۔ ایک ہندی شاعر خوب کہتا ہے ؎

ہم تو جوگی پریم کے اور پریم ہمارا دیس
سُدھ نہیں پائی پیو کی تب کینا یہ بھیس

ایک صوفی کے نزدیک محبت کا آخری درجہ ہی علم و عرفان و یقین کا درجہ ہے وہ کہتا ہے "العشق ہو اللہ" یعنی خدا محبت ہے۔ اس لئے وہ اپنی ساری منزل جادۂ عشق سمجھتا ہے اور محبت ہی کی ساری منزلیں طے کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ چنانچہ اس کے اصطلاحات بھی محبت ہی کی اصطلاحات سے لئے گئے ہیں مثلاً محو، جذب، لحق، فنا، حال وغیرہ وغیرہ۔

اس کا عشق ایک ایسی آگ ہے جو صوفی کے دل اور سینہ میں جلتی رہتی ہے، اس کو مضطر اور بیقرار رکھتی ہے اور خدا کے سوا جو کچھ ہے اسے جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔ شعراء اس کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں۔

اسرار عشق ہے دلِ مضطر لئے ہوئے قطرہ ہے بیقرار سمندر لئے ہوئے

باغ میں بلبل و گل بزم میں پروانہ و شمع — بھیس بدلے ہوئے پھرتی ہے محبت تیری

ایک صوفی تمام دنیا کو دو صفتوں میں تقسیم کرتا ہے۔ حُسن اور قبح۔ وہ تمام چیزیں جو انسان کو اعلیٰ صفات سے متصف کریں یہاں تک کہ وہ الوہیت میں جذب ہو جائے، حُسن ہے اس کے علاوہ تمام چیزیں قبیح ہیں۔ اسلامی تصوف کے اعتبار سے حُسن حاصل کرنے کے لئے دنیا سے دو چار ہونا لازمی ہے مگر دیگر فلسفوں کے اعتبار سے اُسے خیر باد کہنا۔ اسلام تو کہتا ہے "اے نبی کیا تم دیکھتے نہیں کہ کون لوگ دین کو جھٹلاتے ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جو محتاجوں کو کھانا نہیں کھلاتے اور یتیموں کی پرورش نہیں کرتے۔ پس خرابی ہے ایسے عبادت کرنے (نماز پڑھنے) والوں کے لئے جو دکھلانے کے لئے تو عبادت کرتے (نماز پڑھتے) ہیں مگر انکی عبادت (نماز) ہی کیا ہے کیونکہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی آپس میں رواداری نہیں برتتے"۔ محمد ابن عربی جو اسلامی تصوف کے سرچشمہ ہیں وہ بھی فرماتے ہیں کہ لقائے رب کے لئے پاک زندگی ضروری ہے اور ترک دنیا کا تخیل فی الحقیقت انسانی تخیل ہے، آسمانی نہیں ہے یعنی اسلام کے لحاظ سے اساس تصوف خدمت خلق ہے۔ چنانچہ شیخ سعدی فرماتے ہیں ؎

طریقت بجز خدمت خلق نیست — بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

عنوان اسلام کا تصوف بھی تھا۔ تصوف نے ہمیشہ الوہیت پر قابو پانے کے لئے اس پر زور دیا کہ دل کی نشو و نما خدمت خلق سے کی جائے۔ چنانچہ مولانا رومی فرماتے ہیں "مذہبی رسم و غیرہ اچھی چیزیں ہیں لیکن محبوب کا ظہور مسجد و مندر و گرجا میں نہیں ہے بلکہ ایک صاف اور سچے دل میں ہے۔"

صوفی کی بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ دنیا کو پریم کا نگر سمجھتے تھے۔ رواداری، ملاطفت، مدارا، اُن کا نصب العین تھا۔ افتراقی امتیازات سے وہ پرہیز کرتے تھے۔ مذہبی رسوم، ضوابط اُن کو نہیں ستاتے تھے۔ مگر رفتہ رفتہ یہ باطنی خصوصیات کم ہوتے گئے ظاہری لباس نے اُن کی جگہ لے لی۔ دراز گیسو، تسبیح، گیروا بستر وغیرہ صوفی کے پہچان بن گئے اور وہ کیفیت اُن سے مٹ گیا جو اُن کا طرۂ امتیاز تھا۔ ہمارے

نشاطؔ اس کے خلاف کس خوبی سے احتجاج کرتے ہیں ؎

کس کا کعبہ؟ کیسا کلیسا؟ کون حرم ہے؟ کیا احرام؟
اس کوچے کے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا

ہے تو سیدھی ہی منزلِ مقصود — سنگ رہ ہیں یہ سبحہ و زنار

اپنے بتخانوں میں سجدے ایک کعبہ کے عوض

کفر تو اسلام سے بڑھ کر ترا گرویدہ ہے

برہمن نالۂ ناقوس مسجد تک تو پہنچا دے
برا کیا ہے موذن بھی اگر بیدار ہو جائے

ایک صوفی کو مادی چیزوں سے کوئی مسرت نہیں حاصل ہوتی۔ اسکی نظر بہت ارفع ہوتی ہے۔ اس کی نظریں ایک ایسی چیز کو تکتی ہیں جو ساری خوبیوں کی منبع ہے۔ وہ اس تصور میں اچھل اچھل پڑتا ہے، مستغرق ہو جاتا ہے اور بار بار ماسوا سے بیزار ظاہر کرتا ہے۔ اردو شعرا نے یہ خیال اس طرح ظاہر کیا ہے ؎

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ — دوزخ میں ڈال دے کوئی لیکر بہشت کو

جنت میں خاک بادہ پرستوں کا دل لگے
نقشے نظر میں صحبتِ پیرِ مغاں کے ہیں

صوفی کو شعر سے بڑا تعلق ہوتا ہے۔ اس کے دل میں جذبات موجزن ہوتے ہیں۔ وہ اسے تسکین دینے کے لئے شعر پڑھتا اور گنگناتا ہے، وہ گانا سنتا ہے، وہ شرابی نہیں ہوتا، لیکن ایک ایسے نشہ میں مخمور رہتا ہے کہ شراب، خمار، ساقی، جاناں، اس میں ایک کیف پیدا کرتے ہیں۔ وہ اس شراب کا متلاشی ہوتا ہے جو عقل کو دور نہ کرے بلکہ جس کے ذریعہ سے ایسی بصیرت پیدا ہو کہ وہ فنا اور بقا کی اصلی تصویر کو دیکھ لے۔ چنانچہ مرزا غالبؔ صحیح فرماتے ہیں ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کے بغیر

ہمارے شعراء کا معرفت کے اظہار میں یہی انداز رہا ہے فرماتے ہیں ؎

بڑی احتیاط طلب ہے یہ، جو شراب ساغرِ دل میں ہے
جو چھلک گئی تو چھلک گئی، جو بھری رہی تو بھری رہی
اس نے ساغر کو اچھالا تھا کسی دن درمِ کیف
بن گیا عالمِ ہستی ہمہ تن عالمِ کیف۔

صوفی فی الحقیقت صحیح معنوں میں نہ صرف شاعر ہوتا ہے بلکہ شاعر کا شاعر۔ حسن اس کے نظر کی انتہا، محبوب اس کا نظریہ، محویت، و فنائیت اس کے لطف کے میدان۔ اس لئے غزل اس کے خیالات کے اظہار کے لئے بہترین ذریعہ ہے کیونکہ غزل بھی محبت کے زبان میں ہوتی ہے اور اس کا تعلق حسن و عشق ہی سے ہے اور جتنا ہی حسن و عشق کے مراتب کا اظہار اچھوتے الفاظ میں ایک غزل میں ہوتا ہے اتنی ہی وہ غزل بہتر سمجھی جاتی ہے لیکن متاخرین نے اور صنفِ شاعری میں بھی معرفت و تصوف کی موتیاں پروئی ہیں جن میں خاص طور پر اقبالؔ اور محسنؔ کاکوروی قابلِ ذکر ہیں۔ فارسی میں تصوف کے مسائل کو جس طرح مولانا رومؔ نے اپنی مثنوی میں بیان فرمایا ہے کوئی کیا بیان کرے گا اور اس مثنوی کا جو اثر دل و دماغ پر ہوتا ہے وہ کسی اور انسانی شاہکار سے ممکن نہیں۔

اردو شاعری کی ابتدا تصوف سے ہوئی اس لئے کہ اس وقت شعراء سب تصوف کے دریا میں غوطہ زن تھے اور معرفت کے منازل کے اشارے شعر کی جان سمجھے جاتے تھے۔ غالبؔ تک تو بالکل یہی انداز رہا بلکہ خود غالب نے تصوف کے مسائل ایسے نادر پیرایہ میں ظاہر کئے ہیں اور فلسفۂ حقیقت کی ایسی تصویر دکھلائی ہے کہ جس کی نظیر نہیں ملتی۔ یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ شعراء جو معرفت کے کلام میں ممتاز ہیں وہ صوفی بھی ہیں۔ خود غالب صوفی نہ تھے چنانچہ خود کہتے ہیں۔ ؎

یہ مسائلِ تصوف یہ تیرا بیان غالبؔ   تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

اس دَور کے بعد بھی تصوّف کا اثر کافی رہا لیکن بعض ممتاز شعراء میں صوفیانہ رنگ زیادہ نمایاں ہونے لگا اور اس کا اثر عام شاعروں پر پڑا۔ اس کے بعد تغزل نے ایک ورق پلٹا اور فلسفۂ محبت کی بلند پائیگی کی طرف شعراء کی توجہ ہوئی جس کا سہرا متاخرین میں خاص طور پر چکبست۔ اکبر۔ حسرت۔ فانی۔ جگر اور جوش کے سر پر ہے۔ ان میں سے بعض کے اشعار ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:

تپشِ شوق کو موسیٰ کی نظر ہے درکار ورنہ دنیا میں تجلی نہیں یا طور نہیں
(چکبست)

ایک صوتِ سرمدی ہے جس کا اتنا جوش ہے
ورنہ ہر ذرّہ ازل سے تا ابد خاموش ہے (اکبر)

ہمارے شعراء کے معرفت کے کلام کا اثر زندگی پر ایسا نہیں پڑا جس سے ان میں اصلی تصوّف پیدا ہو یا کشاکشِ حیات میں وہ مفید ثابت ہوں۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ ایک طرف تو ہماری غزلیں جو ہماری شاعری کا خلاصہ ہیں یاس، حرماں، رقابت وغیرہ کے تخیل سے بھری تھیں، دوسری طرف قدیم مذہبوں کا یہ خیال ان کے معرفت کے کلام کا آئینہ بنا رہا کہ انسانی کمال صرف ترکِ دنیا سے حاصل ہو سکتا ہے۔ نیز یہ کہ ہمارے غزل گو شعراء نے محاسنِ اخلاق میں سے صرف چند محدود اخلاق مثلاً استغنا و بے نیازی، قناعت، بے ثباتی اور خاکساری وغیرہ انتخاب کیا کیونکہ شاعری میں اخلاق کا جو سرمایہ ہے وہ تصوف کے ذریعہ آیا ہے۔ لہٰذا ان سب کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ہم میں انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے قنوطیت اور سرد مہری پیدا ہوئی۔ اقبال نے سب سے زیادہ اسکے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور اُس نے تصوّف کا وہ تخیل پھر زندہ کیا جس سے ہم میں رجائی کیفیت اور ہمارے خون میں گرمی پیدا ہونے لگی۔

اقبال کی شاعری حسرت و یاس سے پاک ہے وہ نہ مایوس ہوتا ہے اور نہ دوسروں کو مایوس ہونے دیتا ہے۔ وہ انسان کو خود شناس بنانا چاہتا ہے۔ اور کہتا ہے "سے دو سالہ ہیچ ہے" اور "معشوق چار دہ سالہ ہیچ" نارِ جہنم اور باغِ جناں

ہیچ ہے، اور حور و غلمان ہیچ۔ جو کچھ ہے وہ تمہاری زندگی ہے۔ اپنے آپ کو دیکھو اور بے خوف بڑھتے چلو۔ دوسرے شعراء کہتے ہیں کہ ہماری ہستی مستعار شبنم کے ایک قطرے کی مثال ہے کہ ابھی تھا اور ابھی نہیں۔ اقبال کہتا ہے کہ ہم قطرۂ شبنم ہی سہی لیکن یہ قطرہ ایک بحرِ ذخار ہے، کہکشاں جس کا ساحل ہے۔ اس قطرہ نما قلزم کی اگر چھوٹی سی موج بھی جوش میں آجائے تو ساحلِ کہکشاں کے اس پار چلی جائے اور طوفان اور طغیان کی وہ قیامت برپا ہو کہ زمین و آسمان اور کون و مکان بلکہ لامکان تک کو بہا لے جائے۔ چنانچہ اقبال کہتا ہے ؎

کیوں چمن میں بے صدا مثلِ رمِ شبنم ہے تو — لب کشا ہو جا سرودِ بربطِ عالم ہے تو
بے خبر تو جوہرِ آئینۂ ایام ہے — تو زمانہ میں خدا کا آخری پیغام ہے
اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے — سرِ آدم ہے ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی

اردو شاعری نے کہاں تک لوگوں پر تصوف کا اثر پیدا کیا، اس کا ابھی جائزہ لینا بہت مشکل ہے۔ کیونکہ تھوڑے دن پہلے تک تو صوفیوں پر فارسی شاعری کا اتنا زیادہ اثر تھا کہ ان کے حلقے میں زیادہ تر فارسی کے اشعار پڑھے جاتے تھے اور قوال انھیں کو گاتے تھے خصوصاً امیر خسرو۔ جامی اور حافظ کے اشعار لیکن اب اردو کا کلام قوالیوں میں بہت سنا جاتا ہے۔ اور چونکہ حال میں بعض صوفیائے کرام ایسے گذرے ہیں جن کے معرفت کا کلام خاص طور پر اثر پذیر ہے اس لیے اس کا چرچا بڑھتا جاتا ہے۔ اس ضمن میں خاص طور پر حضرت امیر مینائی اور مولانا عبدالعلیم آسیؔ قابلِ ذکر ہیں۔

اردو کا کلام خاص کر غزل جہاں پریم اور محبت کے پیام دینے میں کسی زبان سے پیچھے نہیں ہے اسی طرح معرفت کے جواہر ریزوں سے پر ہے۔ غواص ہوں تو ڈھونڈھنے میں دشواری نہیں اور عزم ہو تو اس کے رٹ سے قربِ الٰہی مل سکتا ہے اور انسان انسانِ کامل بن سکتا ہے۔

ڈاکٹر سید نجم الدین جعفری

نواب جعفر علی خاں اثر کی شاعری میں فلسفہ اور تصوف

ہندوستان کے دورِ حاضر میں شعراء کی کچھ کمی نہیں ہے۔ ان میں سے چند حضرات تو ایسے ہیں جو شعر و سخن کے قدیم اصناف پر ہی طبع آزمائی کرنے پر قناعت کرتے ہیں، مگر بعض ایسے بھی ہیں جنھوں نے اُس راہ سے جدا ہو کر اپنے لیے ایک نئی راہ پیدا کر لی ہے اور اُسی پر گامزن ہیں۔ نواب جعفر علی خاں اثر میں قدیم اور جدید دونوں طرز کے رنگ موجود ہیں۔ ان کی زبان خالص ٹکسالی ہے اور دورِ متوسط کے شعراء کی طرح عیوب و نقائص سے پاک۔ گو وہ قدماء میں سے میر، سودا اور درد کے مداح ہیں۔ مگر ان کی پرانی روش پر ہمیشہ نہیں چلتے بلکہ جب جب اور جہاں جہاں چاہتے ہیں اپنی آزادیِ خیال اور پروازِ فکر میں اپنا خاص رنگ اختیار کر لیتے ہیں، انھیں انسان کی قدر و قیمت اور منزلت کا صحیح اندازہ ہے۔ انسان کی ترقی اور اس کی شان کی رفعت و بلندی میں ان کا اعتقاد نہایت راسخ ہے۔

جناب اثر کے کلام کے غائر مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں حیاتِ انسانی میں ایک فلسفیانہ بصیرت حاصل ہے، اور یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے انسان کی خلقت اور اُس کے مآل و انجام کے مسائل پر کمال دقتِ نظر سے غور و خوض کیا ہے۔ ان کے شاعرانہ تخیل نے ان کے تصورات اور تخیلات کو پرواز دے کر اُن بلند و بالا مقامات پر پہنچا دیا ہے جو وسعتِ نظر کے ماورا ہیں، جہاں الفاظ کی کوئی حقیقت اور اظہار کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی! یہ وہ مقام ہے جہاں بصیرت خود افروز ہو جاتی ہے اور جو زمان و مکان کی قیود اور حدود سے دور، بہت دور ہے!

جناب اثرؔ نے انسان کی ساخت، انسان اور فطرت کے تعلق اور روزمرہ کی زندگی میں اخلاقیات کے اقدار کی عدم موجودگی کے باب میں جس جس اسلوب سے اظہار خیال کیا ہے، اور انسان کی عیب بینی اور منافقت کی عادتوں پر جس خوبی سے اپنا غم و غصہ ظاہر کیا ہے، وہ اس قدر لگتا ہوا اور خیال افزا ہے کہ بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

مشرق و مغرب کے تقریباً تمام مذاہبِ تصوف کا یہ عقیدہ ہے کہ جب تک انسان اپنے اوپر ایک وارفتگی کا عالم طاری کر کے اپنے تمام علائق دنیوی سے بلند نہ ہو جائے اور اپنی شخصی اور جداگانہ حیثیت کے احساس پر پوری طرح غلبہ حاصل نہ کر لے، وہ احساسِ حق اور ربوبیت باری تعالیٰ کا اہل نہیں ہو سکتا۔ وہ ذات نا محدود محض غیر مرئی اور قطعاً ناقابل اندازہ ہے اور وہ ہی ہماری ہستی کا حقیقی منبع ہے۔ وہ زمان و مکان سے ماوراء ہے۔ اسی کو عیسائی انداز میں یوں کہا گیا ہے کہ "جس نے اپنی زندگی کو فنا کیا وہ ہی باقی رہتا ہے"۔ یہ نصب العین کہ انسان خود فراموشی ہی کی وساطت سے معرفتِ نفس حاصل کر سکتا ہے، کمال ایجاز کے ساتھ اس شعر میں ادا ہوا ہے:

ؔ دکھا لائی اثرؔ تجھے بے خودی
وہ عالم جہاں کوئی عالم نہیں

ہمارا ایک رشتۂ انسانیت میں منسلک ہونا ایک ایسا امر ہے جس کا اعتراف تو اکثر اہل فکر نے کیا ہے، مگر روزمرہ کے معاملات میں اسے ماننے والے معدودے چند افراد ہی ہوتے ہیں۔ لوگ اس کے فلسفے اور اس کے مذہبی مفہوم پر بڑے شد و مد سے گفتگو کیا کرتے ہیں، مگر جب وہ کسی انسان کو مصیبت میں مبتلا دیکھتے ہیں تو اس نوعی ہمدردی کا ثبوت دینے سے قاصر رہتے ہیں۔ اثرؔ نے اس نصب العین کو متانت پر زور طور پر اپنے ایک شعر میں یوں ادا کیا ہے:- ؎

ایماں غلط، اصول غلط، ادّعا غلط   انساں کی دل دہی اگر انساں نہ کر سکے

ارباب تصوف کا ایک نہایت قدیم اور مقبول مقولہ ہے کہ مَن عَرَفَ نَفسَہٗ فَقَد عَرَفَ رَبَّہٗ۔ امیر المومنین حضرت علی بن ابوطالب کا ارشاد عالی ہے کہ معرفتِ حق کے لئے معرفتِ نفس لازمی ہے۔ رفیع تر نفس انسانی، جو تمام قیود سے آزاد ہو، وجود باری تعالیٰ کے طرف ایک خاص کشش، ایک جذب نہیں بلکہ ایک وحدت محسوس کرتا ہے۔ عموماً انسان کو اپنی الٰہی فطرت کا کوئی علم نہیں ہوتا۔ وہ اس وہم میں مبتلا رہتا ہے کہ وہ اس قدر کمزور اور نزار ہے کہ وہ کسی اخلاقی یا روحانی بلندی تک نہیں پہنچ سکتا۔ مگر جب اُسے اپنی رفیع خودی کا احساس ہوتا ہے تو اُسے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بے شمار امکانات موجود ہیں اور وہ معرفتِ نفس بھی حاصل کر سکتا ہے۔ اُس وقت اُسے اس کا احساس ہوتا ہے کہ اس اثناء میں خود اس کے لاعلمی اور اس کا اپنی قدر و قیمت کو نہ سمجھ سکنا اُس کے راہ میں حائل تھا۔ یہ خیال اکبرؔ کے اس شعر میں کمال حسن کے ساتھ ادا ہوا ہے: ؎

جسے ڈھونڈتا ہے تو اپنے سے باہر تجھی میں ہے اے بے خبر، ہاں تجھی میں

اے بندۂ اوہام کدھر دھیان ہے تیرا؟
اے مردِ خدا خود طلبی حق طلبی ہے!

یہ خوب سمجھ لینا چاہئے کہ اکبرؔ کے مُراد اس خودی سے وہ خودی ہے جسے صوفیاء کے اصطلاح میں "انانیتِ حقیقی" کہتے ہیں نہ کہ انانیتِ تخصی۔ ظاہر ہے کہ وہی شخص معرفتِ الٰہی حاصل کر سکتا ہے جسے معرفت نفس کے لئے طلب صادق نصیب ہو۔

حیاتِ روحانی اور فنا فی اللہ کے حقیقی ابتداء ترک سے ہوتی ہے۔ حقیقتِ باری تعالیٰ سے بلند تر کوئی چیز نہیں ہے۔ اس کے حضور میں پہنچ کر تمام ارضی اشیاء، خواہ وہ کیسی ہی عظیم اور رفیع ہوں، اپنے اقدار کو گم کر دیتی ہیں۔ وہ ہی تمام حیات، شان اور عظمت کا سرچشمۂ حقیقی ہے۔ وہ اعلیٰ ہے، بے مثل ہے، ارفع ہے۔ حیاتِ روحانی کے اسی اصل اصول کو مدِّنظر رکھ کر

اثرؔ نے اپنے محسوسات کا یوں اظہار کیا ہے۔ ؎

خیال اُس جانِ جاں کا ہے تو ہر رفعت کو ٹھکرا دے
نظر ہی حد سہی، پرواز کی حد آسماں کیوں ہو!

انسان کو حیات الٰہیہ میں بھی ایک حظ نصیب ہے۔ اس کی طبیعت کے جوہر میں خالقیت کی شان موجود ہے۔ اس جہان میں کوئی قابل قدر چیز ایسی نہیں ہے جس کی تعمیر پر وہ قادر نہ ہو۔ وہ مخلوقِ الٰہی میں اشرف و اعلیٰ ہے یہ حقیقت، کہ انسان میں بے شمار قوتیں مُضمر ہیں، ہمارے شاعر کے اس شعر میں ادا کی گئی ہیں: ؎

خدا معلوم کتنے گلستاں میں نے بنا ڈالے
خس و خاشاک کی تعمیر میرا آشیاں کیوں ہو

اس قول کو سُن کر معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا حقیقی وقار کس قدر وزنی ہے اور اُس میں کیسی کیسی قوتیں اور کیسے کیسے نامعلوم امکانات مُضمر اور مخفی ہیں!

انسان کا اوّلین اور آخرین فرض خود شناسی اور خود آگاہی ہے۔ اگر کوئی اپنا وقت اور اپنی طاقت اس بلند مرتبت تلاش میں صرف نہیں کرتا، تو اس نے اپنی زندگی رائگاں صرف کی، اور اُس کے ارضی زندگی کا مقصد فوت ہو گیا! اثرؔ نے کیا خوب کہا ہے: ؎

مقصود زندگی کا بیداریِ خودی ہے
اے بے خبر، وگرنہ بے سود زندگی ہے

انسان محض ایک ذرۂ خاک نہیں ہے، کہ آج معرضِ وجود میں آیا اور کل ہمیشہ کے لئے روانہ ہو جائیگا۔ اُس کی ظاہری شکل بدل سکتی ہے، غائب ہو سکتی ہے، مگر حقیقی انسان اور اس کی روح ایک باقی اور دائم چیز ہے، اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ انسان کی ہستی کے یہ متانت کس خوش اسلوبی اور وضاحت سے اس شعر میں بیان ہوئی ہے کہ: ؎

انسان روحِ اعظم، انسان وجہِ عالم — اور تم سمجھ رہے ہو صورت وہ مٹی کی ہے

ایک اور شعر میں انسان کے دوام کو یوں بیان کیا ہے: ؎

اک مستقل حقیقت، ناقابلِ تغیّر
ہستی جو یہ نہیں ہے، ہستی ہی نیستی ہے

بعض صوفیائے کرام اور ویدانتیوں کا عقیدہ ہے کہ کائنات میں صرف ایک ہی حقیقت ہے اور اس کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ وہی ایک سرمدی ذات ہے اور اُس کے ماسوا کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ ہمہ جا حاضر و ناظر ہے۔ اگر یہ عقیدہ تسلیم کر لیا جائے کہ اس تمام مرئی کائنات میں سوا "اس" کے کوئی شے حقیقی نہیں ہے۔ تو وجود اور عدم کا سوال ہی ختم ہو جاتا ہے۔ اس مسئلے کو اثرؔ نے شاعر کی زبان سے یوں ادا کیا ہے کہ: ؎

جب تو ہی تو ہے تو پھر غیب و حضوری کیسی
ایک ہی رنگ فنا اور بقا کا نکلا

ملک تبت کے ایک صوفی نے خوب کہا ہے کہ "تو خود اپنی ہی تلاش کا مدّعا ہے!" جب کوئی مرید اپنے سلوک کے آخری منزل پر پہنچ کر اُسی میں عافیت اور امن پاتا ہے، تو اُسے اپنی اس یافت پر حیرت ہوتی ہے کہ اس نے خود اپنے ہی بلند تر وجود کو پایا ہے! یہ تصوف کی اتنی بڑی حقیقت ہے جسے دنیا کے تمام بڑے بڑے صوفیہ نے تسلیم کیا ہے۔ اثرؔ اس خیال کو یوں ادا کرتے ہیں کہ: ؎

آپ اپنی آرزو ہے، آپ اپنی جستجو
جلوہ زارِ بیخودی میں لیلیٰ محمل کہاں!

موت و حیات کے مسئلے نے انسان کو ہمیشہ حیران و سرگرداں رکھا ہے۔ صرف اُنھیں نے موت کا استقلال اور دلیری سے مقابلہ کیا ہے، جن کو اس مسئلے میں ایک غائر بصیرت حاصل ہوئی ہے اور جنھوں نے تمام موجودات کے نبض میں حیاتِ دوام کو متحرک دیکھا ہے! اور وہی جانتے ہیں کہ موت ہماری ہستی کا انجام نہیں ہے بلکہ اس تمام گردش میں یہ محض ایک منزل ہے۔

ہر ذرّے میں نامحصور قوی پوشیدہ ہیں، اور اس کے آئندہ شان و شوکت نہایت رفیع و بلند ہے۔ تغیر اور تبدیلی کی کوئی انتہائی حد بھی اس کی افادیت اور ہستی کو بگاڑ نہیں سکتی۔ حیات ایک بہتا ہوا دریا ہے، جو کہیں ختم نہیں ہوتا، ہمیشہ جاری رہتا ہے، سدا قائم ہے، ازل سے ہے اور ابد تک رہیگا۔ اس نصب العین کو اس دلکش انداز سے واضح کیا ہے:۔ ؎

مستقبل تازہ ہے جو خاک کا ذرّہ ہے
جب زیست مسلسل ہے مرجانے کو کیا کہئے!

[یعنی یہ کہ موت سے پھر ڈر کیسا!]

راحت و رنج اور سرور و انبساط، سب انسان کی حیات کے گزرتے ہوئے نظارے ہیں۔ عقلمند آدمی ان دونوں سے بالاتر ہوتا ہے وہ جانتا ہے کہ اسکی حقیقی ذات ان چیزوں کے اثر کے ماوراء ہے، اور وہ سرور اور خوف کے گرفت سے باہر ہے۔ اس میں ایک سرمدی امن و راحت ہے اور تمام تغیر اور رنج و غم کے احاطے سے خارج ہے۔ اثرؔ نے ہمیں ان دھوکوں سے بچا کر بلند تر انجام کی طرف راغب کیا ہے۔ فرماتے ہیں: ؎

رہ گذرِ حیات میں کیسی خوشی، کہاں کا غم
ان سے بلند تر ہے تو اور یہ عارضی نہ دیکھ

غالب کا مشہور شعر ہے ؎

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

"دیدۂ بینا" وحدت میں کثرت اور کثرت میں وحدت دیکھتا ہے، ہستی علی الاطلاق کے سوا کسی کو ثبات و قیام نہیں۔ وہی ایک ذات واحد سب جگہ موجود اور نمایاں ہے۔ اس کا ہر جلوہ یکتا اور بے ہمتا ہے اور وہ آپ ہی اپنی نظیر ہے۔ حضرت اثرؔ کے خیال میں کثرت، "تکرار وحدت" کا دوسرا نام ہے۔ اس عمیق خیال کو کس بلیغ اور جامع پیرایہ میں ادا فرمایا ہے

جس کی تعریف حیطۂ بیان سے باہر ہے، فرماتے ہیں ؎

"وہ بھی ہے تکرارِ وحدت کہتے ہیں کثرت جسے
تیرا ہر جلوہ تیرے مانند یکتا ہو گیا"

عشق کا ماحصل یکسوئی ہے۔ عاشق کے دل و دماغ پر مطلوب کا خیال اس طرح حاوی ہو جاتا ہے کہ اُسے ماسوا مطلوب کسی اور ہستی کا ہوش نہیں رہتا اور یہی عشق کا کمال ہے، سوتے جاگتے اُٹھتے بیٹھتے، اگر عاشق کو کسی کا ہوش رہتا ہے تو وہ صرف اس کا مطلوب ہے، جس وقت یہ یکسوئی درجۂ کمال تک پہنچ جاتی ہے عاشق اپنی ذات اور ماحول کو محویت کے عالم میں یک لخت فراموش کر دیتا ہے، اُس کو اپنے تن بدن کا مطلق ہوش نہیں رہتا اس کے دل میں مطلوب کے سوا کسی دوسرے کی جگہ باقی نہیں رہتی اور نہ وہ کسی دوسری شے یا ہستی کا خیال ہی کر سکتا ہے، اس محویت کی حالت کو شاعر نے اپنے خاص انداز میں یوں ادا کیا ہے ؎

"کمالِ عشق ہوش ہے، کمالِ ہوش بے خودی
مٹا کے وہم نقشِ غیر۔ دخلِ غیر اُٹھا دیا"

یہ مسلم امر ہے کہ عبادات الٰہی خواہ وہ کسی مذہب کے مطابق ہو، اگر اُس میں خلوص شامل ہے تو وہ با اثر ثابت ہوتی ہے۔ خلوص دل سے جو شخص اپنے حقیقی محبوب کی بندگی میں اپنے اوقات بسر کرتا ہے خواہ وہ کسی حالت میں اور کہیں ہو اپنے منزلِ مقصود پر یقینی پہنچ کر فایز المرام ہوتا ہے۔ بندہ اور خدا کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں۔ خدا کا دیدار یا قربت حاصل کرنے کا بہترین اور آسان ترین ذریعہ خلوص ہے۔ جہاں یہ موجود ہے وہاں انسان کی روحانی مرادیں یقیناً بر آتی ہیں چنانچہ اس مضمون کو ہمارے بصیرت افروز شاعر نے کس خوبی سے ادا کیا ہے، فرماتے ہیں ؎

خلوصِ بندگی نے آستاں ترا بنا دیا
جہاں بھی ہم ٹھہر گئے، جہاں بھی سر جھکا دیا

اس عقلیت کے زمانے میں خدا شناسی کا ذکر نہیں۔ کوئی شخص ایسا بھی نہیں ملتا جو "خود آشنا" ہو، نری عقلیت کے پرستار اپنے زعم باطل میں صرف عقلیت ہی کو علم کے حاصل کرنے کا صحیح یا واحد ذریعہ سمجھتے ہیں، ظاہری علوم کے ذریعہ انسان عالم ظاہر کے حقائق اور نہ تک ابتک نہیں پہنچا۔ باوجود ادّعاے ہمہ دانی انسان خود اپنی حقیقت کو ابتک نہیں سمجھ سکا اور نہ یہ جان سکا کہ وہ کون ہے، کہاں سے آیا ہے، اور کہاں جائیگا، خودی کے پرستار اپنی انانیت حقیقی سے بالکل ناآشنا ہیں۔ اگر عقل کی بھول بھلیوں سے نکل کر خود اپنی ذات اور حقیقت کو پہچاننے کی کوشش کریں تو خود آشنائی اور خداشناسی دونوں کی معرفت سے فیضیاب ہو سکتے ہیں۔ جو شے اس منزل تک پہنچنے میں ہارج ہے اور جس نے انسان کو اپنے حقیقی منزل سے گمراہ کر رکھا ہے وہ یہ خیال ہے کہ عقل، کے سوا انسان کا کوئی دوسرا رہبر نہیں، وجدان، جس کو انگریزی میں Intution کہتے ہیں اور جس کی تشریح فرانس کے مشہور فلسفی برگساں نے کی ہے، یہ بھی حصول علم کا ایک ذریعہ ہے۔ اس خیال کو جامعیت کے ساتھ حضرت اثرؔ یوں ظاہر کرتے ہیں ؎

خداشناس ایک طرف، خود آشنا کوئی نہیں
خرد کی خیرہ چشمیوں نے راستا بھلا دیا

ظاہر میں انسان یہ سمجھتا ہے کہ اس عالم محسوسات کے علاوہ دوسرا کوئی عالم موجود نہیں۔ باطن کی اس کو مطلق خبر نہیں۔ وہ یہ بھی نہیں جانتا کہ عالم رنگ و بو کے سوا اور بہت سے عالم ہیں جن کے جلوے عالم ظاہر کی دل کشیوں سے بدرجہا زیادہ دل کش اور ہوش ربا ہیں۔ جس خوش نصیب شخص نے اپنی حقیقت کو پہچان لیا اور جس نے روحانی مدارج طے کئے ہیں اور جس کا "مذاق دید" کامل ہو چکا، ذات بحت کے گوناگون جلووں کو اُسی ذات کی خود نمائی کا پرتو سمجھتا ہے اور اس عالم حیرت میں محو ہو جاتا ہے اس بلند اور ناقابل بیان حالت کو حضرت اثرؔ یوں ادا کرتے ہیں ؎

مذاقِ دید کامل ہو تو پھر جلوے ہی جلوے ہیں
جہاں اندر جہاں ایک سلسلہ ہے خود نمائی کا

حضرت اقبال نے بھی انھیں عالموں کے وجود کی طرف اپنے مشہور شعر میں یوں اشارہ کیا ہے ؎

قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر   چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں

جن لوگوں کے ضمیر مردہ ہو چکے ہیں جن کو اپنی عزتِ نفس اور خودداری کا خیال باقی نہیں رہا وہ اکثر خدا کے خوف کے آڑ میں پناہ لیکر اپنی سچائی کا ثبوت اور اپنی صفائی کا اظہار کرتے ہیں گو اُن کا یہ ادّعا خلوص اور ایمان بالیقین پر نہیں ہوتا۔ خوددار انسان جو اپنے ضمیر کی آواز سنتا ہے اور اسی کی رہنمائی پر عمل کرتا ہے وہ خدا کو اپنے قول و فعل کی شہادت میں پیش نہیں کرتا اس حقیقت کا اظہار آتشؔ نے جس خوبی کے ساتھ کیا ہے اسکی تعریف ممکن نہیں ؎

بندے خدا کے، چھوٹا خوفِ خدا کہاں تک
لازم ہے آدمی کو اپنے سے آپ ڈرنا

اسی خیال کو ایک فارسی شاعر نے بھی اس طرح ادا کیا ہے ؎

نہ از جورِ رقیباں نہ ز جورِ یار می ترسم
مزاجِ نازکے دارم ز خود بسیار می ترسم

ہر زمانے میں مذہب کا دور دورہ رہا ہے۔ مذہب نے سماج اور تمدن کے ارتقاء میں کافی حصّہ لیا ہے۔ مذہب کی خدمات سے متشکک اور لاادری بھی انکار نہیں کر سکتا۔ آتشؔ جس مذہب کو مانتے ہیں وہ ظاہری مذہبی رسوم اور عقائد سے بالاتر ہے۔ وہ اس مذہب کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھتے جس میں اسکے حقیقی اور ضروری اجزاء پس پشت ڈال دئے جاتے ہیں صحیح معنوں میں مذہبی شخص نفس پرستی، مناقشات اور ذاتیات سے گریز کرتا ہے۔ فی زمانہ جس مذہب کو ہم دنیا میں دیکھ رہے ہیں وہ اس کی صحیح تصویر نہیں بلکہ اُسکا مسخ شدہ

چہرہ ہے چنانچہ آثرؔ صاحب بھی اسی کے حامی ہیں، فرماتے ہیں ؎

آثرؔ کا سلام ایسے مذہب کو جس میں
پرستش فقط نفس کی ہو رہی ہے

مسرّت کی تلاش میں ہر انسان سرگرداں اور پریشان رہتا ہے ابدی اور دائمی مسرّت کا حاصل کرنا ہر انسان کا پیدائشی حق ہے انسان مسرّت کی تلاش کرتا ہے مگر عارضی اور پایندہ مسرّت میں فرق نہیں کرتا۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ ملنے والی دل کشیاں جو ہر وقت نظر سے اوجھل ہو رہی ہیں ان کے سوا مسرّت کے حاصل کرنے کا اور کوئی ذریعہ نہیں۔ وہ حسّی اور ذہنی لذتوں ہی کا گرویدہ رہتا ہے۔ جب تک انسان ہوس رانی اور لذتوں کی پیروی ترک نہیں کرتا اس وقت تک حقیقی مسرّت کی منزل تک اس کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ حضرت آثرؔ کا یقین یہ ہے کہ ؎

مسرّت کے تو راز سے بے خبر ہے
مسرّت کو تیری ہوس کھو رہی ہے

اسی خیال کو ایک مشہور صوفی شاعر نے یوں ادا کیا ہے گویا آثرؔ کے اصلی خیال کی ترجمانی ہے یعنی

"اسیر لذتِ تن ماندہ دگر نہ ترا
چہ عیش ہاست کہ در ملکِ جاں مہیاست"

(ڈاکٹر محمد حفیظ سید)

اُردو ادب میں آبحیات کا درجہ

شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد عربی و فارسی کے جید عالم تھے سنسکرت اور بھاشا سے بھی واقف تھے۔ انگریزی شاعری کے رنگ اور انگریزی نثاری کے اسلوب کو خوب سمجھتے تھے۔ لسانیات کے ذوق پر ان کی تصنیف سخندان فارس شاہد ہے، اور ادبی تحقیق کے شوق پر آبحیات گواہ ہے۔ اس طرح اُن میں وہ تمام اوصاف جمع تھے جو کسی ادیب کی کامیابی کے ضامن ہو سکتے ہیں۔ انھوں نے اُردو شعر و ادب کے ذخیرے کا جائزہ لے کر ہمیں بتایا کہ اس میں کیا کیا خامیاں ہیں اور کن کن چیزوں کی کمی ہے اور خود ساری عمر ان خامیوں کو دور اور ان کمیوں کو پورا کرنے میں مصروف رہے۔

بہت سی کتابیں حضرت آزاد کی تصنیف سے ہیں۔ مگر جن کتابوں نے اپنے مصنف کا نام اور اُردو ادب کا مرتبہ بلند کر دیا وہ چار ہیں' آب حیات، سخندان فارس دربار اکبری، نیرنگ خیال۔ یہ گویا چار ستون ہیں کہ حضرت آزاد کی شہرت کا قصر رفیع انھیں پر قائم ہے۔ ان میں بھی جو شہرت آب حیات کو حاصل ہے وہ کسی دوسری کتاب کو میسر نہیں۔ اُردو شاعروں کے بیسیوں تذکرے موجود ہیں۔ اُن کے علاوہ اور بھی بہت سی کتابیں شعر و ادب کے متعلق لکھی گئی ہیں۔ لیکن اُردو کی ادبی کتابوں میں جتنے حوالے آب حیات کے ملتے ہیں اُن کے نصف بھی شاید کسی دوسری کتاب کے نہیں ملتے۔ اُردو زبان یا اُردو شاعری کی ابتدا اور ارتقا کے متعلق جب کوئی کچھ لکھنا چاہتا ہے تو اس کے لئے آب حیات کا مطالعہ ناگزیر ٹھہرتا ہے۔

اُردو شعرا کے بہت سے تذکرے آب حیات سے پہلے لکھے جا چکے تھے۔ مگر سب سے پہلے اسی کتاب نے اُن کی خامیوں کی طرف توجہ دلائی۔ آزاد آب حیات کے دیباچہ میں ان تذکروں کے متعلق لکھتے ہیں۔

"ان سے نہ کسی شاعر کی زندگی کی سرگذشت کا حال معلوم ہوتا ہے نہ اس کی طبیعت اور عادات واطوار کا حال کھلتا ہے۔ نہ اسکے کلام کی خوبی اور صحت وسقم کی کیفیت کھلتی ہے۔ نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے معاصروں میں اور اس کے کلام میں کیا نسبت تھی۔ انتہا یہ ہے کہ سال ولادت اور سال فوت تک بھی نہیں کھلتا۔"

زیادہ تر تذکروں میں شاعروں کے حالات بے حد مختصر ہیں اور ان میں صرف اتنی ترتیب ملحوظ رکھی گئی ہے کہ شاعروں کے تخلصوں کے ابتدائی حرفوں کا اعتبار کرکے ان کو حروف تہجّی کے تحت میں جمع کر دیا ہے۔ بعض تذکرہ نویسوں نے کل شعرا کو تین طبقوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ متقدمین، متوسطین، متاخرین، اور ہر طبقے کے شعرا کو پھر اسی طرح حروف تہجّی کے اعتبار سے یکجا کر دیا ہے۔

آب حیات اُردو شاعروں کا پہلا تذکرہ ہے، جس میں مصنف نے اردو کی کل شاعری پر نظر کرکے اس کو کئی عہدوں میں تقسیم کیا ہے۔ اور ہر عہد کی زبان اور خصوصیات شاعری بیان کرنے کے بعد اُس عہد کے نامی شاعروں کا حال اس تفصیل اور اِس خوبی سے لکھا ہے کہ اُن کی چلتی پھرتی بولتی چالتی تصویریں کتاب پڑھنے والوں کے سامنے آجاتی ہیں۔ اور ساتھ ہی وہ زمانہ اور وہ ماحول بھی نظروں میں پھر جاتا ہے۔ جس میں ان کی شاعری نے نشو نما پائی تھی۔ آب حیات کی یہی وہ حیرت انگیز خصوصیت ہے جس میں کوئی دوسری کتاب اُس کی شریک نہیں۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ اُردو کے قدیم شعرا سے متعلق جو واقفیت ہم کو ہے اور اُن سے ہم کو جو دلی تعلق ہے، وہ آب حیات ہی کے طفیل میں ہے۔ اگر یہ کتاب نہ ہوتی تو نہ میر سے ہم کو یہ عقیدت ہوتی نہ سودا کی ہماری نظر میں یہ وقعت ہوتی۔ میر اور سودا کے دیوان تو چھپے ہوئے موجود ہیں اس لئے ممکن تھا کہ کبھی کوئی صحیح المذاق اپنے ذاتی مطالعے کی بنا پر ان باکمالوں کے مرتبۂ شاعری کا کسی قدر اندازہ کرلیتا۔ مگر حاتم، مظہر، قائم، جرات،

رنگین، ضاحک، اور اسی طرح کے بہت سے شاعروں کا تو شاید کوئی نام بھی نہ لیتا۔ اب جو اُن کا نام ہر اردو داں کی زبان پر ہے تو یہ آبِ حیات ہی کی بدولت ہے۔ حضرت آزاد نے بالکل سچ لکھا ہے کہ

"سودا اور میر وغیرہ بزرگانِ سلف کی جو عظمت ہمارے دلوں میں ہے وہ آجکل کے لوگوں کے دلوں میں نہیں۔ سبب پوچھئے تو جواب فقط یہی ہے کہ جس طرح اُن کے کلاموں کو اُن کے حالات اور وقتوں کے واردات نے خلعت اور لباس بن کر ہمارے سامنے جلوہ دیا ہے اُس سے اربابِ زمانہ کے دیدۂ دل بے خبر ہیں۔ اور حق پوچھو تو انھیں اوصاف سے سودا سودا اور میر تقی میر صاحب ہیں۔"

آبِ حیات نے اردو کے قدیم شاعروں سے عام دلچسپی پیدا کر کے لوگوں میں ادبی تحقیق کا شوق اور اُردو شعر و ادب کی تاریخ لکھنے کا خیال پیدا کر دیا اور شاعروں کے حالات کے ساتھ اُن کے زمانے اور ماحول کی تصویر کشی کی ضرورت محسوس کروا دی۔

آبِ حیات نے تذکرہ نویسی کی بھی ایک نئی راہ نکال دی۔ صفیر بلگرامی کا تذکرہ جلوۂ خضر اور حکیم عبدالحئی کا تذکرہ گلِ رعنا دیکھئے۔ دونوں پر آبِ حیات کا پرتو صاف نظر آئے گا۔ خواجہ عبدالرؤف عشرت کے تذکرے آبِ بقا کا نام ہی بتا رہا ہے کہ اُس پر آبِ حیات کا کتنا اثر ہے۔

اُردو زبان کی تاریخ بھی آبِ حیات نے پہلے پہل پیش کی اور لسانی تحقیق کا راستہ دکھایا۔ اگرچہ آبِ حیات کے بعد کئی کتابوں میں اِس مضمون سے بحث کی گئی، لیکن آبِ حیات کا طرزِ بحث اب بھی بعض حیثیتوں سے بے نظیر ہے۔

اُردو زبان نے فارسی انشا پردازی سے جو فائدے اُٹھائے اُن کا اعتراف کرتے ہوئے اُن نقصانات کی طرف آبِ حیات ہی نے ہمیں سب سے

پہلے توجہ دلائی جو فارسی کی رنگین اور تخئیلی انشا پردازی کی تقلید سے اُردو کو پہنچے
اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو نثر جو استعارے اور مبالغے کی کثرت سے بوجھل ہو رہی تھی اُس میں سادگی اور اصلیت کی خوبیاں پیدا کرنا بہت کچھ آبِ حیات کا کام ہے۔ اس کتاب نے ایک طرف فارسی کی پُر تکلف انشا پردازی کا کھاشا کے سادہ، فطری اور پر زور اندازِ بیان سے مقابلہ کرکے اردو نثر کی اصلاح کی ضرورت سمجھائی اور دوسری طرف انشا پردازی کا ایک نیا اور بے نظیر طرز پیش کر دیا۔ یہ اصولی اور عملی تعلیم بہت مفید ثابت ہوئی۔ لوگوں نے آبِ حیات کے بنائے ہوئے اصول کو پیشِ نظر رکھا اور آبِ حیات کے اسلوبِ بیان کو اپنے لئے نمونہ بنایا۔ اُردو کے بہت سے نثاروں کے یہاں آبِ حیات کا اثر صاف نظر آتا ہے۔

اُردو نثر کی طرح اردو شاعری کی اصلاح میں بھی آبِ حیات کا بہت کچھ حصہ ہے۔ اردو شاعری خاص کر اردو غزل کے نقائص کی طرف سب سے پہلے آزاد ہی نے توجہ دلائی۔ آبِ حیات کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

"یہ اظہار قابلِ افسوس ہے کہ ہماری شاعری چند معمولی مطالب کے پھندوں میں پھنس گئی ہے، یعنی مضامین عاشقانہ، میخواری مستانہ، بے گل و گلزار وہمی رنگ و بو کا پیدا کرنا، ہجر کی مصیبت کا رونا، وصلِ موہوم پر خوش ہونا، دنیا سے بیزاری، اسی میں فلک کی جفاکاری۔ اور غضب یہ ہے کہ اگر کوئی اصل ماجرا بیان کرنا چاہتے ہیں تو بھی خیال استعاروں میں ادا کرتے ہیں۔ نتیجہ جس کا یہ کہ کچھ نہیں کر سکتے ہیں۔"

اسی سلسلے میں ایک اقتباس اور پیش کیا جاتا ہے:۔

"اردو والوں نے بھی آسان کام سمجھ کر اور عوام پسندی کو غرض ٹھہرا کر حسن و عشق وغیرہ کے مضامین کو لیا اور اس میں کچھ شک نہیں کہ جو کچھ کیا بہت خوب کیا۔ لیکن وہ مضمون بقدر

مستقل ہو گئے کہ سنتے سنتے کان تھک گئے۔ وہی مقرری
باتیں ہیں، کہیں ہم لفظوں کو پس و پیش کرتے ہیں، کہیں اُدل
بدل کرتے ہیں اور رکھے جاتے ہیں۔ گویا کھائے ہوئے بلکہ
اوروں کے چبائے ہوئے نوالے ہیں، اُنھیں کو چباتے ہیں اور
خوش ہوتے ہیں۔ خیال کرو اس میں کیا مزا رہا۔ حسن و عشق
سبحان اللہ! بہت خوب! لیکن تا بہ کے؟ حور ہو یا پری گلے کا
ہار ہو جائے تو اجیرن ہو جاتی ہے۔"

کچھ دنوں سے اردو غزل گوئی کے خلاف جو آوازیں بلند کی جارہی ہیں وہ آزاد کے اِنھیں بیانوں کی صدائے بازگشت ہیں۔

آبِ حیات ایک طرف اردو شاعری کے ارتقا کی تاریخ پیش کرتی ہے تو دوسری طرف ہماری سوسائٹی، بالخصوص اس کے علمی و ادبی پہلو کا ایسا مکمل نقشہ دکھاتی ہے جس کی نظیر کوئی دوسری تصنیف پیش نہیں کرسکتی۔ حضرت آزاد جس وقت اردو زبان اور اردو شاعری کے مختلف ارتقائی دوروں پر نظر کر رہے تھے اور ہر دور کے ممتاز شعرا کے حالات لکھ رہے تھے اس وقت جو سماں اُن کے پیش نظر تھا اُس کا بیان اُنھیں کی زبان سے سنئے۔ فرماتے ہیں:-

"اِس زبان کے رنگ میں اُن کے رفتار، گفتار، اوضاع، اطوار، بلکہ اُس زمانے کے چال چلن پیش نظر تھے، جس میں اُنھوں نے زندگی بسر کی اور کیا کیا سبب ہوئے کہ اس طرح بسر کی۔ اُن کے جلسوں کے ماجرے اور حریفوں کے دھکے جہاں طبیعتوں نے تکلف کے پردے اُٹھا کر اپنے اصلی جوہر دکھا دیے، اُن کے دلوں کی آزادیاں، وقتوں کی مجبوریاں، مزاجوں کی شوخیاں، طبیعتوں کی تیزیاں، کہیں گرمیاں، کہیں نرمیاں، کچھ خوش مزاجیاں، کچھ بے دماغیاں، غرض یہ سب باتیں میری

آنکھوں میں اِس طرح عبرت کا سرمہ دینی تھیں گویا وہی زمانہ
اور وہی اہل زمانہ موجود ہیں۔"

حضرت آزاد نے اس سماں کی تصویر لفظوں میں اس طرح کھینچ دی کہ "وہی زمانہ اور وہی اہل زمانہ" ہماری نگاہوں کے سامنے بھی آموجود ہوئے ہیں۔ تصویرکشی کا یہ کمال اردو کے کسی اور مصنف کو بھی نصیب ہوا ہے؟ مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب کے دوتین مضمون یعنی ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی۔ مولوی وحیدالدین سلیم پانی پتی، ۱۲۶۱ھ کا ایک مشاعرہ، اسی طرز کے ہیں۔ کچھ عجب نہیں کہ مرزا صاحب نے یہ طرز آب حیات ہی سے سیکھا ہو۔

آب حیات جس زمانے میں لکھی گئی وہ اس نوعیت کی کتاب کی تالیف کا آخری موقع تھا۔ حضرت آزاد نے اِس حقیقت کو سمجھ کر اُس موقع سے ایسا فائدہ اُٹھایا جو اُنھیں کا ساجامع صفات مصنف اُٹھا سکتا تھا۔ اگر چہ وہ موقع نکل جاتا تو پھر ایسی کتاب کبھی وجود میں نہ آسکتی۔ اس سلسلے میں خود حضرت آزاد فرماتے ہیں:—

"چونکہ میں نے بلکہ میری زبان نے ایسے ہی اشخاص کی خدمتوں میں پرورش پائی تھی اس لئے ان خیالات میں دل کی شگفتگی کا ایک عالم تھا جس کی کیفیت کو کسی بیان کی طاقت اور قلم کی زبان ادا نہیں کرسکتی۔ لیکن ساتھ ہی افسوس آیا کہ جن جوہریوں کے ذریعے سے یہ جواہرات مجھ تک پہنچے، وہ تو خاک میں مل گئے۔ جو لوگ باقی ہیں وہ بجھے چراغوں کی طرح ایسے ویرانوں میں پڑے ہیں کہ ان کے روشن کرنے کی یا اُن سے روشنی لینے کی کسی کو پروا نہیں۔ پس یہ باتیں کہ حقیقت میں انبات اُن کے جوہر کمالات کے ہیں۔ اگر اسی طرح زبانوں کے حوالے رہیں تو چندروز میں صفحۂ ہستی سے مٹ جائیں گی۔ اور حقیقت میں یہ حالات نہ مٹیں گے

بلکہ بزرگانِ موصوف دنیا میں فقط نام کے شاعر رہ جائیں گے، جن کے ساتھ کوئی بیان نہ ہوگا، جو ہمارے بعد آنے والوں کے دلوں پر یقین کا اثر پیدا کر سکے۔ ہر چند کلام اُن کے کمال کی یادگار موجود ہیں، مگر فقط دیوان جو بکتے پھرتے ہیں، بغیر اُن کے تفصیل حالات کے اِس مقصود کا حق پورا پورا نہیں ادا کر سکتے، نہ اُس زمانے کا عالم اس زمانے میں دکھا سکتے ہیں۔ اور یہ نہ ہوا تو کچھ بھی نہ ہوا۔[۱]

حضرت آزاد نے یہ کتاب لکھ کر ہماری معاشرتی اور ادبی تاریخ کے نہایت اہم پہلوؤں کو ابدی گمنامی سے بچا لیا۔ جب میں حضرت آزاد کی اس عظیم الشان خدمت کا تصور کرتا ہوں تو میرے دل میں احسانمندی کے جذبات کا ایک دریا موجیں مارنے لگتا ہے۔ میر تقی میر کے رسالے فیضِ میر کا مقدمہ جو راقم الحروف نے لکھا ہے اس کی کچھ عبارت جو آبِ حیات سے متعلق ہے یہاں نقل کی جاتی ہے:۔

"حضرت آزاد نے آبِ حیات میں معلومات کا وہ انبار لگا دیا ہے، جو تنگ نظر نگاہوں میں سما نہیں سکتا۔ اور اُن کی تحقیق کی وسعت اور جامعیت کا یقین کرنے سے زیادہ آسان یہ معلوم ہونے لگا ہے کہ اُن کے اکثر بیانوں کا من گھڑت افسانوں میں شمار کر لیا جائے۔ کوتاہ نظری اور تنگ ظرفی نے ایک ایسی جماعت پیدا کر دی ہے جس نے آزاد پر جا بیجا اعتراض کر دینا اپنی وضع میں داخل کر لیا ہے۔ لیکن دور بین نگاہیں دیکھتی ہیں کہ یہ حالت بہت دنوں تک قائم رہنے والی نہیں ہے۔ ادبی تحقیق کا ذوق اب ہمارے دلوں میں گھر کر رہا ہے، اور اپنے ادبی دفینوں کی تلاش میں خاک چھاننے کی دُھن پیدا ہو چلی ہے۔ یہ ذوق ذرا اور پختہ اور یہ دُھن

کچھ اور پکی ہوئے اور تحقیق کے راستے کی مصیبتوں اور خطروں کا احساس عام طور پر ہونے لگے تو یہ عارضی آزاد بیزاری بتدریج آزاد پرستی میں تبدیل ہو جائے گی۔ اس وقت بھی ادبی تحقیق میں آزاد ہی کو یہ مرتبہ حاصل ہے کہ اُن سے اختلاف کرنا محقق ہونے کی سند سمجھا جاتا ہے۔"

"آزاد کے خلاف جو بدظنی پھیل رہی اور پھیلائی جا رہی ہے اُس کا نتیجہ یہ ہے کہ جہاں آب حیات میں کسی ایسی چیز کا ذکر دیکھا جو ہماری دسترس سے دور یا ہمارے علم سے باہر ہے اُس کو آزاد کا گڑھا ہوا افسانہ سمجھ لیا۔ آزاد کی تحقیق میں غلطیاں ممکن ہیں اور کسی محقق کو غلطیوں سے مفر نہیں۔ لیکن جو لوگ تحقیق کی غلطی اور افسانے کی تصنیف کا فرق سمجھتے ہیں اُن کی نظر میں آزاد محقق ہی ٹھہرتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ آزاد تحقیق کو افسانے سے زیادہ دلچسپ بنا سکتے ہیں۔ انشاپردازی کا یہ کمال اگر کسی اور کے حصے میں نہ آیا ہو تو آزاد سے نہیں فطرت سے لڑنا چاہیئے۔"

آب حیات کی غیر معمولی شہرت اور مقبولیت کا بعض طبیعتوں پر عجیب اثر پڑا۔ انھوں نے آب حیات میں غلطیاں نکالنا شروع کر دیا، اور کتاب کو غیر مستند ثابت کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ اگرچہ اس سلسلے میں بہت سے بے بنیاد اعتراض کیے گئے جنھوں نے اعتراض کرنے والوں کی ناواقفیت اور کوتاہ نظری کی قلعی کھول دی، مگر کچھ مفید کام بھی ہو گیا۔

ہم نے ابھی کہا ہے کہ کسی محقق کو غلطیوں سے مفر نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت آزاد کے یہاں بھی غلطیاں ہیں۔ مگر وہ غلطیاں بھی ایسی ہیں جیسی ایک محقق ہی سے ہو سکتی ہیں، اور جن کی بنا تحقیق ہی پر ہے۔ ان غلطیوں کی بنا پر کسی کتاب کو کُلیتہً پایۂ اعتبار سے ساقط کر دینا اور اس کے مصنف کی عرق ریزیوں اور جانفشانیوں پر پانی پھیر دینا بے دردی بھی ہے اور جہالت بھی۔ ایک نافہم نے

آب حیات میں بعض غلطیاں دیکھ کر حضرت آزاد کے متعلق ایسی بدتمیزی اور دریدہ دہنی سے کام لیا ہے جس سے ہمدردی کا دل دُکھ جاتا ہے اور انصاف کی آنکھوں میں خون اُتر آتا ہے۔ پھر لطف یہ ہے کہ یہ غلطیاں بھی زیادہ تر فرضی ہیں، حقیقی نہیں۔ خدائے سخن حضرت میر کا حال جو آب حیات میں لکھا گیا ہے اُس پر کئی اعتراض کئے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر اُنھیں اعتراضوں کو لے لیجئے اور دیکھئے کہ آزاد کے جن بیانوں سے وہ متعلق ہیں وہ تحقیق پر مبنی ہیں یا نہیں۔

آزاد نے میر کے والد کا نام میر عبداللہ لکھا ہے۔ معترض کہتے ہیں کہ یہ آزاد کی گڑھنت ہے، کیونکہ میر نے اپنی خود نوشتہ سوانحِ عمری ذکرِ میر میں اپنے والد کا نام میر تقی بتایا ہے[1]۔ اس اعتراض کے جواب میں عرض ہے کہ کسی محقق کے لئے اس کے سوا چارہ ہی کیا ہے کہ زیرِ تحقیق موضوع کے متعلق جو ماخذ اس کے وقت میں موجود اور اُس کی دسترس کے اندر ہوں اُن سے کام لے۔ ذکرِ میر حضرت آزاد کی نظر سے نہیں گزری تھی اُن کو اور اُن کے بعد ایک مدت تک کسی کو بھی اس کتاب کے وجود کا علم نہ تھا۔ اُنھوں نے میر کے تصانیف کے سلسلے میں ذکرِ میر کا ذکر بھی نہیں کیا ہے۔ البتہ آب حیات سے پہلے دو تذکرے ایسے موجود تھے جن میں میر کے والد کا نام دیا ہوا تھا یعنی

---

[1] یہ قول معترضوں کی سطح بینی کا ایک ثبوت ہے۔ میر نے ذکرِ میر کے ابتدائی حصے میں اپنے باپ کے متعلق لکھا ہے کہ "بہ خطاب علی متقی امتیاز یافت"، مگر کتاب کے وسطی حصے میں جہاں باپ کے انتقال کے بعد دہلی جانے اور خواجہ باسط کے توسط سے امیر الامرا نواب صمصام الدولہ کے پاس پہنچنے کا ذکر کیا ہے وہاں نواب کا ایک سوال اور خواجہ باسط کا جواب ان لفظوں میں لکھا ہے، "پرسید کہ ایں پسر از کیست؟ گفت از میر محمد علی است"۔ میر کے اِن دونوں بیانوں پر نظر کرنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اُن کے والد کا نام 'میر محمد علی' اور خطاب 'علی متقی' تھا۔

ناصر کا تذکرہ خوش معرکۂ زیبا اور محسن کا تذکرہ سراپا سخن۔ یہ دونوں تذکرے اس پر متفق ہیں کہ میر کے والد کا نام میر عبداللہ تھا۔ اس نام کو غلط سمجھنے کی کوئی وجہ بھی اس وقت موجود نہ تھی۔ اِن حالات میں کوئی بڑے سے بڑا محقق بھی اس نام کے سوا کوئی دوسرا نام نہیں لکھ سکتا تھا۔ اب اگر نئے ماخذوں کے ہاتھ آجانے کے بعد یہ نام غلط ثابت ہو جائے تو بھی آزاد کی تحقیق پر حرف نہیں آسکتا۔

ایک اعتراض یہ ہے کہ آزاد نے میر کو متکبر، خود بین، بد دماغ بنا دیا، حالانکہ خود میر کی تصنیفوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک منکسر مزاج شخص تھے۔ اس اعتراض کے جواب میں حکیم قدرت اللہ قاسم کی عینی شہادت پیش کی جاتی ہے۔ قاسم میر کے ہم عصر تھے، دلی میں رہتے تھے میر کے ساتھ مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔ اُن کا ضخیم تذکرہ مجموعۂ نغز میر کی زندگی میں مرتب ہو چکا تھا۔ وہ اس تذکرے میں میر کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"از کبر و غرورش چہ پردازم کہ حدے ندارد و از نخوت و خود سریش چہ بہ نگارم کہ سویدۂ قلم خطا در رقم فگارد۔ بر شعر کسے اگرچہ ہمہ اعجاز باشد و کلام شیخ شیراز باشد سر ہم نمی جنباند تا بہ تحسین زود چہ رسد۔ و بہ سخن احدے اگرچہ نظامی بود و گفتۂ اہلی شیرازی، گوش ہم فرا نمی دارد۔ امثال ایں است کہ حرف آفریں بر زبانش نرود"

شیخ مصحفی بھی میر سے ذاتی واقفیت رکھتے تھے اور اُن کو اردو کا سب سے بڑا شاعر مانتے اور انتہائی توقیر و تعظیم کا حق شناس تھے۔ اس کے باوجود اپنے تذکرے عقد ثریا میں ان کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"از بسکہ از ابنائے زمانہ بلکہ از ابنائے جنس خود پیچیدہ اند، از سخن کسے بپا ناکسی کہ در زبان جہان است او را بسخن خود غلط و اضافات آن قرار می کند"

انھیں مصحفی نے اپنے تذکرۂ ہندی میں میر کے بیٹے فیض علی فیض کے متعلق یہ جملہ لکھا ہے کہ "واللہ کہ حقا از عجیب پدر ہم دارد" میر حسن بھی میر کے شاعرانہ کمال کے بے حد معترف ہیں مگر اس حقیقت کے اظہار پر مجبور رہیں کہ "و لیکن بسیار صاحب دماغ است"

میر کے کئی ہم عصروں کے بیان آزاد کی تائید میں موجود ہیں مگر معترضوں کی نظر میں اتنی وسعت کہاں۔ انھیں تو اعتراض برائے دینے سے کام ہے۔

آزاد نے میر کے تذکرے نکات الشعرا کے متعلق لکھا ہے کہ جن شاعروں کا اس میں ذکر کیا گیا ہے اُن میں ایک بیچارہ بھی طعنوں اور ملامتوں سے نہیں بچا۔ ولی کہ بنی نوع شعرا کا آدم ہے اُس کے حق میں فرماتے ہیں۔ "وے شاعر یست از شیطان مشہور تر" معترض کہتے ہیں کہ آزاد کا یہ بیان ایجاد بندہ کا حکم رکھتا ہے اس لئے کہ نکات الشعرا میں نہ کل شاعروں کی مذمت کی گئی ہے۔ نہ ولی کے متعلق یہ جملہ لکھا گیا ہے۔ اس کا جواب بھی قائم ہی کی زبان سے سنئے۔ وہ میر کے حال میں لکھتے ہیں:-

"در تذکرۂ خود ہیچ کس را بہ بدی یاد کردہ۔ در حق شاعر
شان علی المتخلص بہ ولی نوشتہ کہ وے شاعریست از شیطان
مشہور تر۔ و سزائے این کردار ناہنجار از گستری شاعر
بواجبی یافتہ کہ ہجو ہائے متعددہ اد کرد، کہ بیشتر آن ہجا
رکیک [illegible] بردہ در افتادہ"

اور گستری کے حال میں لکھتے ہیں:-

"بنا بر نوشتن میر در تذکرۂ خود شاعر شان علی المتخلص بہ ولی
کہ وے شاعریست از شیطان مشہور تر ہجو ہائے [illegible] رکیکہ
بواجبی نمود"

آزاد نے گستری کی ایک ہجو یہ نظم کا یہ آخری مصرعہ بھی نقل کیا ہے۔
"ولی پر جو سخن لاوے اسے شیطان کہتے ہیں" یہ مصرع قائم کے تذکرے

میں موجود نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میر اور کمترین کے معاملے میں آزاد کا ماخذ تذکرۂ قاسم کے علاوہ کوئی اور چیز بھی ہے۔ بہرحال جن جملے کو قاسم نے دو جگہ نقل کیا ہے اور جس کی بنا پر کمترین نے میر کی نہایت رکیک ہجویں لکھیں وہ نکات الشعرا کے مطبوعہ نسخے میں موجود نہیں ہے۔ اس کی جگہ یہ جملہ ملتا ہے۔ " از کمال شہرت احتیاج تعریف ندارد"۔ اس سے کامل نکات الشعرا کے مختلف قدیم نسخوں کے باہمی مقابلے کے بعد ممکن ہے۔

یہ چند اعتراض جو نمونے کے طور پر پیش کئے گئے ہیں ان سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت آزاد نے کوئی بات بغیر تحقیق کئے ہوئے نہیں لکھی اور جو اعتراض اُن پر کئے گئے ہیں وہ زیادہ تر معترضوں کی کم علمی اور تنگ نظری پر مبنی ہیں۔ حضرت آزاد کے بیشتر بیانات مستند کتابوں سے ماخوذ ہیں۔ مگر اُنھوں نے معتبر اور معتبر بزرگوں سے جو کچھ سنا اُسکو بھی اپنی کتاب میں درج کر دیا ہے۔ ہمارے ممتاز شعرا کے متعلق جو روایتیں سینہ بسینہ چلی آتی تھیں اُن کو محفوظ کر دینا بھی ایک اہم ادبی خدمت تھی۔ آزاد کے زمانے تک یہ دستور نہ تھا کہ جو بات کہی جائے اُس کے لئے سند پیش کی جائے اور ماخذ کا حوالہ دیا جائے۔ آزاد نے زیادہ تر کتابوں کے حوالے اُن موقعوں پر دیئے ہیں جہاں کسی مصنف نے تمام خیال کے خلاف کوئی بات کہی ہے۔ پھر بھی جن کتابوں کے حوالے آبِ حیات میں ملتے ہیں اُن کی تعداد کم نہیں ہے۔ ذیل میں ان کتابوں کی فہرست پیش کی جاتی ہے :-

۱۔ سنسکرت لغت ... از ہیم چند

۲۔ شکنتلا ناٹک ...... از کالی داس

۳۔ عہد راجہ بھوج کی ناٹک پستکیں

۴۔ پرتھوی راج راسے۔ از چند کوی

۵۔ کلام کبیر صاحب

۶۔ کلام سور داس

۷۔ جپ جی ۔۔۔ از گرو نانک — ۸۔ ترجمہ شکنتلا ناٹک ۔۔۔ از نواز کوی

۹۔ پدماوت ۔۔۔ از ملک محمد جائسی — ۱۰۔ رامائن ۔۔۔ از تلسی داس

۱۱۔ قران السعدین } از امیر خسرو — ۱۳۔ حامد باری ۔۔۔ از حامد

۱۲۔ خالق باری — ۱۴۔ تزک جہانگیری

۱۵۔ نادر نامہ ۔۔۔ از عبدالکریم — ۱۶۔ روضۃ الشہدا } از سیوا دکنی

۱۸۔ نور المعرفت ۔۔۔ از ولی دکنی — ۱۷۔ مراثی

۱۹۔ تذکرہ نکات الشعرا ۔۔۔ از میر تقی میر

۲۰۔ تذکرۂ شعرا ۔۔۔ از مرزا سودا — ۲۱۔ تذکرۂ فارسی ۔۔۔ از مصحفی

۲۲۔ تذکرۂ شعرا ۔۔۔ از قدرت اللہ قاسم

۲۳۔ تذکرۂ شعرا ۔۔۔ از شورش

۲۴۔ تذکرۂ گلزار ابراہیم ۔۔۔ از ابراہیم خاں خلیل

۲۵۔ تذکرۂ گلشن بے خار ۔۔۔ از مصطفیٰ خاں شیفتہ

۲۶۔ تذکرۂ سراپا سخن ۔۔۔ از محسن — ۲۷۔ تذکرۂ شعرا ۔۔۔ از فائق

۲۸۔ تذکرۂ دلکشا — ۲۹۔ دہ مجلس ۔۔۔ از فضلی

۳۰۔ نثر شعلۂ عشق ۔۔۔ از مرزا سودا — ۳۱۔ ترجمۂ قرآن ۔۔۔ از شاہ عبدالقادر

۳۲۔ رسائل اردو ۔۔۔ از مولوی اسمٰعیل — ۳۳۔ خریطۂ جواہر ۔۔۔ از مرزا مظہر

۳۴۔ معمولات مظہری — ۳۵۔ تصانیف خواجہ میر درد

۳۶۔ دریائے لطافت ۔۔۔ از انشا — ۳۷۔ چار شربت ۔۔۔ از قتیل

۳۸۔ قواعد اردو ۔۔۔ از گلکرسٹ — ۳۹۔ تلخیص معلی

۴۰۔ عبرۃ الغافلین ۔۔۔ از مرزا سودا — ۴۱۔ مجالس رنگین ۔۔۔ از رنگین دہلوی

۴۲۔ مجموعۂ غزلیات قلمی نوشتہ ۱۱[illegible]ھ — ۴۳۔ مجموعۂ سخن

۴۴۔ نوطرز مرصع ۔۔۔ از عطا حسین تحسین

۴۵۔ ترجمہ اخلاق محسنی } از میر امن دہلوی

۴۶۔ باغ و بہار

۴۷ - باغِ اُردو } از میر شیر علی افسوس
۴۸ - آرائشِ محفل } از میر شیر علی افسوس

۴۹ - بیتال پچیسی ۔۔۔۔ از مظہر علی ولاؔ

۵۰ - پریم ساگر ۔۔۔۔ از للّو جی لال

۵۱ - مکاتبات ۔۔۔۔ از ابوالعلا

۵۲ - رقعات ۔۔۔۔ از مرزا قتیلؔ

۵۳ - اردوئے معلیٰ } از غالبؔ
۵۴ - عودِ ہندی } از غالبؔ

یہ فہرست سرسری طور پر تیار کی گئی ہے اور اس کے مکمل ہونے کا دعویٰ نہیں کیا جاتا۔ اِن کتابوں سے زیادہ تعداد اُن دیوانوں، مثنویوں وغیرہ کی ہے جن کا آبِ حیات کی تصنیف کے سلسلے میں مصنف کو گہرا مطالعہ کرنا پڑا ہے۔ اِن کتابوں میں بعض ایسی ہیں جو اب نایاب ہو گئی ہیں اور بہت سی ایسی ہیں جو اب چھپ کر عام ہو گئی ہیں، مگر آزاد کے زمانے میں غیر مطبوعہ اور کمیاب تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جس محنت اور جس تحقیق سے آبِ حیات لکھی گئی ہے اُس کی مثالیں اُردو ادب میں بہت کم ہیں۔

اِس مختصر مضمون میں آبِ حیات کی معنوی حیثیت کے متعلق چند باتیں عرض کر دی گئی ہیں۔ اُس کی لفظی، ادبی، یا انشائی حیثیت بھی بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اتنی اہمیت کہ اگر مطالب کے اعتبار سے کتاب بالکل بے وقعت ٹھہرے تو بھی انشاپردازی کے لحاظ سے اُس کا شمار اُردو کی بہترین کتابوں میں ہوگا۔ اردو ادب اگر آبِ حیات کے مقابلے میں کوئی چیز پیش کر سکتا ہے تو وہ حضرت آزاد ہی کی دوسری تصنیفیں ہیں، یعنی قصص الہند، دربارِ اکبری، نیرنگِ خیال، سخندانِ فارس۔ آزاد کی انشاپردازی ایک طولانی بحث چاہتی ہے اور اس وقت وہ بحث چھیڑنا منظور نہیں۔ صرف اتنا کہہ دوں کہ آزاد کا دماغ جو کچھ سوچتا ہے اور اُن کا دل جو کچھ محسوس کرتا ہے

اُن کا قلم پوری قوت، اختصار، حسن اور اثر کے ساتھ اِن دونوں چیزوں کی ترجمانی بیک وقت کرتا چلا جاتا ہے۔ آبِ حیات کے دو جملے اور دو مختصر اقتباس سنیئے:۔

> پہلا جملہ۔ "خواجہ میر درد چھوٹی چھوٹی بحروں میں جو اکثر غزلیں کہتے تھے گویا تلواروں کی آبداری نشتروں میں بھر دیتے تھے۔"
>
> دوسرا جملہ۔ "اس وقت دلی کا دربار ایک ٹوٹی پھوٹی درگاہ اور سجادہ نشین اُس کے شاہ عالم بادشاہ تھے۔"
>
> پہلا اقتباس "یہیں آگ سے زرتشت اور جاماسپ کے متبرک ہاتھوں سے آتش خانوں کو روشن کیا، جس کے آگے گشتاسپ نے تاج اُتار کر رکھا، جس کی درگاہ میں اسفندیار نے گرز اور تلوار چڑھائی وہ یونان کے آبِ شمشیر سے بجھائی گئی۔"
>
> دوسرا اقتباس "سولہ برس کی عمر تھی کہ باپ مر گئے اُسی وقت سے مُشتِ خاک کو بزرگوں کے گوشۂ دامن میں باندھ دیا۔ تیس برس کی عمر تک مدرسوں اور خانقاہوں میں جھاڑو دی اور جو دن بہارِ زندگی کے پھول ہوتے ہیں اُنھیں بزرگوں کے قدموں پر چڑھا دیا۔"

آبِ حیات جس مقصد سے تصنیف کی گئی تھی وہ مصنف کے اس قول سے ظاہر ہے:—

> "خیالات مذکورۂ بالا نے مجھ پر واجب کیا کہ جو حالات ان بزرگوں کے معلوم ہیں یا مختلف تذکروں میں متفرق مذکور ہیں اُنھیں جمع کر کے ایک جگہ لکھ دوں۔ اور جہاں تک ممکن ہو اس طرح لکھوں کہ اُن کی زندگی کی بولتی چالتی، چلتی پھرتی تصویریں آن کھڑی ہوں اور اُنھیں حیاتِ جاوداں حاصل ہو۔"

حضرت آزاد کو اپنے مقصد میں وہ کامیابی حاصل ہوئی جو بہت کم مصنفوں کو میسر ہوئی ہوگی۔ آبِ حیات کی تکمیل کے بعد حضرت آزاد نے خدا کی درگاہ میں یہ دعا کی تھی کہ "بزرگوں کے ناموں اور کلاموں کی برکت سے مجھے اور میرے کلام کو بھی قبول عام اور بقائے دوام نصیب ہو۔" اس میں کچھ شک نہیں کہ آزاد کی یہ دعا قبول ہوئی۔ آبِ حیات نے جہاں ہمارے ممتاز شاعروں کو حیات جاودانی بخشی ہے وہاں اپنے مصنف کو بھی زندۂ جاوید کر دیا ہے۔

(سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب)

حمدِ خدا رُوحِ اَدب

تو نے جس مورت کو بنایا تھا وہ سوتی تھی ہلتی جُلتی نہ تھی مگر جیتی تھی تو نے کُن کہہ کر اُس کو جگایا اپنی روح اس میں ڈالی اور بولتا چالتا کر دکھایا وہ مورت خاک کی بنی ہوئی تجھ کو تیری ہی کہانی سُناتی ہے تو کہے مَیں کون؟ اپنی تمنا میں الگ تو خدا تو بندہ میں خدا میں کہوں تو کیوں مکرتا ہے میں تھا کب؟ اور ہوں کہاں؟ بس تو ہی تھا اور تو ہی ہے اوّل بھی تو آخر بھی تو ظاہر بھی تو باطن بھی تو اوپر بھی تو نیچے بھی تو دائیں بھی تو بائیں بھی تو بس تو ہی تو تو ہی تو میں نہیں ہرگز نہیں ہاں ہاں تو ہی ہے تو ہی تو۔

کیا چُھپا ہوا خزانہ مَیں تھا؟ کیا پہچانے جانے کا شوق مجھے ہوا تھا؟ کیا اپنی پہچان کے لئے کائنات کو میں نے پیدا کیا تھا؟ کیا اپنی دید کے لئے اس سرشٹی میں، کون رچا تھا؟ کیوں انجان بنتا ہے؟ کیوں نادان بنا جاتا ہے؟ سورج میں کون چمکتا ہے؟ چاند میں کون دمکتا ہے؟ تارہ میں کون جھلکتا ہے؟ آسمان میں کون پھیلا ہوا ہے پہاڑوں میں کس کی شان اپنی بلندی دکھا رہی ہے سمندروں میں کون موجیں مار رہا ہے؟ دریاؤں میں کون بہتا چلا جاتا ہے؟ ستاروں میں کون چُپ چاپ کھڑا مُسکراتا ہے دُنیا کے دُکھ میں کون ہائے ہائے کرتا ہے اور سُکھ میں کون اترا رہا ہے میں کیا جانتا نہیں کہ تو ہی تو ہے بیشک تو ہی تو ہے۔

پھر اگر میں اپنی کہانی تیری زبانی خود تجھ کو سناؤں اور یہ کہوں کہ تو یوں پیدا ہوا تو اس طرح پلا بڑا ہوا کھیلا کودا پڑھا لکھا اُٹھا بیٹھا سویا جاگا ہنسا رویا لڑا بِھڑا گرا اُٹھا چھوٹا دکھائی دیا، بڑا ہوا تو خوب جانتا ہے کہ یہ سب شکلیں پانی کے بُلبلہ کی طرح محض دیکھنے کے لئے تو نے بنائی ہیں اندر ان سب کے بس تو ہے اور باہر بھی ان سب کے بس تو ہے میرا سر تیرا سر ہے میرے کان تیرے کان ہیں میرا مُنہ تیرا مُنہ ہے میری زبان تیری

زبان ہلے میرا دل تیرا دل ہے میرے ہاتھ تیرے ہاتھ ہیں میرا جینا تیرا جینا ہے اور میرا مرنا تیری نظر کا ادھر سے ادھر ہو جانا ہے پھر بھی تو آقا ہے میں غلام ہوں تو خداہے میں بندہ ہوں۔

اچھا تو سن میں تجھ کو تیری سرگزشت اس طرح سناتا ہوں کہ تو بھی اور تیری بیشمار صورتوں اور سیرتوں سے بنی ہوئی مورتیں سن لیں یہ جانیں کہ یہ تو سچ مچ میری ہی کہانی ہے۔

تو نے اس سنسار کو جہان کو کائنات کو گورکھ دھندہ بنایا ہے جو آج تک نہ کسی کی سمجھ میں آیا نہ سمجھ میں آنے کی امید ہے یہی حال اس گورکھ دھندے کی ہر چیز کا ہے اور میں بھی ایک چیز ہوں بے وجود ہوں مگر وجود رکھتا ہوں نابود ہوں مگر تیری بود کے سایہ میں رہنے کے سبب ایک بود کا دعوے دار ہوں تو مجھ میں ہے تو میں ناچیز نہیں بڑی چیز ہوں ہر دل میں ہوں اور ہر دل کو عزیز ہوں۔

حسن میں ہوں حسن ازل سے ابد تک حسن سمارے سمک تک حسن شرق سے غرب تک شمال سے جنوب خلاء سے ملائے اعلیٰ تک حسن عرش چمن ناسوت میں حسن ملکوت و جبروت میں حسن لاہوت و ہاہوت میں حسن تو ہست ہے تو حسن بھی ہست ہے تو نیست ہے تو حسن بھی نیست ہے تو ہے تو وہ بھی ہے تو نہیں ہے تو وہ بھی نہیں ہے۔

تعین و تشبیہہ کے پردہ کو دیکھ تیرا قلم میرے ہاتھ سے کیا تصویر بناتا ہے جو تجھ پر گزری ہے وہ اپنی بیتی کہہ کر سناتا ہے ایسی کہوں گا جو تجھ کو بھائے اور جن میں تو رما ہوا ہے بسا ہوا ہے ان کو بھی پسند آئے تو بھی جی لگا کر سنے وہ بھی جھوم جھوم کر مست ہو کر سنیں اور کہیں سوانح ہو تو ایسی ہو سرگزشت لکھی جائے تو یوں لکھی جائے یہ زبان ہے یا جادو یہ بول چال ہے یا گنگا جمنا کا پانی لہرتا چلا جاتا ہے کوئی پیتا ہے کوئی ڈوبے کوئی نہ میں کاٹ کاٹ کرتے جائے مگر یہ پانی ایسا ہے کہ نہ رکے سب کو

سیراب کرتا چلا جائے۔

تو سنسکرت بولتا تھا عبرانی بولتا تھا عربی بولتا تھا اور دنیا تیرے ان بولوں کو پیار کرتی تھی اب تو میری زبان سے اُردو بولے گا اور اپنے پرائے سب کہیں گے یہ بولی آدمی کی بولی سے بہت اونچی ہے کس آدمی کی مجال ہے جو آدمیوں کی زبان کو اس طرح قابو میں رکھ کر بولتا چلا جائے اس بول چال میں تو کسی اور ہی کی آواز ہے کسی اور ہی کے حروف ہیں کسی اور ہی کے الفاظ ہیں میری اس بولی اُردو کا سجدہ اور حمد قبول کر۔ آمین۔

(خواجہ حسن نظامی دہلوی)

ہندوستانی کلچر اور اسکے اثرات

کچھ دنوں سے اکثر اطراف ملک سے فرقہ وارانہ صدائیں بلند ہو رہی ہیں اور بعض اصحاب تاریخ ہند کے اس نازک دور میں بھی ملک کے حصے بخرے کرنے کو مستعد نظر آرہے ہیں۔ عوام تو عوام ہمارے بعض رہنما بھی ملک میں اپنے فرقہ کی خصوصیات و روایات کو ازسر نو زندہ کرنے کا خواب دیکھ رہے ہیں اور ملک میں آئے دن ہندو مسلمانوں کی جداگانہ تہذیب و اخلاق کا دل خراش لہجے میں ذکر سننے میں آرہا ہے۔ حالانکہ سطحی باتوں سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو موجودہ زمانے کے ہندو مسلمان دونوں کے گھروں میں بڑی حد تک ایک مشترکہ ہندوستانی کلچر کا سکہ رواں ہے۔ یہ کلچر نہ خالص مسلم ہے اور نہ خالص ہندو بلکہ ہندو مسلم دونوں کی تاریخ تہذیب اور معاشرت کا دلچسپ مجموعہ ہے برطانوی حکومت کی وجہ سے ہماری گھریلو زندگی یعنی روزمرہ نشست برخاست کھانے پینے اور لباس وغیرہ میں یوروپین طرز معاشرت کا بہت کچھ اثر پڑا ہے۔

تھانیسر کی لڑائی کے بعد سے مسلمان ہندوستان میں مستقل طور پر آباد ہوگئے۔ اس کا ہماری قومی زندگی اور روزمرہ معاشرت پر بہت اثر پڑا۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں دونوں نے ایسا طریق زندگی اختیار کر لیا جس کو ہم نہ خالص ہندو کہہ سکتے ہیں اور نہ خالص مسلم بلکہ جو دونوں کا مشترکہ اور مجموعی کلچر تھا جسے ہم "ہندوستانی کلچر" کے نام سے یاد کرسکتے ہیں اور جس میں اس وقت بھی ہندو مسلمان دونوں کے نہ صرف پہلو بہ پہلو رہنے بلکہ عزت و آبرو کی زندگی بسر کرنے کی پوری گنجائش موجود ہے۔

اس نئے طرز معاشرت میں ہندو مذہب، ہندو آرٹ، ہندو لٹریچر اور ہندو سائنس نے مسلم عناصر کو اپنے اندر کچھ اس طرح جذب کر لیا کہ خود ہندو کلچر کی ماہیت تبدیل ہو گئی۔ اسی طرح ہندو مسلم دونوں کے باہمی میل جول سے مسلم کلچر، مسلم آرٹ اور شاید خود اسلام نے ایک نئی شکل اختیار کر لی۔

ہندو مذہب پر تو اسلام کا سب سے بڑا اثر یہ پڑا کہ عوام کے عقائد میں توحید کا خیال جو ایک عرصہ سے ماند پڑ گیا تھا پھر زیادہ زور کے ساتھ جاگزیں ہو گیا۔ پورانک ہندوؤں میں بہت سے دیوی دیوتا پوجے جاتے تھے، اور گو ابتدا ہی سے ہندو مذہب میں ایک قادر مطلق پرماتما کا خیال موجود ہے لیکن دیوی دیوتاؤں کی کثرت نے توحید کے عقیدہ کو کمزور کر کے اُسے بالکل پس پشت ڈال دیا تھا۔ اسلام نے ہندوستان آکر خدا کی وحدانیت پر غیر معمولی زور دیا۔ عام خیالات اور جذبات پر اس کا بہت بڑا اثر پڑا جس کا پورا ثبوت تین چار صدی بعد کے ہندو ریفارمروں اور روحانی لیڈروں کی تعلیمات میں بخوبی ملتا ہے۔ ان ریفارمروں نے بعض مذہبی عقائد عمداً ترک کر دئے اور ان کی جگہ جن عقائد کا پرچار کیا اُن کی بدولت ہندو مذہب اور اسلام دونوں ایک دوسرے کے قریب تر ہو گئے۔ اس مذہبی اصلاح کی سب سے نمایاں مثال کبیر اور گرو نانک کی تعلیمات میں ملتی ہے۔ اسی سلسلہ میں رَیداس، دادو، ملوک داس اور بہت سے دوسرے روحانی پیشواؤں کے نام بھی لئے جا سکتے ہیں۔ دوسری طرف مسلم صوفیوں نے بھی جو محمد بن قاسم کے وقت سے سندھ آکر ہندوستان کے بہت سے مقامات میں پہنچ گئے تھے بعض ہندو عقائد قبول کر لئے۔

تعمیرات میں بھی اس مشترکہ کلچر کا اثر بخوبی نمایاں ہے چنانچہ اس زمانہ کی ہندو عمارتیں بھی خالص ہندو طرز کی نہیں بنائی گئی ہیں اور ان کے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نئے اسٹائل نے جو نہ خالص ہندو ہے اور نہ خالص مسلم، پرانے طرز کی جگہ لے لی ہے۔ اسی طرح مسلم تعمیرات

میں بھی صاف طور پر ہندو اثر نظر آتا ہے ۔ یہ ضرور ہے کہ مسلم تعمیرات میں ایرانی اور عربی طرزِ تعمیرات کے چند پہلو اب بھی قائم رہے لیکن جب یہ پہلو ہندو طرز میں شامل ہوئے تو ایک نیا اسٹائل پیدا ہو گیا جس میں ہندو تعمیر کا رنگ صاف طور پر جھلکتا ہے ۔ اس نئے اور مشترکہ اسٹائل میں اگر ایک طرف مسلم طرزِ تعمیر کی سادگی باقی نہیں رہی تو دوسری طرف ہندوؤں کے شوقِ آرائش و سجاوٹ میں بھی بہت کمی ہو گئی ہے ۔ ہندو صناعوں کی عام وضع قطع (جنرل ڈیزائن) اس کی سجاوٹ اور پچی کاری تو قائم رہی لیکن اس پر نوکیلی محرابیں اور سادہ گنبد اور ہموار دیواروں کے جوڑ پیوند لگ گئے جو مسلم فنِ تعمیر کے خاص جزو تھے ۔ اس لئے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اس زمانہ کی ہندو مسلم تعمیرات دراصل ایک ہی درخت کی دو شاخیں ہیں جن میں ظاہری اختلافات کے باوجود معنوی یکسانیت پائی جاتی ہے ۔

ہندو مسلم کلچر کا اثر تعمیرات سے کہیں زیادہ مصوری میں پایا جاتا ہے ۔ چنانچہ مغل اور راجپوت مصوری ایک ہی آرٹ کے دو مختلف نمونے ہیں اور راجپوت مصوری اجنتا کے فنِ تصویر سے بہت دور مگر مغل مصوری کے بہت قریب ہے ۔ دراصل مغل اور راجپوت مصوری کا فرق جتنا سمجھا جاتا ہے اتنا نہیں ہے۔ راجپوت آرٹ میں راگ راگنیوں اور نائکوں کی تصویروں میں جو تصویریں بنائی گئی ہیں وہ شکل و صورت سے تو راجپوت ہیں لیکن ان کا لباس اور ان کی نشست ایرانی ہے ۔ اس طرح نیا آرٹ خالص ہندو یا خالص مسلم آرٹ سے الگ پیدا ہو گیا جسے اور اسی لئے وہ ہندو مسلم آرٹ کے نام سے یاد کیا جا سکتا ہے جس طرز میں اجنتا آرٹ کے لوچ اور نرمی کے ساتھ ساتھ مشترکہ اور مسلم آرٹ کا تناسب اور فاصلہ (Spacing) موجود ہے اور ان دونوں کے امتزاج نے ایک حیرت انگیز شوخی اور ان کی آمیزش نے باریک خطوط کے ساتھ مل کر ایک نیا حسن پیدا کر دیا ہے ۔

نئے ہندو مسلم کلچر کا اثر دیسی ادب اور دیسی زبانوں پر بھی پڑا ۔ مسلم

فتوحات کے بعد سنسکرت کا زمانہ تو بالکل ختم ہو گیا اور اس کی جگہ اظہار خیال کے لئے ہندی۔ مرہٹی۔ بنگالی۔ گجراتی زبانیں وجود میں آئیں مسلمانوں نے بھی ترکی فارسی ترک کر کے دیسی زبان اختیار کی اور اس طرح ایک نئی زبان یعنی اردو یا ہندوستانی پیدا ہوئی جس کی توسیع و ترقی کے لئے "انجمن روح ادب" قائم ہوئی ہے۔

ہندی زبان پر بھی مسلم اثرات کے گہرے نقوش موجود ہیں۔ الفاظ۔ گرامر۔ تشبیہات اور طرز تحریر سب پر اس کا اثر نمایاں ہے۔ یہی بات مرہٹی، پنجابی اور سندھی وغیرہ زبانوں پر صادق آتی ہے۔ امیر خسرو کی خالق باری کو اسی اثر کا خوشگوار نتیجہ سمجھنا چاہئے۔ قطب الدین ایبک کا خطاب "لاکھ بخش" ان دونوں زبانوں کے میل جول کی ایک ادنیٰ مثال ہے۔ اس طرح اب بھی صدہا الفاظ ہماری زبانوں پر چڑھے ہوئے ہیں جو ہندو مسلم اتفاق و اتحاد کی یاد دلاتے رہتے ہیں۔

اہل عرب بہت دنوں پہلے علم حساب اور ہندو فن طب کے مرہون منت ہو چکے تھے۔ لیکن عربوں نے یونان سے بھی اپنے علم میں بہت کچھ اضافہ کیا۔ اسی لئے وہ ان صیغوں میں ہندوؤں سے پیچھے نہ تھے۔ چنانچہ ان کی نئی معلومات سے ہندوؤں کو بہت فائدہ پہنچا۔ ہندو ریاضی دانوں نے کئی اصطلاحات مسلمانوں سے مستعار لئے اور کئی عربی کتابوں کا سنسکرت میں ترجمہ کیا۔ مثلاً علم ہیئت میں تاجک کا سنسکرت میں ترجمہ کیا گیا۔ دوا سازی کی کئی خاص ترکیبیں ہندوؤں نے مسلمانوں سے سیکھیں۔ فن کاغذ سازی بھی مسلمانوں نے چین سے حاصل کر کے ہندوستان میں رائج کیا۔

ہندو موسیقی پر بھی اس اتحاد کا غیر معمولی اثر پڑا۔ مسلمانوں نے یہاں کی قدیم راگ راگنیاں تو قبول کر لیں لیکن آلات موسیقی میں بہت کچھ رد و بدل کیا جو آج تک رائج ہے۔ چنانچہ یہاں کے پکھاوج اور مردنگ کی جگہ طبلہ اور بین کی جگہ ستار نے لے لی۔

لباس، رسم و رواج، آداب محفل، غذا، کھانا پکانا سب پر مسلمانی

تہذیب و معاشرت کا گہرا اثر پڑا۔ موجودہ حلوائی کی دوکان تو شروع سے اخیر تک مسلمانوں کی رہین منت ہے۔ خود حلوائی کا لفظ اور اکثر مروجہ مٹھائیاں گلاب جامن۔ بالوشاہی۔ امرتی وغیرہ وغیرہ مسلمانوں کا تحفہ ہیں اسی طرح ہندوؤں کے بہت سے لذیذ کھانے مسلمانوں کے دسترخوانوں کی زینت بن گئے۔ روٹی۔ ترکی زبان کا لفظ ہے۔ اوپر روزمرّہ الفاظ کا ذکر آچکا ہے چنانچہ چاچا۔ چاچی۔ دادا۔ دادی۔ جیجا۔ جیجی سب غیر ملکی الفاظ ہیں مگر اب یہ ہماری خانگی زندگی کا ضروری جزو بن گئے ہیں اور موجودہ درزی خانہ بھی بہت کچھ مسلمانوں کا رہین منت ہے۔

غرض زندگی کا کوئی شعبہ نہیں جس پر ہندو مسلمانوں کے تاریخی میل جول کا اثر موجود نہ ہو۔ ہندوؤں کی احتیاط اور الگ تھلگ رہنے کی عادت ضرب المثل ہے مگر دانستہ یا نادانستہ انھوں نے مسلمانوں کی طرز معاشرت اور طریق زندگی کو بہت کچھ اپنا لیا۔ مسلمان بھی ہندو تہذیب و ہندو تمدن سے شیر شکر کی طرح گھل مل گئے۔ ہندوؤں کے شادی بیاہ کی صدہا رسمیں اس وقت بھی مسلمانوں کے یہاں ضروری رسمیات میں داخل ہیں۔ آجکل کے ناواقف مسلمان شائد یہ سن کر تعجب کریں کہ تھانیسر کے فاتح محمد غوری نے عرصہ تک پرتھی راج کے سکوں کا سانچہ قائم رکھا۔ چنانچہ اس کے سکوں کی پشت پر لکشمی جی کی تصویر بنی ہوئی ملتی ہے۔ بلبن پہلا ترک حکمران تھا جس نے عربی طرز کے سکے رائج کئے۔

ہندوستان کو مسلمانوں کی آمد سے ایک اور فائدہ یہ بھی پہنچا کہ آٹھویں صدی عیسوی میں بدھ دھرم کے زوال کے بعد صدیوں تک اس کا بیرونی دنیا سے کوئی تعلق باقی نہ رہا تھا مسلمانوں کی آمد سے یہ تعلق پھر از سر نو جاری ہو گیا۔ اور یورپ کی نئی ایجادات ترکوں ہی کے ذریعہ ہندوستان میں رائج ہوئیں۔ بارود تو سب سے پہلے ہندوستان

میں پانی پت کی پہلی لڑائی میں داخل کیا۔ ان تمام باتوں سے بخوبی ثابت ہے کہ مسلمانوں کی آمد کے بعد دونوں قوموں کے ایک جگہ امن و امان کے ساتھ رہنے سہنے سے جس تہذیب کی بنیاد پڑی وہ اب تک ہماری زندگی پر حاوی ہے۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ موجودہ زمانہ کے ہندو مسلمانوں دونوں کو اس پر یکساں فخر نہ ہو۔

(دیا نرائن نگم)

نظیر کی ہمہ دانی اور زبان

نظیر اکبرآبادی جس کا پورا نام شیخ ولی محمد نظیر تھا۔ آگرے کے محلے تاج گنج کا رہنے والا تھا۔ وہ غالباً محمد شاہ کے عہد میں پیدا ہوا اور کم وبیش سو برس زندہ رہ کر اس نے ۱۸۳۰ء میں انتقال کیا۔ اس کی وفات اکبر شاہ ثانی کے عہد میں ہوئی۔

ہمہ دانی

نظیر کو قدرت نے عالمگیر تخیئل کا عطیہ بخشا تھا۔ وہ موجودات کے سارے اجزاء، مخلوق کے جملہ افراد، اور انسان کے تمام رموز سے باخبر تھا۔ وہ نفس کے طبعی رجحانات اور جنسی میلانات کا سچا نباض تھا۔ وہ زمانے کے تغیرات کے تدریجی اثرات، سیاسی انقلاب کے ارتقائی کوائف اور معاشرت کے نت نئے مظاہر کے نتائج سے بخوبی آشنا تھا۔ اس کی نظر کل کائنات کی محرم راز تھی۔ اس میں حکیم کی سی بصیرت اور فلسفی کی سی دقت نظر موجود تھی۔ وہ مسائل کی تہ میں ڈوب کر حقائق کا پتہ لگاتا تھا۔ ان سے بالاتر اس کا دل، شاعر کا پاک دل تھا جس میں نزاکت نفاست اور رقت کا ایک طوفان برپا تھا اور جس کے حس کی گہرائیوں کو ناپنا اور جس کے تنوع کے حدود معین کرنا محال ہے۔ اس کی دقیقہ سنجی، اس کی نکتہ رسی، اس کی ادا شناسی خرق عادت تھی۔ اس کا رنگ ایسا اچھوتا تھا جو صورت میں قوس قزح کی سات کرنوں اور معنی میں آب حیات کی طراوت کا اثر رکھتا تھا۔ ہندوستان کی سرزمین پر ایسے ہمہ گیر ہمہ دان شاعر بہت کم پیدا ہوئے ہیں۔ نفسی تحلیل کے اعتبار سے اس کی ہمہ دانی شیکسپیر سے مشابہ اور مقامی رنگ کی آمیزش کے لحاظ سے اس کا رنگ کالیداس کا ہم طرح ہے۔ اس کی یہ باتیں، کم سے کم اردو ادب میں تو اپنا ثانی نہیں رکھتیں۔ اسکوٹ نے اگرچہ نثر زیادہ لکھی ہے مگر اس کی

ہی ہمہ دانی اور ہمہ گوئی کی صنعتیں نظیر سے مشترک ہیں۔ نظیر اپنے ملک کی قدیم اور موقت تاریخ، روایت، معاشرت، رسم و رواج، خواص و عوام کی زبان اور ان سب سے بالاتر فطرت کی مخفی و جلی اُفتاد سے اُتنا ہی واقف تھا، جتنا اسکوٹ اپنے وطن کے ان رموز سے اور اس واقفیت کی بنا پر اور اپنی مصورانہ قدرت کے کمال کی وجہ سے وہ اپنے ملک کے بہت سے شعراء سے بہ مراتب اونچا نظر آتا ہے۔ نظیر کی بہت سی طویل اور مختصر نظموں میں اسکوٹ کی نظموں کی بہت مشابہت موجود ہے ہندوستانی بولیوں سے واقفیت، معلومات کی وسعت، خیال کی بلندی، نظر کے بلوغ اور طبیعت کی فلسفیت کے اعتبار سے نظیر کو اپنے عہد کا ابو نصر فارابی کہا جائے تو بےجا نہ ہوگا۔ ہندوستان کا سیاسی، معاشری اور لسانی مستقبل ایک کھلی ہوئی کتاب کی طرح اس کے پیش نظر تھا۔ اسے زبانوں سے جو فطری لگاؤ تھا اس کا صرف ایک شائبہ انشا کے فضل و کمال میں جھلکتا نظر آتا ہے مگر انشا نے اپنے کمال کی زبان دانی سے وہ کام نہیں لیا جو نظیر نے لیا۔ نظیر اور رانبس کے آرٹ میں اگرچہ نقطۂ نظر کا فرق ہے لیکن زباں دانی کے باب میں دونوں کا پلّہ برابر ہے۔ نظیر کی زبان اس کی ہمہ گیر فطنت کا ایک دلچسپ و سبق آموز باب ہے مگر اس کی وضاحت سے پہلے، اس سے پیشتر کے تاریخی حالات کا ایک طائرانہ تبصرہ مفاد سے خالی نہ ہوگا۔

اردو کی تاریخ پر طائرانہ نظر

محمود غزنوی کے حملوں کے ساتھ فارسی کا قدم ہندوستان میں مستقل طور پر آیا اور مسلمان بادشاہوں کی حمایت کے سائے میں یہ زبان ملک کی دفتری زبان بن گئی۔ اس نوع کی فوقیت کا جو اثر سوسائٹی پر پڑنا چاہیے وہ بھی برابر پڑتا رہا۔ لیکن ملک کے مختلف حصوں میں، مختلف مقامی زبانیں جوں کی توں رائج رہیں۔ عامۃ الناس اپنی اپنی صوبائی بولی بولتے تھے اور خواص اپنی

مادری زبان کے علاوہ، حکومت کی زبان بھی بول اور لکھ پڑھ سکتے تھے زمانے کی رفتار سے مبصروں نے تاڑ لیا کہ فارسی اور ملکی زبانوں کے میل جول اور امتزاج سے غیر شعوری طور پر ایک نئی زبان بن رہی ہے جو ایک دن ملک کے ارض وطول کی مادری زبان بن کر رائج ہوگی ۔ ریختے کی تخم ریزی گویا ہو چکی تھی اور بیجوں سے کلّے پھوٹتے نظر آ رہے تھے ۔

لسانی منجم کی یہ ذہنی پیشین گوئی آخر سچ ہو کر رہی اور اب عام فہم ہندوستانی زبان کے نشو و نما کے آثار ظاہر ہونے لگے جس کا دوسرا نام آج اُردو ہے ۔ اس کی پیدائش کے اسباب و قرائن فہم سے کچھ زیادہ دور نہ اور حالات کی گہرائیوں میں کچھ اتنے پوشیدہ نہ تھے کہ دور بینو کو دیر تک نظر نہ آتے ۔ وہ ایسی سامنے کی باتیں تھیں کہ ہر ذی فہم کی سمجھ میں آ سکتی تھیں ۔ پہلا سبب تو یہ تھا کہ بدیشی حاکم کی زبان خواہ وہ کتنی ہی مفید، بیر حاصل اور میٹھی کیوں نہ ہو، قبول عام کا فخر حاصل نہیں کر سکتی ۔ وہ عموماً صرف حکام، عمال، علما، امرا اور درباریوں تک محدود رہتی ہے ۔ خواتین اور اہل حرفہ میں نہیں پھیلتی، عامتہ الناس کی زبان نہیں بن سکتی ۔ پھر یہ کہ ہندوستان جیسے قدیم ملک میں جس کے پاس سنسکرت جیسی دیو بانی زبان کے ادب، فلسفے اور تمدن کی میراث پس منظر میں موجود ہو، کسی خارجی زبان کا پھولنا پھلنا، پروان چڑھنا اور ملک پر چھا جانا ایک غیر فطری بات ہوتی ۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ عامتہ الناس کی ضرورتِ اظہار اور تبادلۂ خیال کا تقاضا ایک ایسا فطری مطالبہ تھا جو فاتح اور مفتوح کے مابین ایک مشترک آلۂ اظہار کا خواہاں اور اس کی ضرورت کا اعلان کر رہا تھا ۔ اس خواہش کا کوئی نہ کوئی نتیجہ خیز اثر ظاہر نہ ہونا محال تھا ۔ ان دونوں وجوہ کے تحت میں نئی زبان کی بنیاد پڑ رہی تھی ۔ ان کے علاوہ ایک تیسرا قوی سبب بھی موجود تھا ۔ وہ یہ ہے کہ ملک کو ایک ایسی صحیح قسم کی عالمگیر زبان کی

ضرورت تھی جو ملک کے اندر پیدا ہو، جس کا ایک دامن، فارسی اور دوسرا ملکی بولیوں سے بندھا ہو اور جو سندھ، پنجاب، بنگال، بہار، اڑیسہ، یوپی، راجپوتانہ، سی پی، برار، مدراس، دکن، بمبئی اور گجرات میں یکساں طور پر بولی اور سمجھی جائے، اگر بولی نہ بھی جائے تو سمجھی ضرور جائے جس کو مرکزیت کا شرف بھی حاصل ہو اور جس کا آغوش شوق، آئندہ داخل ہونے والی، انگریزی، فرانسیسی، اطالوی، ہسپانوی اور پرتگالی زبانوں کے لئے بھی ہمہ وقت وا رہے، جو لفظ اس میں داخل ہو، دودھ میں شکر کی طرح گھل کر، ایک جان ہو جائے اور پھر ممیز نہ کیا جا سکے اور جو ملک کی لنگوا فرینکا بن کر سارے ہندوستان کو واحد قومیت کے رشتے میں منسلک کر دے۔ چنانچہ ملک کے فطری مطالبے نے اپنے قومی بطون، اپنی صوبائی بولیوں کے قلب کے ہیجان، اپنی آوازوں کی لفظ بن جانے کی آرزو سے ایک نئی زبان بنا لی جو صورت، سیرت، تلفظ، اور لہجے کے اعتبار سے خالص ہندی نژاد اور ہندوستان کی بیٹی ہے۔

امیر خسرو جو تیرھویں صدی عیسوی میں پیدا ہوا تھا اور ۱۳۲۵ء میں راہی ملک بقا ہوا اور جس نے بلبن سے لیکر کئی غلام و خلجی بادشاہوں کے عہد دیکھے، لسانیات کا ایک بے بدل عالم تھا۔ اس نے بعید ترین مستقبل کو نظر میں رکھ کر خالق باری کی شکل میں ایک لغاتی پیشین گوئی کی جو آج زبان کی تاریخ میں دور آغاز کے نشان راہ نما کا کام دیتی ہے یہ کتاب عربی، فارسی، ترکی، بھاشا، اور گورمکھی الفاظ کے تغیر و تسکر کرنے اور کرتے رہنے کی تاکید کی، پہلی کامیاب کوشش ہے۔ اس تصنیف نے بھاشا کے الفاظ کو فارسی سے قریب تر کر دیا اور اس طرح اس عظیم الشان تحریک کا سنگ بنیاد رکھا جس کا تکملہ نظیر کی شخصیت کے لئے مخصوص تھا۔ دنیا میں لغات کا یہ پہلا مجموعہ ہے جو کسی قوم کے نصاب میں داخل ہوا اور سبقاً سبقاً پڑھایا گیا۔ یہ آج سے کچھ مدت پہلے تک

ہمارے بچوں کے نصابِ تعلیم میں داخل تھا اور اس کے پڑھنے والوں نے ملک میں اپنے فضل و کمال اور اپنی بے تعصبی اور رواداری کے ڈنکے بجوا دیئے۔ اس نوع کی تصانیف میں، خالق باری کے علاوہ، خسرو نے پہیلیوں، کہہ مکرنیوں، دو سخنوں اور دیگر اصنافِ سخن کا ایک کثیر و بیش بہا مجموعہ چھوڑا ہے جس میں اس نے اپنی فطری موسیقی کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے اور جو آج اُردو کے کلاسکس کا مرتبہ رکھتا ہے۔ خسرو کے نازک اندام پودے میں سات سو برس کا وسیع و سربلند، سایہ دار، مہمان نواز برگد بن جانے کی صلاحیت موجود تھی جو دنیا کے سامنے متشکل ہو کر آئی۔ خسرو کے بعد کبیر (۱۴۴۰ — ۱۵۱۸) نے اس راز کو سمجھا اور اس قومی تحریک کا جھنڈا اپنے متبرک ہاتھ میں لیا۔ فارسی اور بھاشا کے گنگا جمنی میل سے نئی زبان کی صورت گری میں حسبِ مقدور اعانت کی۔ خود بھاشا کے مصنفوں نے رواداری اور فراخ دلی سے کام لیا۔ فارسی اور بھاشا کا امتزاج اور ریختے کی تشکیل برابر جاری رہی۔ ملک محمد جائسی (۱۵۴۰) نے اپنی مشہور تصنیف پدماوت اور تلسی داس (۱۵۵۰ - ۱۶۲۴) نے اپنے دوہروں میں فارسی الفاظ داخل کئے۔ یہ طریقہ فارسی لفظوں کو ریختہ کا روپ دینے اور زبان کی قومی تحریک کو سرسبز کرنے کی ایک مخلصانہ کوشش تھی۔ رفتہ رفتہ اکبر کی صلاح کار او فیضی، خانخاناں اور ٹوڈرمل کی زریں تدبیر بارور ہوتی رہی۔ جہانگیر نے تلک لگا کر، پان کھا کر، راکھی باندھ کر ہند و تمدن کی، لفرسی کو دربار کی آرائش بنایا اور شراب کا نام رام رنگی رکھا۔ دکن کے سلاطین اپنی جگہ اپنا فرض انجام دیتے رہے۔ دکن میں شعرا پیدا ہوئے اور نئی زبان میں طبع آزمائی کرتے رہے۔ آخر کار اورنگ زیب کے عہد میں جو امانت ولی دکنی (۱۶۶۸ — ۱۷۴۴) تک پہنچی اس کا نام ریختہ تھا۔ یہ زبان فارسی اور برج بھاشا کے بین بین ایک نئی صورت تھی۔ ولی اور اس کے متاخرین نے زبان کو جیسا پایا ویسا ہی برتا۔

اس وقت تک اس میں اظہار خیال کی پوری گنجائش نہ تھی۔ میر و سودا نے سلاست، محاورے کی صفائی اور بندش کی چستی کا التزام کیا مگر بھاشا کے الفاظ کو جوں کا توں رکھا ساتھ ہی یہ بھی کوشش جاری رکھی کہ بھاشا کے جتنے نئے الفاظ ریختے میں شامل ہو کر مانوس ہو سکیں ملا لئے جائیں۔ زبان کو وسیع کرنے کا خیال ہر وقت ان کے پیش نظر تھا۔ اس کی بہت سی مثالیں ان بزرگوں کے کلام میں موجود ہیں۔ خواجہ میر درد جو ریختے کا مشہور صوفی شاعر ہے اسی نظریئے کا حامی تھا۔ اس نے بھاشا کے الفاظ میں الٰہیات اور تصوف کی روح پھونکی۔ چونکہ وہ سماج میں پیر طریقت اور دلی شہر میں امیر کبیر کی حیثیت رکھتا تھا لوگوں نے اس کی پیروی کو سعادت سمجھا۔

خسرو جس جادے کا راہ نما، اور ولی، سودا، میر، میر درد جس کے نشانات راہ ہیں، نظیر اس منزل کا منتہا ہے۔ بھاشا کے الفاظ کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں، ریختے کے ساتھ فطری طور پر ملا جلا کر مانوس و مقبول بنا لینا اگر کسی معیار یا مقصد کا نام ہے تو نظیر اس کا منطقی نقطہ نظر یا آئیڈیل ہے۔ بھاشا کے اتنے الفاظ نظیر کے کلام میں نظر آتے ہیں کہ بعض وقت یہ دھوکا ہونے لگتا ہے کہ وہ خالص اسی زبان کا شاعر تھا۔ ارتقا اصل میں ایک تسلسل کا نام ہے اور اس فلسفے کی نظر سے کسی مقام کو منتہا نہیں بنایا جا سکتا۔ نظیر کے متعلق اس گنجلک کو دور کرنے کے لئے کسی قدر وضاحت درکار ہے۔ نظیر کو اس تحریک کی آخری غزل اس لئے کہا گیا ہے کہ اس کے بعد سے اس رویئے میں انحطاط شروع ہو گیا۔ جس دور کو اردو کی صفائی کا دور بتایا جاتا ہے وہ اصل میں اس کی تنگ دامانی اور تنزل کا دور ہے۔ دلی اور لکھنؤ کے اساتذہ خصوصیت سے وہ جن کو آزاد نے دور سوئم اور چہارم میں جگہ دی ہے، روک ٹوک اور حد بندی کے حامی رہے۔ مصحفی، جرأت، انشا، ناسخ اور آتش اور متنا خر دور میں ذوق نے بھی، ریختے میں قطع و برید کا کام جاری کر دیا۔ انشا کا اثر غیر شعوری طور پر بہت کارگر ہوا۔ وہ خود بہت سی صوبائی زبانیں مثلاً پوربی پنجابی بھاشا

وغیرہ خوب جانتا تھا، اس نے ان زبانوں میں شعر بھی کہے ہیں مگر اُسے بھاشا سے کوئی خاص ہمدردی نہ تھی۔ اس کی ایک تصنیف کا نام "کہانی ٹھیٹ ہندی میں" ہے مگر اس میں بھی اس نے اُردو کا محاورہ استعمال کیا ہے۔ ان سب باتوں کا مقصد خود نمائی تھا۔ بھاشا نوازی نہ تھا۔ بیشک، وہ علم اللسان کا ماہرِ اعظم تھا، دریائے لطافت لکھ کر اس نے لفظی تحقیق اور محاورے کی جانچ کا باب کھولا اور لسانی تنقید کا مذاق پیدا کرنے کی کوشش کی مگر بھاشا کی حمایت پر کہیں زور نہیں دیا۔ خود اس کے سنجیدہ کلام میں بھاشا کا کوئی اثر نمایاں نہیں۔ اس کا نظریہ نظیر کے نظریئے سے قطعی جداگانہ تھا۔ نظیر نے بھاشا کے الفاظ قبول کرکے اُردو کو اتنا فائدہ نہیں پہنچایا، جتنا انشا نے بھاشا کے الفاظ ترک کرکے نقصان پہنچا دیا۔ انشا کی طرح، نظیر خود بھی دورِ سوئم میں شمار کیا جا سکتا ہے مگر دلی، لکھنؤ کی فضا پر اس کا کوئی اثر نہ تھا۔ ان مقامات پر جنھیں اب شاہی اثر کی وجہ سے مرکزیت اور رہنمائی کا فخر حاصل تھا، انشا کی علمیت کا رعب اور اس کی شخصیت کا اثر چھایا ہوا تھا۔ ان وجوہ اور اس کے درباری اعزاز کے دباؤ نے اسکی تقلید کو فیشن بنا دیا تھا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اس کا نقطۂ نظر مقبول ہوگیا اور نظیر کا جو اس کے چند سال بعد تک زندہ بھی رہا، عام طور پر مقبول نہ ہوا۔ آخر کار وہ بیش از بیش سرمایہ جو ولی، سودا، میر، میر درد اور نظیر نے بہ ہزار اہتمام و دشواری جمع کیا تھا۔ جنسِ کاسہ بن کر، رفتہ رفتہ ضائع ہوگیا۔

بھاشا الفاظ کے استعمال اور زبان کی صحت و سند کے بارے میں میر امّن کی نثر مستند مانی جاتی ہے۔ مشہور ہے کہ سر سید نے "آثار الصنادید" لکھتے وقت میر امّن کا معیار سامنے رکھا تھا۔ یہ گمان غالباً صحیح ہے لیکن میر امّن نے اپنا معیار کہاں سے اخذ کیا۔ باغ و بہار ۱۸۰۱ء کی تصنیف ہے اور نظیر نے ۱۸۳۰ء میں رحلت کی۔ نظیر کا آخری زمانہ، میر امّن کے شباب کا زمانہ تھا۔ باغ و بہار کی زبان میں نظیر کی زبان کے اثرات صاف جھلکتے

نظر آتے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ شاہجہاں آبادی نوجوان نے اکبرآبادی سادث کی تقلید اپنے سرمایۂ افتخار اور اپنی شہرت و مقبولیت کا ذریعہ سمجھا ہوا استاد کی شاہراہ پر چلنا، نئی راہ بنانے سے زیادہ آسان ہے اور اگر چلنے والے میں ذاتی ہمت و حوصلے کا جوہر بھی ہو، تو وہ اُسی شاہراہ کے کنارے نئی نئی عمارتیں تعمیر کرکے اپنی شخصیت کی اٹل یادگار قائم کرسکتا ہے۔

ہمہ دانی کے اجزا

ہاں، تو اب دیکھنا یہ ہے کہ نظیر کی ہمہ دانی کے اجزاء کیا ہیں۔ اس کی فطنت کا پرتو اس کی زبان پر کس طرح پڑا اور اس نے رشتے کے خزانے میں کیا سرمایہ لاکر جمع کیا۔ اس کا مفصل جواب تو کلام ہے جس کے غائر مطالعے کے بغیر، ان حقائق کا عرفان دشوار ہے۔ سرسری یہ ہے کہ کلام کے ہر اعلیٰ و ادنیٰ جزو میں اس کے نظریئے کا عکس موجود ہے۔ عربی و فارسی اور علوم متداولہ میں اُسے کامل دستگاہ تھی۔ جہاں اس نے اپنی علمیت کا اظہار کرنا چاہا ہے وہاں ایسے شعر بھی کہہ دیئے ہیں جو فارسی محاورے اور ترکیب کی کسوٹی پر پورے اُترتے ہیں۔ پروفیسر شہباز کا خیال ہے کہ وہ سنسکرت بھی جانتا تھا۔ کلام میں بھی کہیں کہیں اس کی شہادت مل جاتی ہے۔ ایک خمسۂ ہفت زبان بھی کلیات میں ہے۔ اس میں فارسی و عربی بندوں کے علاوہ پانچ بند ایسے ہیں جو ہندوستان کی پانچ مختلف بولیوں میں کہے گئے ہیں۔ صوباتی بولیوں کے الفاظ کلام میں اور بھی جگہ جگہ پائے جاتے ہیں۔ بھاشا کے الفاظ کی یہ فراوانی ہے کہ نقد و نظر کے دوران میں ان کا گنوانا محال ہے۔ ان کا مطالعہ ایک مفصل فرہنگ کی مدد کے بغیر ممکن نہیں۔ ہندو دیومالا، تصوّف اور مذہب کے اثر میں جو نظمیں کہی گئی ہیں ان کی زبان سراپا ہندو مذاق کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ کرشن جی کے جتنے صفاتی نام نظیر کی زبان پر ہیں۔ عقیدت سے عقیدتمند ہندو، انھیں بہ یک وقت نہیں گنوا سکتا۔ زندگی کے عملی و کاروباری شعبے کو دیکھیے تو روٹی۔ چپاتی۔ کوڑی۔ پیسے۔ مفلسی۔ امیری کا ذکر موجود

بنے۔ آیئے دال کی دوکان کھلی ہوئی ہے۔ پسرہٹا سجا ہوا ہے۔ تل کے لڈو، گزک، گگڑی، تربوز بک رہے ہیں اور ہر جنس پر ہندی نام کا پرچہ لگ رہا ہے۔ زندگی کے مدارج میں دلچسپی ہے تو ہندوستان کی طفلی، جوانی، بوڑھاپا سامنے ہے۔ نفس کے کوائف کے زیر و بم کا مطالعہ مقصود ہے تو خوشامد، شہر آشوب، مکائد دنیا، آدمی نامہ پڑھ لیجئے۔ ہندوستانی کردار، ہندوستانی زبانیں بولتے سامنے آجائیں گے۔ موسم، منظر، تہواروں میں دلچسپی ہے تو ہندی جاڑے، بہار، گرمی، برسات، اُمس، آندھی، چاندنی، اندھیری، عید، شبرات، بسنت، ہولی، دوالی کا سماں بندھا ہوا ہے۔ اصلیت کی ہو بہو تصویریں موجود ہیں۔ عرفان، تصوف، عبرت، نصیحت، محبت عقیدت کے جلوے دیکھتے ہیں تو، فنا و بقا، کلجگ، جھونپڑا، تنبیہہ غافلاں، مذمتِ دنیا، بیان فنا، بیان موت، بے ثباتی دنیا، حمد، نعت، مدحت، منقبت پر نظر ڈال جائیے، ہندوستانی فطرت کے رموز سے شناسائی ہو جائے گی۔ سپہگری کے فن سے اُسے پوری واقفیت ہے اس کے ہندی قلعے ہیں جنہیں وہ گڑھ اور کوٹ کے نام سے موسوم کرتا ہے پورا سلح خانہ موجود ہے اور اس میں ہندی ناموں کے ساتھ سارے ہتھیار میسّر آتے ہیں۔ اس کا سپاہی ترک یا افغان نہیں ہے، پورا پکّا راجپوت ہے۔ وہ مُلکی رسموں زیوروں اور جواہر کے ہندی ناموں کا فریفتہ ہے اور ان پر سو جان سے قربان ہے۔ لہو و لعب کی دنیا میں اُسے قُلقُل، بٹیر، بُلبُل لڑانے، کنکوے بازی، تیراکی، سب فنوں میں مہارت ہے۔ اہل فن کی طرح، ان سب کی اصطلاحیں اس کی زبان پر ہیں۔ چڑیوں کے ہندوستانی نام اور جبلّت سے اُسے علم الحیات کے عالم کی سی واقفیت ہے۔ اس نے ان کے خصائل و مدارج بھی معیّن کر رکھے ہیں اور انھیں خدمتیں بھی سپرد کر دی ہیں۔ کبوتروں کی قسموں اور پانی کی ہبتوں کا اُسے کبوتر باز اور ملّاح کی طرح علم ہے اور وہ انکے

ہندی ناموں ہی سے ان کا ذکر کرتا ہے۔ وہ رِند سے رِند کو رِندی کا فن، اس کی اصطلاحیں اور اس کے نشیب و فراز سکھانے کو تیار ہے۔ اس کے باغ میں ہندوستان کی بہار، یہیں کے پرند، یہیں کے پھل، پھول اور پودے ہیں۔ باغبان سے زیادہ اُسے پھولوں کے اقسام اور پھلوں کے انواع پر عبور ہے۔ اس کی بزمِ عشرت میں جو زیادہ تر ہولی کے رنگین موقع پر برپا ہوتی ہے، ہندوستانی موسیقی اپنے تال، سم اور راگنیوں سے دنیا کو جنت بناتی ہے۔

نظیر کی زبان نظیر کی بصیرت، فطرت کی بصیرت گاہ کے ملاءِ اعلیٰ پر جلوہ نما تھی اور اس کی زبان اس کی بصیرت کی ہم آہنگ ہے۔ اس کے خیالات اور الفاظ کا ایک ہی مرتبہ ہے۔ اس نے جو زبان اختیار کی ہے وہ اس کے تخیل کے شایانِ شان، اس کے ہم رنگ اور اس کے مصارف کی حامل ہے۔ خیال و زبان میں بیگانگی اور شعر یا نظم کے مختلف لفظوں میں تباین و تنافر، ناہمواری و عدمِ یکسانیت کی جو عام شکایت بہت سے شعرا کے خلاف رائج ہے اور جو شعر کو شہپارے کی جگہ بھیانک بنا دیتی ہے نظیر کے خلاف ممکن نہیں۔ اس قسم کا کوئی عیب اسکے کلام میں ڈھونڈھے نہیں ملتا۔

شاعر کے بصائر کو صوتی شکل میں نمودار و مؤثر ہونے کے لئے گویائی کی مدد اسی طرح درکار ہے جس طرح قلب کے گداز کو بروئے کار آنے کے لئے نغمے کی اور جس طرح گداز کی شدت نغمے کا اثر متعین کرتی ہے اسی طرح بصیرت کا بلوغ، لفظوں پر اپنا پرتو ڈالتا ہے۔ خود بخود ایسے ہی الفاظ منتخب ہوتے ہیں جو اپنے پیکر میں پیغام کا بار اُٹھانے کی قوت رکھتے ہوں۔ چنانچہ نظیر کے ہر لفظ پر اس کی شخصیت کی مُہر ثبت ہے۔ گفتار کا تنوع، الفاظ کی بوقلمونی کا ضامن بن جاتا ہے۔ چنانچہ الفاظ کی کامل واقفیت اور اُن کے استعمال پر ہر طرح کی قدرت بھی نظیر کا فطری ودیعہ یا اسکے تخیل کی

ندرت و شگفتگی، وسعت وسیری، ترنم و موسیقیت کا دوسرا پہلو ہے۔ جس کو الفاظ پر اس نوع کی قدرت حاصل ہو اس کے فصاحت مآب ہونے میں کیا کلام ہو سکتا ہے۔ جس کا ذخیرۂ لغات شمار کے حدود سے پرے ہو، اس کے علم کو اجتہاد اور اس کے وقوف کو سحر کہنے میں کیسے باک ہو سکتا ہے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ نظیر کی لسانی قدرت اس کی حکیمانہ بصیرت کا منطقی نتیجہ ہے اور اس کی زبان اس کے اپنے آرٹ کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے۔

اس کی زبان کے اجزا کی بناوٹ غور کے قابل ہے۔ اس کے سارے افعال، بیشتر صفات، بہت سے اسمائے صفات، لفظوں کا ربط و تناسب، لفظوں کا دروبست، ترکیبوں کا التزام، جملوں کی ساخت، فقروں کی بناوٹ، محاوروں کا اسلوب و انداز، کہاوتوں کا رنگ ڈھنگ، روزمرّہ کا پرواز، ابتذال کا لب و لہجہ، عبارت کی نشست، یہ کچھ بھاشا کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے۔ زبان اپنی شکل و شباہت، طرز و انداز، صوتی اثر میں فارسی سے زیادہ بھاشا سے مشابہ ہے۔ اس کی ہندوستانی زبان، اسکی ہندوستانی فطرت کا عکس ہے۔ اس کے الفاظ، اس کے لئے مخصوص ہیں۔ اب ان کی اہمیت پر غور کیجئے۔ ان کی موسیقی، ان کی پُراثری، ان کے سوچ کا یہ عالم ہے کہ مغنی کی دلربائی، نقاش کی نظر فریبی اور بت تراش کی آذریت ان کے سامنے گرد ہے۔ ان کی موسیقی، صرف ستار کے مرتعش نغمے کی دیوانہ گر شیرینی یا بانسری کی لے کی دل میں تیر جانے والی سُریلی لہروں کا رسیلا پن ہی نہیں، ان کے تاثر میں صرف وہ متمول رنگینی و تابانی ہی نہیں جو راوی دریا کے ہندی نژاد نقشوں کو زندہ جاوید اور ذوقِ حسن نگر کے لئے دنیائے رعنائی و جمال بناتی ہے، ان کے سانچے میں ڈھلے ہوئے لوچ میں زرّیں پھولوں والے پنگوڑے کی سی لطیف رعنائی اور تاج کی خواب آور مرمریت کی سی نرمی و ملائمت ہی نہیں بلکہ وہ سرخوشی، جوش اور روحانیت ہے جو مردہ دل کو زندہ کر دیتی ہے اور جو نظیر کا اپنا رنگ و جمال ہو کر رہ گئی ہے۔ جس طرح

ہندوستان کے عہد قدیم کے کسی بت تراش نے اپنے نفس کی ساری طمانیت و سرخوشی، بدھ کے متین و خموش چہرے میں بھر دی ہے جو آرٹسٹ کے قلب کی حیات کی طرح، ڈھائی ہزار برس کی مدت مدید کے بعد، آج بھی بدھ کے چہرے پر دمک رہی ہے، اسی طرح نظیر نے اپنی روح کی تُندی و سبیت اپنے لفظوں میں سمو دی ہے۔ اس کا ہر لفظ، دل کا گیت ہے، سچا گیت ہے اور ہندوستان کا گیت ہے۔

مخمورؔ اکبرآبادی

سندیسہ

اُردو زبان اور ادب ہمارے بزرگوں کا وہ کارنامہ ہے جس کی ترقی ہماری سعادت کا باعث ہے۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ اُردو کی بہتری چاہنے والے اس کی ضرورتوں پر سنجیدگی سے غور کریں زبان اور ادب کو ایسی راہوں پر ڈالیں تاکہ سارے دیس والے اس کی طرف جھکیں۔ اسے اپنی چیز سمجھیں اور اس سے محبت کریں۔ ایک زمانہ تھا جب اُتری ہندوستان کے ہندو اور مسلمان ادیب اور شاعر ایک طرف برج بھاکھا یا اودھی اور دوسری طرف اردو زبان کو سیکھتے اور پڑھتے تھے اور اُن کو اپنے خیالوں کو ظاہر کرنے کا ذریعہ مانتے تھے برج اور اودھی میں جہاں سورداس اور تلسی جیسے کوی ہوئے وہاں رس خان رحیم رس لیں اور ملک محمد جائسی جیسے شاعر بھی ہوئے۔ ان کے علاوہ سیکڑوں مسلمان لکھنے والوں نے برج اور اودھی کی شاعری کو اپنے کارناموں سے مالا مال کیا۔ مسلمان شاعروں کی نظموں کو پڑھیے تو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کوئی بدیسی کسی دوسرے ملک کی تہذیب کے اثر میں شعر لکھ رہا ہے۔ اگر سری کرشن کی تعریف ہے تو اس میں وہی بھگتی اور پریم جھلکتا ہے جو کسی عقیدت مند ہندو کی شاعری میں ہے۔ نایک نائکہ بھید۔ بارہ ماسے۔ افسانے لکھے ہیں تو انکا پورا ماحول ہندی ہے۔ ہندی معشوقوں کے خط و خال کو ہندی استعاروں اور کنایوں میں بیان کیا ہے۔ ہند کے موسموں کی خوبیوں اور خرابیوں کی تصویریں کھینچی ہیں اور ہند کے سورماؤں کی بہادری اور ہندی دیوانوں کے عشق کی داستانیں بیان کی ہیں۔

اسی طرح اُردو میں ایک بہت بڑی تعداد ہندو ادیبوں کی ہے جنہوں نے اُردو ادب کی ترقی میں اچھا خاصہ حصہ لیا ہے منشی ولی رام

جو شاہجہاں کے دور میں تھے اور دارا کے مشیر خاص تھے۔ عربی۔ فارسی اور ہندی (اُردو) میں شعر کہتے تھے۔ پُرانے اُردو تذکرہ نویس شاعری کی تاریخ کو تین دور میں تقسیم کرتے ہیں اور ہر دور میں ہندو شاعروں کے نام لکھتے ہیں رائے آنند رام مخلص اور ٹیک چند بہار مشہور فارسی لغت بہار عجم کے مصنف پہلے دور کے شاعر ہیں۔ بندرابن راقم، سرب سنگھ دیوانہ، جسونت سنگھ پروانہ دوسرے طبقہ میں گنے جاتے ہیں۔ میر حسن نے اپنے تذکرہ میں کئی ہندو شاعروں کے نام دیئے ہیں اور تھوڑے لیکن پختے ہوئے لفظوں میں ہر ایک کی تعریف کی ہے۔ ایک دو نمونے یہ ہیں:-

عزیز شاعر زبان دان منشی خوش بیان، غنچۂ باغ تمیز رائے بھکاری داس المتخلص بہ عزیز سیل طبیعتش رواں و توسن خامہ اش دواں مرد لیست سیاہ فام وجسیم مشتاق قدیم از شاگردان خواجہ میر درد مولدش شاہجہاں آباد و از مدتے در الہ آباد بسر میبرد۔ سلامت باشد۔

لالہ نول رائے۔ مقبول خاطر ارباب صفا لالہ نول رائے المتخلص بہ وفا از تذکرۂ قائم چناں ظاہر گشت کہ جوانے است نو خاستہ بہ زیور علم و عمل آراستہ ہوش و گوش و فہم و ذکا صاحب علم و حیا لطافت مزاج از گل زیادہ مانند بلبل دل از دست دادہ۔ برادر خوردش راجہ گلاب رائے دیوان مدار المہام امیر الدولہ نواب نجیب خاں مرحوم بود لیکن ایں عزیز مصروف اکتساب و غریق مطالعہ کتاب طلب ہر کمال دامنگیر حال طبع دردمند داشت عاشق مزاج بود اکثر فارسی و ریختہ می نماید خدا بر عمرش بیفزاید۔

ہر صنف شاعری میں ہندو شاعروں نے طبع آزمائی کی ہے۔ اور جب تک اردو ادب زندہ ہے۔ نسیم۔ سرشار۔ چکبست۔ برق۔ سرور جہان آبادی، پریم چند کے نام اس سے وابستہ رہیں گے۔

جس طرح ہندی کے مسلمان شاعروں نے ہندی رسموں رواجوں اور روایتوں کو شاعری میں جگہ دی، اُسی طرح اردو کے ہندو شاعروں پر اسلامی خیالات کا اثر پڑا۔ اصل یہ ہے جیسا کہ مولوی محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں بیان کیا ہے جب ہندی میں شاعری ہوتی تھی تو ہندو اور مسلمان دونوں ایک خاص لیکن مشترک اور یکساں طرز اختیار کرتے تھے اور یہی صورت اردو شاعری کی تھی۔ غرض یہ کہ زبان اور ادب کے معاملہ میں رویہ یکساں تھا ہندو مسلمان کی تفریق نہ تھی۔

اردو زبان اور ادب کی ابتداء تیرھویں صدی سے ہوتی ہے۔ اس سات سو برس کے عرصہ میں اس نے بہت سے رنگ بدلے۔ پہلے پانچ سو برسوں میں اردو زبان اس ادب کی زبان تھی جس میں بناوٹ کم اور اصلیت زیادہ تھی۔ نثر اور نظم مذہبی روایتوں اور خیالوں کے اظہار کے لئے کام میں لائی جاتی تھیں۔ سادھو سنت اور صوفی درویش اسی کے ذریعہ انسانی محبت اور ایشور کے پریم کا سبق دیتے تھے۔ قصیدے۔ مرثیے۔ مثنویاں مسلسل نظمیں زیادہ لکھی جاتی تھیں۔ غزلیں کم تھیں۔ زبان سادہ تھی۔ عوام کی بولی کے نزدیک تھی۔ لفظوں کے چننے میں یہ خیال نہیں کیا جاتا تھا کہ اصل سنسکرت ہے یا بھاشا یا فارسی یا عربی۔ ان سب زبانوں کے لفظوں کو اسی طرح لکھتے تھے جیسے بولتے تھے۔ غرض یہ کہ اٹھارھویں صدی تک زبان اور ادب میں دیس کی عام زندگی کا عکس صاف نمایاں تھا۔ اٹھارھویں صدی میں اردو دلی کی بناوٹی درباری فضا میں پہنچی۔ یہ وہ وقت تھا جب مغلیہ سلطنت کا زور گھٹ رہا تھا اور ہر طرف زوال کے آثار ابھر رہے تھے عیش و عشرت کی زندگی نے اخلاقی بنیادوں کو ہلا دیا تھا۔ خود غرضی اور آپا دھاپی نے بزدلی اور کمزوری پیدا کر دی تھی۔ درباروں میں جو لوگ جمع ہوتے تھے نہ ان کے ارادے بلند ہوتے تھے نہ ان کے دلوں میں جوش اور حوصلہ تھا۔ شراب، ناچ رنگ رلیاں اور شاعری دل لگی اور وقت ٹالنے کا ذریعہ

تھیں۔ عوام کی زندگی سے ادب کا تعلق کم تھا۔ اس لیئے اس میں ایک خاص بناوٹ آگئی تھی۔ یہ حالت غدر کے زمانے تک دلی اور لکھنؤ کی رہی۔

جان جاناں مظہر نے یہ نظم ڈھایا کر دیس کی زندہ زبان کو بدیسی قالبوں میں ڈھالنا شروع کیا۔ تاہم اور اس کی رائے سے اتفاق کرنے والوں نے اختلاف بھی کیا لیکن کچھ پیش نہ گئی۔ اردو کا وہ سرمایہ جو بھاشا اور فارسی کے نمونے سے تیار ہوا تھا متروکات کے اصولوں کے اثر سے ہندوستانیت کو چھوڑ کر فارسیت میں محدود ہونے لگا۔ ایک خاص طبقہ اس زبان پر حاوی ہوگیا اور اسی کے خیالوں کا ادب میں ترجمہ ہونے لگا۔ بے ربط اور بے سلسلہ بیتوں کے مجموعوں کا جنھیں غزل کہتے ہیں اتنا رواج ہوا کہ ادب اس کے بوجھ سے دب گیا۔

آج ہمارے ملک میں نئی زندگی کی لہریں اٹھ رہی ہیں۔ زندہ زبان اور زندہ ادب کے لئے لازم ہے کہ اس کا اثر قبول کرے۔ جس جگہ سے مظہر نے پرانی اردو کی باگ کو موڑا تھا اور ایک عجیب راستہ پر ڈالا تھا ہمیں اپنی طرف پھیرنا چاہیئے۔ اس لئے کہ اردو کو بول چال کے محاورے کے قریب لانے ہی میں زبان کی ہر دلعزیزی بڑھے گی اور اس کے اثر کا حلقہ زیادہ وسیع ہوگا۔ زندہ بول چال کے لفظوں کو ٹکسال باہر کرنے سے زبان بیکار اور بناوٹی ہو جاتی ہے۔ جتنے بھاشا کے لفظ آئیں گے اتنا ہی اردو کا خزانہ بڑھے گا اور خیالوں کی نزاکتوں کو ادا کرنے کی طاقت بڑھیگی جتنا ہی ہندو مسلمانوں میں ایک دوسرے کو سمجھنے اور ایک دوسرے سے خیال تبدیل کرنے کی خواہش زیادہ ہوگی اتنا ہی زبان کو تنگ دائرے سے باہر نکالنے کی ضرورت ہوگی۔ سماجی تعلقات کو بڑھانے اور گہرائی لانے کے لئے سماج کے سب ٹکڑوں کو ملیا کئے بغیر کس طرح کام چل سکتا ہے۔ سماجی ہمدردی ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہوئے بنا پیدا نہیں ہو سکتی۔ اور جب تک ایک کی بات دوسرے کے دل میں پہنچے

تب تک کیونکر میل جول ہو سکتا ہے۔ میری دلی خواہش ہے کہ "انجمن ترقی ادب" ان سوالوں پر غور کرے گی۔ زبان اور سماج کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ انجمن کے سامنے جب تک ہندوستان کی سماج کا کوئی نقشہ نہیں ہے تب تک اس کے لئے زبان اور ادب کے مسئلہ کے حل کی کنجی نہیں ہے آج ہمارا دیس سماجی گتھیوں میں الجھا ہوا ہے ان کو سلجھانے میں زبان اور ادب ایک بڑا زبردست آلہ بن سکتے ہیں۔ میں اس جلسہ میں شرکت کرنے والے ادیبوں سے درخواست کرتا ہوں کہ ایسے ذریعے سوچیں جو ہمارے ملک سے بیر اور پھوٹ کے بس کو نکالیں اور سب ہندیوں کو محبت کے ایک رشتہ میں باندھیں۔

آپ کا حکم تھا کہ میں بھی اپنا ناچیز سندیسہ اس جلسہ کی خدمت میں پیش کروں امید کرتا ہوں میرے چند لفظ دوستوں کی خاطر پر بھاری نہ گذرینگے۔

نیازمند

تاراچند (ڈاکٹر)

خیالات پریشاں

۴۸۶
———
۴۸۷

کتب قدیمہ میں شعر کی تعریف صرف اس قدر مندرج ہے۔

(۱) کلام موزوں جو متکلم نے موزوں کیا ہو۔

(۲) شاعری ایک تخئیل کا نام ہے۔

(۳) نظامی عروضی سمرقندی نے چار مقالہ میں شاعری کی نسبت لکھا ہے کہ۔ شاعری صنعت کہ شاعران بداں صنعت اتساقِ مقدماتِ موہومہ کنند و التسام قیاس منتجہ بر آں وجہ کہ معنی خرد را بزرگ و بزرگ را خرد۔ و نیکو را در لباسِ زشت و زشت را نیکو جلوہ دہد و با ایہام قوتِ غضبانی و شہوانی برانگیزد و تا بداں ایہام طبائع را انبساطے و انقباضے بود۔

(۴) شاعری وہ ہے جس سے جذبات انسانی برانگیختہ ہوں۔

(۵) شاعری ایک مصوری یا نقالی ہے۔

(۶) جذبات و احساساتِ عائدہ کا ایک خاص طریقہ سے استدلال اور استنباط شاعری ہے۔

(۷) محبت اور غضب الفت اور کراہت کی قوتوں کا بطریق موزوں استعمال میں لانا شاعری ہے۔

(۸) شاعری ایک صداقت اور راستی ہے۔

(۹) شاعری ایک وجدانی اور ذوقی چیز ہے۔

(۱۰) جو جذبات الفاظ کے ذریعہ سے ادا ہوں وہ شعر ہے۔

(۱۱) ہر چیز جو دل پر استعجاب یا حسرت یا جوش یا اور کوئی خاص اثر پیدا کرے شعر ہے۔

(۱۲) شاعری وہ ہے جس میں صرف اپنے جذبات ادا کئے جائیں۔

(۱۳) شاعری مطالعہ نفس کا نتیجہ ہے۔

(۱۴) شاعری ایک قدرتی جذبہ ہے۔

(۱۵) شاعری احساسات اندرونی و بیرونی کا ایک نقشہ ہے فقط۔

مرسلہ

سید وقار علی عروج اکبرآبادی

عفی اللہ عنہ

قصائد و قطعات وغیرہ

چمنِ نظم تحفۂ انجمنِ روحِ ادب

۱۹۴۱ء

(۲۳۱ سے ۲۴۶ تک)

غزلیاتِ مشاعرہ

گلبرگِ غزلیاتِ روحِ ادب

۱۹۴۱ء

(۲۴۷ سے ۲۸۸ تک)

زیرِ صدارت

عالیجناب دیوان پنڈت رادھے ناتھ صاحب کول رئیس

المتخلص بہ گلشن

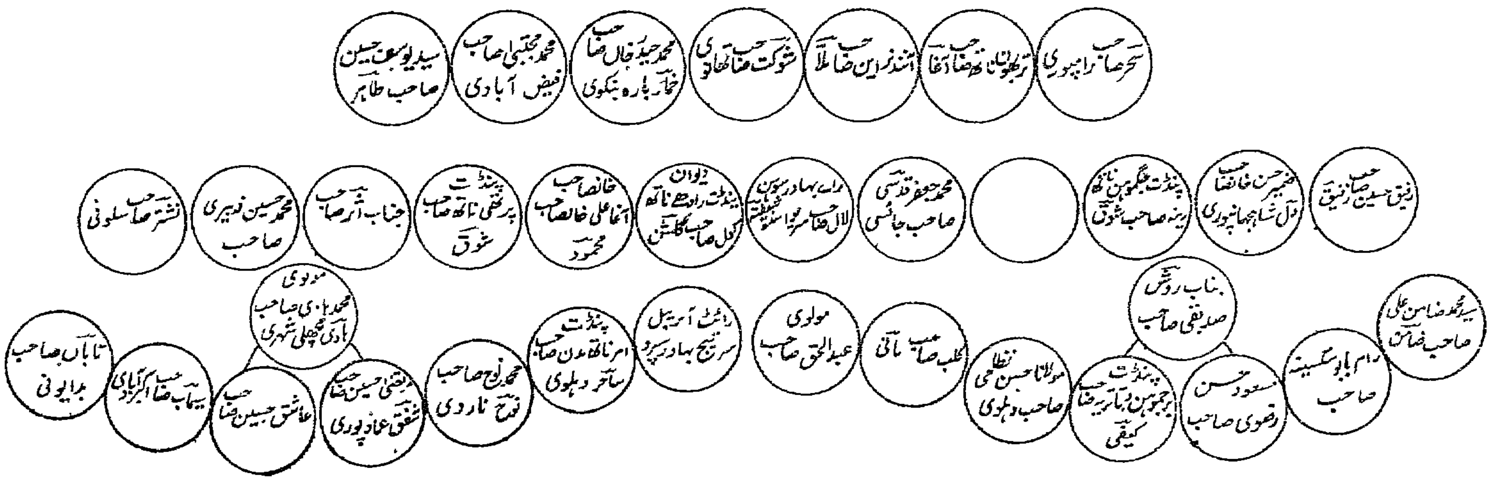


گروپ شعرائے شیریں مقال و نثاران جادو نگار

شعرائے شیریں مقال و نثاران جادو نگار

جلسہ افتتاحیہ انجمن روح ادب (رجسٹرڈ) منعقدہ ۲۱ دسمبر ۱۹۴۱ء

بمقام زمیندار ایسوسی ایشن ہال۔ الہ آباد (یو۔ پی)



قطعہ تاریخ براکرام نمودن غزل ازپیش گاہ اعلیٰ حضرت سلطان العلوم، سلطان الشعرا، حکیم السیاست، ہز اکزالٹڈ ہائی نس رستم دوراں، ارسطوے زماں، حاتم عصر، لفٹننٹ جنرل، مظفر الممالک والممالک، حضور پر نور، نواب میر عثمان علی خان بہادر، فتح جنگ، سپہ سالار، معین السلطنت برطانیہ، نظام الدولہ، نظام الملک، آصف جاہ، جی۔سی۔ اس۔آئی، جی۔ بی۔ ای نظام حیدرآباد دکن و برار خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ

قطعہ در صنعت توشیح

از نتیجۂ فکر کپتان پروفیسر سید محمد ضامن علی صاحب ضامن صدر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی
نائب صدر انجمن روح ادب

م مہر سپہر جود و کرم خسرو دکن — سردار خلق و سایۂ رب انام ہے س
ی یاد خدا سے روح کو بالیدگی نصیب — پر بادۂ ولا سے سدا دل کا جام ہے پ
میر۔ ر رہتا ہے اس سے باغ تمنا ہرا بھرا — رنگیں سواد آرزوے دل مدام ہے ر
ع علم و ہنر پہ ہے جو نظر التفات کی — واقف جہاں میں اس سے ہر اک خاص و عام ہے و۔سپہر
ث ثانی نہیں ہے کوئی بھی جسکا میان دہر — ایسا کریم وہ شہ عالی مقام ہے ا
م مہر سپہر علم سیاست وحید عصر — بالاتفاق جس پہ فلک احتشام ہے سپا
ا ابر بہار فیض و کرم مرجع انام — والاصفات خسرو شیریں کلام ہے و۔ ابو
عثمان۔ ن نکلی جو بات منہ سے وہ سکہ بٹھا گئی — معراج ہے زباں کی ملوک الکلام ہے م
ع عزت فزاے اردو و تازی و فارسی — حامی ہر اک زباں کا وہ ذوق انتظام ہے ح

ل لاریب ذاتِ اقدس و اعلیٰ ہے بےنظیر — مداح جس کا دل سے ہر اک صبح و شام ہے م
علی - ی یہ چاہے گر تو پھیر دے تقدیر خلق کی — دورِ جہاں کی ہاتھ میں اسکے زمام ہے د - محمد
ط ظاہر ہوئی بہارِ کرم دل ہے باغ باغ — روحِ ادب کا آج معطر مشام ہے ر
خل - ل [illegible] در سے اپنے عطا کی ہے جو غزل — وہ آیتِ کلام بلاغت نظام ہے و
ا اشعارِ کیف زا میں مضامیں جو ہیں بلند — حاصل سخن کو ان سے عروجِ دوام ہے ح - روح
ل لطف و کرم سے خسروِ جوہر شناس کے — اردو زباں ہر ایک صحیفہ ثنا کا کام ہے ا
ل لوحِ جبینِ نظم پہ شاہِ سخن لکھا ہوا — دیکھو! حضورِ آصفِ سابع کا نام ہے د
اللہ - ہ ہاتف یہ دے رہا ہے ندا از سرِ ادب — بزمِ سخن کی جان کلامِ نظام ہے ب - ادب

در پیش گاہ سلطانی اعلیٰ حضرت سلطان الشعرا نواب

میر عثمان علی خان بہادر نظام الملک خلد اللہ ملکہ و سلطنتہٗ

از نتیجۂ فکر جناب سید محمد ہادی صاحب ہادیؔ مچھلی شہری ایڈوکیٹ الہ آباد

شہِ اقلیمِ دکن مرجعِ ہر پیر و جواں — عدل و انصاف سے تیرے ہے زمانہ حیراں
تو سمجھتا ہے سیاست کے فراز اور نشیب — تاجِ شاہی کو ترے فرقِ مبارک سے ہے زیب
تو وہ سلطاں ہے کہیں جس کو رعیت پرور — تو وہ انساں ہے کہیں جس کو شرافت کا ہنر
علم پرور ہے تری ذاتِ گرامی ایسی — جس کی تمثیل زمانے میں نہ دیکھی نہ سنی
ہمہ دانی سے تری فضل کو رعنائی ہے — دست پروردہ ترے فکر کی دانائی ہے
شاعری میں بھی ہے حاصل یدِ طولیٰ تجھکو — کیا غلط ہے جو کہیں ذوق سراپا تجھکو
جس طرح مہر میں تابش بھی ہے تنویر بھی ہے — سوز بھی ہے ترے اشعار میں تاثیر بھی ہے
طبعِ موزوں جو ہے آورد کی زحمت سے بری — نقطے نقطے میں ہے آمد کی عجب جلوہ گری
معنویت بھی ہے تخئیل بھی ہے رنگ بھی ہے — کیف بھی ہے ترے اشعار میں آہنگ بھی ہے

تاج اور تخت کا ساماں بھی ملا ہے تجکو
ذوق بھی فضل بھی عرفاں بھی ملا ہے تجکو

مصدر جود و سخا لطف و عطا بھی تو ہے
عین منزل بھی ہے اور راہنما بھی تو ہے

اہل عرفاں کو ترے فیض سے حاصل ہے بقا
پرورشگاہِ ادیباں در دولت ہے ترا

دم جاں بخش ترا غنچۂ دل کو ہے نسیم
تشنۂ لطف کو ہے تیری نوازش تسنیم

ہے توجہ تری بالیدگی دل کی کفیل
تابشِ رخ ہے تری مہر منور کو دلیل

اللہ اللہ ترا ذوق نظر شوق جمال
نہ بچا تیری توجہ سے کوئی اہل کمال

ذرہ ذرہ ہے ترے مہر عطا سے تاباں
سب پہ ہے سایہ فگن تیرے کرم کا داماں

بحر بخشش نے تری دہر کو سیراب کیا
تو نے ہر ذرۂ ہستی کو گہر تاب کیا

تھا یہ ادنیٰ سا ترے لطف و توجہ کا اثر
حیدرآباد بنا قرطبۂ علم و ہنر

کون سی آنکھ ہے جس میں نہیں تنویر تری
کون سا دل ہے کہ جس میں نہیں تصویر تری

تو نے بخشا جو اسے حاصلِ سامانِ حیات
مل گئی نزع کی تکلیف سے اردو کو نجات

تنِ مردہ میں عجب شان سے جان آئی ہے
اس کو کہتے ہیں توجہ یہ مسیحائی ہے

مرکزِ فضل ہے منزل گہِ عرفاں ہے تو
تیرے قربان عجب شان کا سلطاں ہے تو

ہے تری انجمنِ روح ادب پر بھی نگاہ
اس کا کیا پوچھنا تو جس کی بنے پشت پناہ

شاد باش ایکہ بما ایں سر و ساماں دادی
ذرہ را تابشِ خورشید درخشاں دادی

دیگر

ملکِ تلک دکن آئینۂ صدق و صفا
مصدرِ جود و کرم جمیع الطاف و عطا

آپ کے عہد میں ہے ساری رعیت خوشحال
آپ کی ذات گرامی ہے خدا کا سایا

آپ کے عدل سے روشن ہوا انصاف کا نام
آپ کے رحم سے قائم ہوئی راحت کی فضا

آپ کے ملک میں ہیں جور و ستم بے پر و بال
ظلم کا لفظ لغت میں بھی نہیں مل سکتا

آپ ہیں مصدرِ علم آپ ہیں ملجائے ادب
آپ کا فضل ہے دنیا کے لئے راہ نما

آپ کی ذات سے ہیں شاہی و عرفاں توام
دونوں کو آپ سے حاصل ہے مقام اعلیٰ

آپ کا ذوق ہے وہ جوہر تقنیت جس سے   ملتی ہے دہر میں اظہار معانی کو غذا
فضل ہے فضل وہ ہے آپ سے نسبت جسکو   علم ہے علم وہ جو آپ کے دامن میں پلا
آپ وہ جوہر معانی ہیں کہ تابش جس کی   اہل دل کے لئے ہے صیقل آئینہ تھا
آپ سے پہلے بھی تھا بانی الوالعزم ہوئے   علم کے نام پہ اتنا نہ کسی نے بھی دیا
علم کی راہ میں دونوں سے تھا ایک سلوک   آپ نے اپنے پرائے میں نہ کچھ فرق کیا
آپ کی داد و دہش کی کوئی حد ہی نہ رہی   علم کی راہ میں اسراف بھی جائز سمجھا
مرکز علم بھلا کون سا ہے کوئی بتائے   آپ کے جود و عطا سے جسے حصہ نہ ملا
آپ کی فکر ہے وہ ذرے جو اسطرلاب کو سبق   آپ کا علم ہے وہ جس پہ ہے تکمیل فدا
بارگہ آپ کی ہے مرجع عرفان و دلیل   تشنۂ علم کو ہوتا ہے جہاں نشو و نما
فضل ہے بہرۂ الطاف و توجہ کیوں ہو   آپکے لطف و نوازش نے پلٹ دی کایا
آپ کے دامن الطاف میں پلتا ہے کمال   قطرہ آپ ہی بن جاتا ہے دُرِ یکتا
کون ہے آپ کی بخشش کا جو اندازہ کرے   آپ کے در کا ہے حاتم بھی اک ادنیٰ سا گدا
آپ کے عہد میں افزائش امید جو ہے   بیم کو پاس پھٹکنے نہیں دیتی ہے رجا
اللہ اللہ یہ مسیحا نفسی کی تاثیر   آپ کے عہد میں کوئی نہیں محتاج دوا
آپ کا در ہے کہ ہے مرجع ارباب خرد   آپ کی ذات ہے یا جود و عطا کا دریا
حیدرآباد بنا قرطبۂ علم و ہنر   پرتو فضل سے روشن ہوا ذرہ ذرہ
آپ نے علم کی ڈالی ہے وہ محکم بنیاد   گردش چرخ ہلا سکتی نہیں جسکو ذرا
دہر سے مٹ گیا تھا نام سخاوت کا مگر   آپ کی داد و دہش نے اسے پھر زندہ کیا
آپ کی ذات گرامی سے ہے دنیا واقف   آپ کے نام سے مانوس ہے بچہ بچہ
کون ہے وہ جو پھرے آپ کے در سے ناکام   کون ہے وہ نہ ملا جس کو عقیدت کا صلہ
کون ہے جس کی بر آئی نہ تمنائے دلی   کون ہے آپ کی بخشش سے جو محروم رہا
کون ہے جس کو نہیں آپ کے احساں [illegible]   جس کی شہرت سے ہے گونجا ہوا گوشہ گوشہ
کوئی سمجھا ہی نہ تھا بذل و عطا کے معنی   آپ کے دست مبارک نے سبق سب کو دیا
آپ کی ذات سے اردو کو ملی تازہ حیات   مٹ گیا اس کی تباہی کا جہاں سے کھٹکا

آ پڑے آئی جو نگاہ کرم سلطانی — نہ رہا خوف اسے اپنی تباہی کا ذرا
آپ کے لطف و عنایت کی جو دولت ہے نصیب — کوئی اب کہہ نہیں سکتا ہے بے برگ و نوا
آفتاب اس کی ترقی کا نہ کیونکر ہو بلند — ہٹ گئی اسکو جو گھیرے تھی مصیبت کی گھٹا
جس پہ قربان ہو ارباب محبت کی نگاہ — آپ نے شاہد اردو کو وہ زیور بخشا
جس کی تنویر سے روشن ہو دلوں کی دنیا — جس کی پڑ جائے نظر اس پہ کہے صل علیٰ
آپ کی انجمن روح ادب ہے ممنون — آپ نے اس کو محبت کی نظر سے دیکھا
اپنے افکار گہر بار سے عزت بخشی — لکھ کے خود اپنا کلام اپنے قلم سے بھیجا
جس قدر ناز کرے انجمن اس پر کم ہے — یہ وہ اعزاز ہے جو غیر کو حاصل نہ ہوا
آپ کے لطف و نوازش کی کوئی حد ہی نہیں — نہیں ممکن کہ ہو شکر اس کا کسی طرح ادا
پاس شاعر کے ہے کیا آپ پہ قرباں جو کرے — یہی ہر وقت کیا کرتا ہے البتہ دعا
ہر مصیبت سے رہیں آپ ہمیشہ مامون — رہے ہر دم سر اقدس پہ خدا کا سایا
دشمن دولت و اقبال رہیں خار و ذلیل — آپ کی ساری رعیت رہے پابند وفا
آپ جو چاہیں وہی آپ کو حاصل ہو جائے — آپ کے قصد سے توام رہیں احکام قضا
آپ کے حکم کی دنیا رہے منقاد و مطیع — آپ کی فکر ہو عالم میں سیاست کی بنا
غیر ممکن ہے کہ محتاج تو جہ رہ جائے — در دولت کا ہے یا دربھی اک ادنیٰ سا گدا
آپ کی اک نگہ لطف کی ہے بات فقط — پھر تو بدبخت کا شکوہ نہ مقدر کا گلا

ہمہ اوقات بکام تو شود گردش چرخ
شامل حال مقاصد بود لطف خدا

دیگر

خسرو ملک دکن نازش ارباب کمال — آپ کی ذات گرامی کی نہیں کوئی مثال
آپ کے قدموں سے ہے تخت شہی کی عزت — تاج کو فرق مبارک سے ہے حاصل جلال
آپ کی شان سیاست کی ہے ادنیٰ یہ دلیل — آپ اگر چاہیں تو مشرق سے چلے باد شمال
آپکے رنگ طبیعت کا ہے محتاج عروج — لوٹتا آپ کے قدموں میں ہے ہر دم اقبال

سابقہ آپ کے انصاف سے پڑتا ہے اگر — بھول جاتا ہے فلک ظلم و تعدی کی چال
آپ کا عدل ہے وہ صیقلِ اندوہ ربا — جمنے دیتا نہیں دل میں جو ذرا گرد ملال
عہد میں آپ کے راحت کی جو افزائش ہے — جس کو دیکھو وہ ہے نادیدۂ اندوہ و نکال
آپ کا ملک ہے وہ مزرعِ امید و خوشی — بڑھتی ہے عمرِ مسرت کی جہاں سال بسال
ذرہ ذرہ ہے یہاں امن و اماں سے توام — آنکھ آسیب دکھائے یہ کہاں اسکی مجال
تازگی سے نظر آتی ہے ہر اک چیز بھری — ہے کسی کو تو ستم کو ہے فقط اضمحلال
ذرّے ذرّے میں تبسم کی جھلک ہے پیدا — اس جگہ دل میں گزرتا ہی نہیں غم کا خیال
عدل کہتے ہیں اسے شانِ سیاست ہے یہی — آپ کے ملک میں ذرہ بھی نہیں ہے پامال
علم محتاجِ توجہ تھا مگر داد رسے لطف — اس کے چہرے کو کیا آپکی پرسش نے بحال
دولتِ علم سے ہے آپ کو حاصل تخصیص — ورنہ رکھتا ہے ہر اک شاہ متاعِ زر و مال
علم کی راہ میں جب داد و دہش ہو ایسی — کیوں زمانہ نہ کرے اس سے بھلا استدلال
بے طلب علم کی خدمت کے لئے دیتے ہیں آپ — ذوقِ بخشش نہیں ہوتا کبھی پابندِ سوال
آپ کے جود و عطا کو ہے بہانہ کافی — سنئے بخشش کے رہا کرتے ہیں ہر دم منوال
آپ نے ڈالی ہے اردو پہ کرم کی جو نگاہ — کون کر سکتا ہے اب اسکا بھلا استیصال
آپ کے سایۂ دامن میں نہ سرسبز ہو کیوں — کیوں نہ پروان چڑھے باغِ جہاں میں نہال
آپ کے لطف کریمانہ سے لے علم نواز — کیوں نہ ہو انجمنِ روحِ ادب بھی خوشحال
اسکی امیدوں کے بھی منزلِ مقصود ہیں آپ — آپ ہی کی نگہِ لطف کا ہے اب تو سوال
سخت مشکل میں ہے کیا آپ پہ قرباں کر دے — پاس ہا آدمی کے نہ دولت ہے نہ زر و نہ مال
چند اشعار ہیں البتہ عقیدت کی دلیل — پیش کرتا ہے جنھیں با دلِ آئینہ مثال

ہوں جو مقبول تو اس کا بھی مقدر کھل جائے
ورنہ بیکار ہے اس کے لئے سب اس کا کمال

دیگر

بہی خواہان اُردو را چہ عہد خوشگوار آمد
کہ از شاہ دکن پیمان لطف بے شمار آمد
کسے چشم نہ کشا داز تعصب جانب اردو
نگاہ لطف سلطانی مگر بہ روئے کار آمد
خوشا خورشید معنی کز فروغش دہر روشن شد
خوشا مہر حقیقت کز برش نصف النہار آمد
ز نظم و نثر آں عالی ہمم بر صفحۂ اُردو
برائے دیدگان نقش و نگار جلوہ بار آمد
ز انفاس طرب افزا و عنبر بار سلطانی
بہ گلزار ادب نسمات جاں بخش بہار آمد
ز اشعارے کہ آمد پیش ما از بارگاہ اُو
چنیں مشکے نہ ہرگز از رہ ملک تتار آمد
ز حرف و نقطہ و الفاظ در اشعار سلطانی
نگاہ اہل بینش را بہت رنگیں نمدار آمد
از ایں بہتر چہ باشد مژدہ دل سوزان اردو را
کہ آب رفتہ اش دیگر بسوئے جوئے بار آمد
ز حرف ہمت افزائے شہ عارف نظر ہادی
زبان نغز اُردو را متاع اعتبار آمد
بخواں در گلشن اُردو ز راہ فیض سلطانی
بہار آمد بہار آمد بہار آمد بہار آمد

قطعہ در معذرت عدم شرکت مشاعرہ انجمن ترقی ادب

از جناب ابو المعظم نواب سراج الدین احمد خاں صاحب سائلؔ جانشین حضرت داغؔ دہلوی مرحوم

فلک کے جور سے سائلؔ ہوں اسقدر مجبور کہ باوجود مکرر طلب ہوں دور کا دور
گواہ رکھتا ہوں اک مخلص معزز کو جو مجھکو دیکھ سکے رنجور ہو گیا رنجور
وہ کون نیک نسب خوش حسب عزیز از جان باعتبار خلوص و محبت موفور
وہ کون خوان کرم جس کا ہے طویل و دراز ہیں جس کی دہر میں مہماں نوازیاں مشہور
وہ کون جو ہے جگر گوشۂ علی و بتول ہے جسکے گھر کی کنیز کہ ہر اک بہشت کی حور
وہ کون جو ہے معلّم ادب کی دنیا کا ہے ناز اس پہ کہ پھٹکا نہیں ہے پاس غرور
وہ کون خُلق کے جذبوں سے جسکے انجمن ہمیشہ ہوتی ہے اہل کمال سے معمور
وہ کون جس کے دہن میں زبان تنگ شکر زمانہ ہوتا ہے اُس کے کلام سے مسرور
وہ کون جس کا تخلص علم لقب ضامن[1] غزل میں اردو کا ہے وہ ظہورؔ[2] نیشاپور
وہ کون دیتا ہے جو بے دریغ داد سخن برنگ عارفؔ[3] و آشفتہؔ[4] و عزیزؔ[5] و سرورؔ[6]
وہ کون رکھتا ہے سر تیج[7] بھی عزیز جسے جو نامور ہے صفت سے جو ذات سے ہے غیور
مراسلات طلب سے ہوں منفعل جسکے بوجہ اس کے کہ تعمیل میں ہوا ہے قصور
یہ فرض جانا کہ منظوم عذر پیش کروں ہو جس سے قلب و دماغ سخنوراں مسرور
بصد نیاز لکھوں خط بخدمت سر تیج شکستہ پائی کا میری ہے ایک تو یہ قصور
نزول ماکی ہے آنکھوں میں دوسری تقصیر کہ لکھنے پڑھنے سے مجبور ہوں بسان کور
بدلنی چاہوں جو کروٹ بھی آپ نا ممکن مبالغہ ہے نہ اس میں نہ کوئی مکر نہ زور

۱۔ ایکمان سید محمد ضامن علی صاحب ایم۔ اے صدر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی
۲۔ تخلص شاعر مشہور۔ (۳ و ۴ و ۵ و ۶) تخلص شعرائے مشہور۔
۷۔ رائٹ آنریبل ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو کے۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ پی سی

عریضہ میرا ہے تفصیل عرض کا اجمال — نہیں ہے تاب سفر مجھ میں اور اتنی دور
جو پوچھے مجھکو سلام اُن سے میرا کہدیجے — مزید مجھ پہ عنایت ہو یہ ضرور ضرور
دعا پہ ختم کرو سائل اس چکامہ کو — خدا کے فضل کا "سرنہج" آ تجھ پہ دیکھیوں ظہور
کرم خدا کا ہو شامن کے شامل احوال — نوازے دونوں کو لطف و عطا سے رب غفور
برمحل یہ مصرعۂ غالب دل سائل میں ہے — ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

معذرت نامہ

از لسان القوم جناب مولانا سید علی نقی صاحب صفی لکھنوی

بزم "روح ادب" کے روح رواں — ہیں یہ اصحاب نامور ذی شاں
اولاً صدر انجمن وسیم تیج — والہ شاہد سخن سر تیج
محسن اُردو زباں کے فخر زمن — نغمہ سنج بہار صبح وطن
ثانیاً خان بہادر ذیجاہ — علم و فضل و ہنر کے پشت پناہ
نائب صدر "ابو محمد" نام — آسمان ادب کے ماہ تمام
ثالثاً ضامن خجستہ سیر — شمع بزم ادب سخن گستر
بانی بزمگاہ "روح ادب" — اور اُردو زباں کے خیر طلب
رابعاً انجمن کے سب ارکاں — جو ہیں اُردو ادب کے مرتبہ داں
ہیں سبھی انجمن کے خیر اندیش — کہ ترقی ہو اس کو بیش از بیش
اسے اندیشۂ شکست ہے کب — کہ رجسٹرڈ ہے یہ بزم ادب
محکم اس انجمن کی ہے بنیاد — مرکز اس کا ہے خاص الہ آباد
ایک سالانہ جلسہ ہوگا جہاں — آئیں گے دور دور سے مہماں
دی ہے مجھکو بھی دعوت شرکت — جاؤں کس طرح غیر ہے حالت
سال بھر سے ہوں اس قدر بیمار — دو قدم چل سکوں یہ ہے دشوار
اسلیے حاضری سے ہوں معذور — کر سکوں کا سفر نہ اتنی دور
نہ پہونچنے سے شرمسار ہوں میں — اور معافی کا خواستگار ہوں میں

بہ زبان شکستہ خامہ
ہے صفی کا یہ معذرت نامہ

"کلام الملوک، ملوک الکلام"

غزل از نتیجۂ بلند پروازیٔ ہمای فکر عالی متعالی مستغنی عن الالقاب، سلطان العلوم، حکیم السیاست، ہز اگزالٹڈ ہائی نس، رستم دوراں، ارسطوی زماں، حاتم عصر، لفٹننٹ جنرل، مظفر الملک والممالک، حضور پُرنور نواب سر میر **عثمان علی** خاں بہادر، فتح جنگ، سپہ سالار، معین السلطنت برطانیہ، نظام الدولہ، نظام الملک، آصف جاہ، جی۔سی۔اس۔آئی، جی۔بی۔ای نظام حیدرآباد (دکن) و برار خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ، جس کو اعلیٰ حضرت نے اپنے دست مبارک سے زیب قرطاس فرماکر از راہ نوازش خسروانہ جناب صدر اعظم لفٹننٹ کرنل نواب سر محمد احمد سعید خاں، کے۔سی۔اس۔آئی، کے۔سی۔آئی۔ای، ام۔بی۔ای، ایل۔ایل۔ڈی، کے توسط سے ادیب کامل و حامی زبان اُردو جناب رائٹ آنریبل ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو، پی۔سی، کے۔سی۔اس۔آئی، ڈی۔سی۔ایل، ایل ایل ڈی، صدر انجمن روح ادب الہ آباد کے پاس انجمن کے افتتاحی اجلاس منعقدہ ۲۱ر دسمبر سنہ ۱۹۴۱ء کے مشاعرے میں پڑھنے کے لئے ارسال فرمائی۔

غزل آصف ہفتم غیر مطبوعہ

مطلع
گلوں کا رنگ بھی نکھرا ہوا بہار میں ہے — عجیب نغمۂ بلبل بھی مرغزار میں ہے
یہ یاد آگئی کس کی کہ کر دیا بے چین — تڑپتی روح بھی کہتی ہوئی مزار میں ہے
ذرا تو پوچھ لے ساقی سے راز کو اسکے — عجیب لذتِ مستی بھی جو خمار میں ہے
نشاط و عیش کا جلوہ دکھا رہی ہے شگفتہ — صبا جو محوِ خرام آج لالہ زار میں ہے

مقطع
یہ قبضہ کہتا ہے سن لے تو آج اے **عثمان**
نوید فتح بھی پوشیدہ ذوالفقار میں ہے

غزلیات پرنس پرار

میں نہ تھا تو مرا زمانہ تھا
ہر زباں پر مرا فسانہ تھا

ان کا چرچا ہے اب زمانے میں
مرے دل کا بھی اک زمانہ تھا

میری حالت پہ مسکرائے تم
میری قسمت پہ مسکرانہ تھا

دیکھتے ہو مرے گریباں کو
اپنا دامن تمھیں بچانہ تھا

ہچکیوں میں مری دمِ آخر
دردکا آخری فسانہ تھا

وہ جو بدلے بدل گئی دنیا
نہ وہ ہم تھے نہ وہ زمانہ تھا

دل کے مٹنے پہ مسکراتے ہو
اس سے پہلے ہی مسکرانہ تھا

رحم آتا نہ آتا ان کو شجیع
حالِ دل تم کو کہہ سنانا تھا

دیگر

حجابِ ناز سے صورت دکھائی جاتی ہے
نظر سے تابِ نظر آزمائی جاتی ہے

میں بے نیازِ تمنا ہوں لو مبارک ہو
جہاں سے رسمِ تمنا اٹھائی جاتی ہے

وہ ظلم کر کے بلاتے نہیں نظر مجھ سے
نظر میں آہ کی تاثیر پائی جاتی ہے

اسی کو ہم تو سمجھتے ہیں یادگار ان کی
وہ اک خلش جو محبت پہ چھائی جاتی ہے

شکایتِ غمِ دل پر وہ مسکراتے ہیں
نئی طرح سے شکایت مٹائی جاتی ہے

فراق میں نظر آنے لگیں جنوں کی حد
اب ان کی بزم بھی نزدیک آئی جاتی ہے

حجابِ حسن کی تکمیل ہو سکی نہ شجیع
ابھی خیال میں صورت دکھائی جاتی ہے

کلام فصاحت نظام حامی علم و ادب، مربی فن و ہنر مجمع اوصاف و ہنر عالیجناب خان بہادر راجہ محمد امیر احمد خاں والی ریاست محمود آباد۔ دام اقبالہ

کلیجہ شام تنہائی میں منہ کو آیا جاتا ہے
ہجوم نامرادی ہے بس، کہ جی گھبرایا جاتا ہے

جہانِ درد میں اچھا نہیں دل کا دکھا دینا
یہ مانا تم نہ سمجھو گے مگر سمجھایا جاتا ہے

تمنا تھی اگر جلوے کی اے موسیٰ تو پھر یہ کیا
ادھر بجلی چمکتی ہے اُدھر غش آیا جاتا ہے

وہاں ہے ناز خودداری یہاں تابِ تواں گم ہے
نہ وہ آتے ہیں مجھ تک اور نہ مجھ سے جایا جاتا ہے

نہیں کفرانِ نعمت یہ تو آخر اور پھر کیا ہے
وہ تسکیں دے رہے ہیں، مجھکو رونا آیا جاتا ہے

کسی کے ظلم کی پرسش نے محشر کر دیا برپا
فسانہ زندگی کا آج پھر دُہرایا جاتا ہے

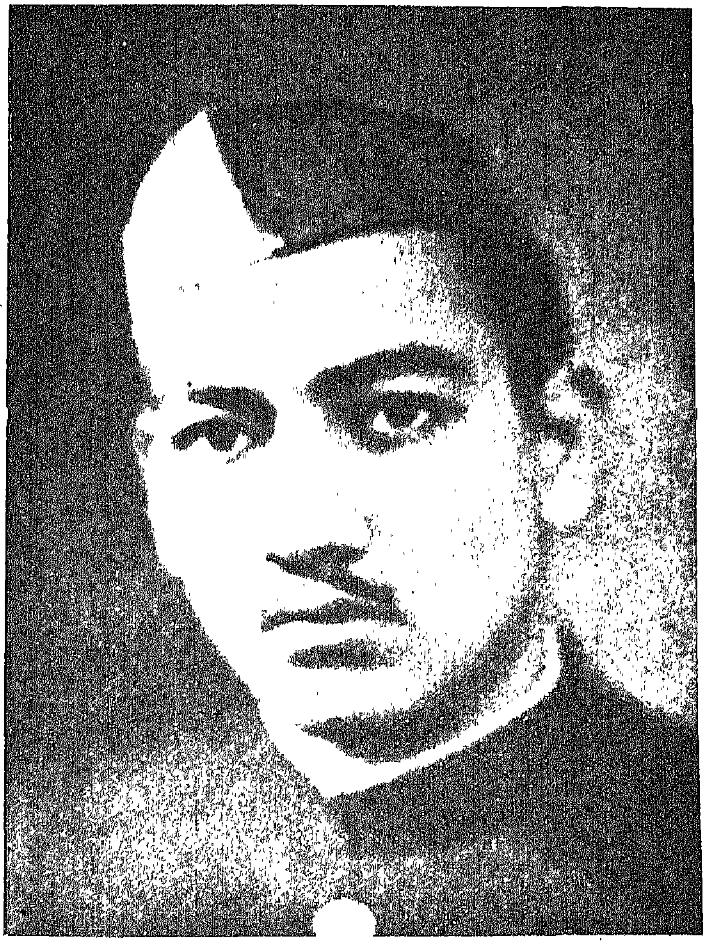
زمانے کا یہی دستور ہے اے دل نہ شکوہ کر
تڑپنا جس کو آتا ہے وہی تڑپایا جاتا ہے

عجب انداز ہیں محبوب بزمِ نازِ عالم کے
جو کل بیٹھا تھا دلبن کر وہ آج اٹھوایا جاتا ہے

اُٹھے گا اسے چمن والو کلیجے سے دھواں برسوں
چلا وہ ایک لمحے میں بستا جو آشیاں برسوں



عالی جناب راجہ امیر احمد خاں صاحب بہادر۔ تعلقدار محمود آباد



عالی جناب مہاراجکمار امیر حیدر صاحب بہادر محمود آباد

چھپایا ہے قفس میں رہکے بھی رازِ نہاں برسوں
ارے او باغباں کھولی نہیں میں نے زباں برسوں
میری پیشانیِ قسمت کو دیکھ اے بھولنے والے
جبیں کی سجدہ گہ تھا تیرا سنگِ آستاں برسوں
نشیمن جل گیا دھبا سا شاخِ گل پہ باقی ہے
رہے گا داغِ دل بن کر نشانِ آشیاں برسوں
قفس کی قید میں اے جان دینے والے گھٹ گھٹ کر
ترے نالوں کو ڈھونڈے گا گلستانِ جہاں برسوں
کہاں پہلو نشینی و ہیر استعداد ہوتی ہے
نہ سمجھا معنیِ دردِ محبت رازداں برسوں
چمن میں رہکے کیا کیجے توازن شادی و غم کا
بہار آئی اگر دو دن تو ٹھہری ہے خزاں برسوں
ہے اوروں کو بھی محبوبؔ ادعائے نالہ سامانی
کوئی کہدے ابھی سیکھیں میرا طرزِ فغاں برسوں

غزل۔ مصنفۂ محمد امیر حمید رخاں محمود آباد

نہ کر ترکِ وفا اے جاں بلب، جو کچھ بھی ہو جائے
جو ہونا تھا ہوا، کیا ڈر ہے اب جو کچھ بھی ہو جائے
جفا اجرِ وفا ٹھہری وفا ہم بھی نہ چھوڑینگے
پھر اب ظلم و ستم، قہر و غضب، جو کچھ بھی ہو جائے
خطا کی تھی، پشیمان بھی ہیں اور توبہ بھی کرتے ہیں
قسم لو ہم سے اس بارے میں اب، جو کچھ بھی ہو جائے
مریں چاہے جئیں لیکن قدم پیچھے نہ رکھیں گے
ہمارا حشر اے راہِ طلب، جو کچھ بھی ہو جائے

محبّت تو ازل سے فطرتِ انساں میں داخل ہے
بظاہر اس کا دنیا میں سبب جو کچھ بھی ہو جائے
محبّ آج اپنی حیات و موت کا کچھ فیصلہ ہو گا
مسیحا بن کے وہ آتے ہیں، اب جو کچھ بھی ہو جائے

لن ترانی کی صدا ہے اور پردہ بھی نہیں
آج جب بجلی چمکتی ہے تو موسیٰ بھی نہیں
میری آنکھوں میں ہو اور پھر بھی نظر آتے نہیں
کیا غضب ہے، مجھ سے پردہ بھی ہے پردہ بھی نہیں
دل تو دل ہے اک ذرا سی آنچ میں سرمہ ہوا
پردہ دارِ سوزِ الفت طورِ سینا بھی نہیں
اب وہاں ہوں میں جہاں یکتائیِ غم سے ہے کام
تم تو تم ہو، میرے پہلو میں تمنّا بھی نہیں
یاس کی تاریکیوں میں بجھ گیا دل، بجھ گیا
آرزوئے جلوۂ برقِ تجلّی بھی نہیں
یوں ہوا برباد دل باقی نہیں کوئی نشاں
جس میں کل تک خاک اڑتی تھی وہ صحرا بھی نہیں

قطعہ تہنیت جلسہ روحِ ادب

حضرتِ سیرو کی کوشش کا نتیجہ یہ ہوا — شاعرانِ لکھنوی و دہلوی ہیں جمع سب
طاہرِ رنگیں بیاں بزمِ سخن میں کر دعا — ہو مبارک اے خدا یہ جلسہ روحِ ادب

جناب سید یوسف حسین صاحب طاہرؔ الہ آبادی

رباعی

اس بزم کو اوج فیضِ قدرت سے ہوا — اور حضرتِ ضامن کی ذہانت سے ہوا
یہ کیوں نہیں کہتے ہو عروج اسے طاہرؔ — سر تیج بہادر کی عنایت سے ہوا

قطعہ

کس نے اس روحِ ادب کو گلشنِ ایجاد میں — بارشِ رحمت کے چھینٹوں سے گل تر کر دیا
کون باغِ دہر میں بوتا رہا اُردو کے بیج — کشت زارِ شاعری کو کس نے اخضر کر دیا
کون گلزارِ جہاں میں نغمہ زن تھا رات دن — کس کی خوش گوئی نے اس عالم کو ششدر کر دیا
ذات ہے وہ ضامنؔ رنگیں سخن کی لاکلام — جس نے بزمِ شعر کو گلشن سے بہتر کر دیا
حضرتِ ضامنؔ نے اپنے علم کی تنویر سے — اس کے ہر ذرّے کو رشکِ مہر انور کر دیا
انتہائی کوششوں کے فیض لا محدود سے — جلسہ روحِ ادب کو روح پرور کر دیا
کیوں نہ ضامنؔ بول بالا ہو جہاں میں آپ کا — کیسی خوبی سے یہ کام اللہ اکبر کر دیا
داد دوں اب کیوں نہ میں اُن کی تلاشِ فکر کی — قطرہ قطرہ جمع کر کے اک سمندر کر دیا
خوفِ دنیا سے نڈر کیوں کر نہ ہوں ضامن علی — ان کو حق نے داخلِ آلِ پیمبر کر دیا
بو محمد اور سر سیرو نے جب دیکھا یہ رنگ — اس چمن کو گلشنِ جنت کا ہمسر کر دیا

دیکھ کر طاہرؔ حقیقت اس کی بزمِ دہر میں
لکھ کے ہم نے قطعہ یہ نذرِ سخنور کر دیا

اس روحِ ادب کا ہو گلزار نہ کیوں رنگیں — سرسبزی و شادابی ضامن کی بدولت ہے
پھر یہ بھی کہونگا میں اس باغ پہ اے قاصر — سرتیج کا احسان ہے گلشن کی ریاضت ہے

از نتیجۂ فکر جناب مولوی محمد علی صاحب قاصر ہیڈ مولوی ماڈرن ہائی اسکول الہ آباد

قطعہ

روح افزا ہے جو یوں روحِ ادب — حضرتِ ضامن کا یہ فیضان ہے
گہ مقالہ خوانی گہ تقریر و بحث — انبساطِ روح کا سامان ہے
ان کی کوشش اسکے حسنِ سعی پہ — دل مرا سو جان سے قربان ہے
مدتوں کی پرورش اس طفل کی — جو نہ مانے اس کو وہ نادان ہے
ان کا قصر اور ان کی یہ ماہانہ بزم — شاعروں کی مشق کا میدان ہے
اسکے باعث بڑھ گیا ذوقِ سخن — ق یہ عقیدہ یہ مرا ایمان ہے
ان کی محفل سے بڑھی مشقِ سخن — ابتو یہ کہنا مجھے آسان ہے
شاعری میں بھی الہ آباد کی — رنگِ دہلی لکھنؤ کی شان ہے
انکی محفل میں ہمیشہ ہوں شریک — شاعروں سے یہ مرا اعلان ہے
محفلِ ماہانۂ ضامن میں آئیں — ناظمِ فطرت کا یہ فرمان ہے
ان کی اس بزمِ سخن کا لاکلام — شاعروں کی طبع پر احسان ہے
سر ہے جس کا بزمِ عالم میں خطاب — جو کہ اس روحِ ادب کی جان ہے
پڑ گئی اسکی عنایت کی نظر — اب ترقی کا یقیں ہر آن ہے
اسکی شہرت کا جہاں میں ایک دن — کوششِ سرتیج سے امکان ہے
یوں محمد ضامن و سرتیج سے — انجمن فضل و شرف کی کان ہے

اے خدا دن دن ترقی ہو اسے
قاصرِ عاصی کا یہ ارمان ہے

غزلیات

غزل جناب احسان دانش صاحب لاہور

چپ کھڑے ہیں درمیانِ کعبہ و بتخانہ ہم
کس سے کہدیں کس طرح کہدیں ترا افسانہ ہم

شام سے اس فکر میں ہیں ساقی و میخانہ ہم
کیسے دیکھیں گے وداعِ شیشہ و پیمانہ ہم

نغمہ و ماتم بھی دھوکا شکر و شکوہ بھی فریب
کہہ رہے ہیں جانے کیا افسانہ در افسانہ ہم

طور ٹھنڈا ہو چکا ہے آگیا موسیٰ کو ہوش
اب نہ تجھے تکلیف دینگے جلوۂ جانانہ ہم

وہ محبت ہی نہیں جس میں نہ ہوں شکوے گلے
اک کہانی تم سنائے جاؤ اک افسانہ ہم

رک چلیں احسان نبضیں آگیا ہنگامِ موت
اب یہیں سے چھیڑتے ہیں دوسرا افسانہ ہم

جناب مولوی شاہ حبیب الرحمٰن اختر فریدی سجادہ نشین دائرہ

حضرت شاہ حجۃ اللہ قدس سرہ الہ آباد

صورت و نقش و رنگ سے آئینۂ مجاز ہوں
میری حقیقت اور ہے - اور سے بے نیاز ہوں

میری حقیقت اور میں مشترکِ مجاز ہوں
آپ ہوں کارساز آپ صنعتِ کارساز ہوں

ہائے وہ فصلِ گل کہ جب نغمۂ دلنواز تھا
اب تو خزاں نصیب ہوں نالۂ جانگداز ہوں

آئی نہ تھی وجود میں تجھ سے بزمِ اولیں
ناز و نیاز کچھ نہ تھے جب میں عین راز ہوں

آئینہ - آئینہ وہ ہے جس میں نمودِ عکس ہو
راز نہیں ہوں میں - مگر وجہ کمالِ راز ہوں

بزمِ وجود کس سے ہے بزمِ وجود میں ہے کون؟
چپ نہ رہوں تو کیا کروں آئینہ دارِ راز ہوں

حضرتِ اختر اب غرض شرع کی حد کو سمجھے کیا
ملحدِ وحشت آشنا لائقِ احتراز ہوں

غزل از نتیجۂ فکر ٹی۔ این۔ آغا۔ ایڈوکیٹ واسسٹنٹ سکریٹری انجمن روح ادب الٰہ آباد

جو کچھ مری حالت ہے سب دل کی بدولت ہے
بے فائدہ دنیا میں بدنام محبت ہے

ہر بات میں پوشیدہ اک رنگ حقیقت ہے
راحت میں بھی ایذا ہے، ایذا میں بھی راحت ہے

آغازِ محبت کے پُر لطف فسانے ہیں
انجام محبت کی دلچسپ حکایت ہے

ہے طرفہ کرشمہ یہ اللہ کی قدرت کا
کثرت ہی میں وحدت ہے وحدت ہی میں کثرت ہے

جس جا میں کروں سجدہ کعبہ وہیں بن جائے
یہ جوشِ عبودیت، یہ شانِ عبادت ہے

بیمارِ محبت ہوں، جیتا ہوں نہ مرتا ہوں
میں کس سے کہوں آغا کیا میری مصیبت ہے

غزل جناب امیر حسن خاں صاحب امیرؔ رئیس مانکپور ضلع پرتاپگڈھ

فقرے جو بے خودی میں نکلے مری زباں سے
سرمایہ دارِ غم ہیں وہ خوبیِ بیاں سے

کیا شرط ابتدا ہے کیا قید انتہا ہے
قصہ لطیف ہوگا چھیڑوں گا میں جہاں سے

ممنون میں ترا ہوں اے مرگِ ناگہانی
عنوانِ زندگی ہے میری ہی داستاں سے

تاثیرِ زہر بدلو اے زہر دینے والو
مر مر نہال ہونگا میں عمرِ جاوداں سے

میں سوزِ دل کا قصہ ان سے امیرؔ کہتا
پھالے نکال دیتا کوئی مری زباں سے

غزل جناب تاباںؔ صاحب بدایونی

بے سوزِ عشق پیکرِ نشو و نما نہ ہو — جب تک جلے نہ باغ تمنا ہرا نہ ہو
احساس ہو خلش کا نہ احساس بیخودی — پہلو میں درد ہو دلِ دردآشنا نہ ہو
موجوں سے کھیلتا ہی پھروں بحرِ عشق میں — ساحل نہ ہو سفینہ نہ ہو ناخدا نہ ہو
رہ رہ کے لب تک آتی ہے اک آہ جانگداز — شاید شکستِ شیشۂ دل کی صدا نہ ہو
شانہ کرو نہ دستِ حنائی سے زلف میں — پابندِ دام طائرِ رنگِ حنا نہ ہو
وہ دیکھتے ہیں خلق میں ہر سمت دیکھنا — میں دیکھتا ہوں کوئی انھیں دیکھتا نہ ہو
ہر ذرّہ کائنات کا ہے گوش برصدا — پہلو میں سازِ دل کے کوئی بولتا نہ ہو
وہ دل ہی کیا کہ درد کی جس میں کسک نہ ہو — وہ درد کیا کہ جس کی چبھک میں مزا نہ ہو

تاباںؔ بلا ہے سوزشِ داغِ جنونِ عشق
وہ درد ہے کہ موت بھی جس کی دوا نہ ہو

(۲)

آرزوئیں دل کی تاباںؔ دشمنِ جاں ہو گئیں
میری امیدیں رہینِ یاس و حرماں ہو گئیں
جلوہ ہائے قدس میں تھیں جس قدر رعنائیاں
سب سمٹ کر پیکرِ تصویرِ انساں ہو گئیں
موت حدِ منزلِ مقصود تک پہونچا گئی
زیست کی دشواریاں مرنے سے آساں ہو گئیں
بخت اُسکا اُسکی قسمت، موت ہے اُسکی حیات
جس کے ماتم میں تری زلفیں پریشاں ہو گئیں
دیدۂ یعقوب کنعاں کا ہوا اندھا کنواں
پتلیاں پہلے تھیں اب یوسف کا زنداں ہو گئیں
اب کہاں وہ مجمع احباب وہ جلسے کہاں
کیسی کیسی صحبتیں خوابِ پریشاں ہو گئیں

پوچھنے کیا ہو کہ یہ عبرت کدہ کیونکر بسا
چند قبریں ایک جا شہرِ خموشاں ہوگئیں
دم بخود ہوں منظرِ گورِ غریباں دیکھ کر
کیسی کیسی صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہوگئیں
دل ستانے کے طریقے رہ گئے دنیا کو یاد
باتیں دلداری کی زیبِ طاقِ نسیاں ہوگئیں
کیا کہوں میں خاکدانِ عشق کی رعنائیاں
وسعتیں ذروں کی بڑھ بڑھ کر بیاباں ہوگئیں

غزل جناب چاند صاحب

مصرع طرح

مجنوں نے اُڑائی خاک بہت لیلےٰ نے نہ دیکھا محمل سے

اے قیس تو لیلےٰ دیکھ اپنی صحرا کے ذرّے ذرّے میں
محمل میں نہیں وہ پوشیدہ ۔ ہے باہر پردۂ محمل سے
اُف یا دل سے یہ میرے کیوں نکلی وہ کاش نکل جاتے سارے
نومید ہوئی امید گئی ۔ ارمان نہیں نکلے دل سے
ہے شوق تجھے تر رہنے کا اور غم نے خشک کیا دل کو
اے چشم غنیمت جان ان کو ۔ نکلے ہیں جو آنسو مشکل سے
شق کرتی ہے وہ فرش کو ۔ اور وہ عرش کے ٹکڑے کرتی ہے
ہوتا ہے اثر آتش آہ کا یہ ۔ جو آہ نکلتی ہے دل سے
آرام و سکوں سے نا واقف گردش میں رہا پیمانۂ زیست
منزل کی طلب میں پھرتے رہے محروم رہے ہم منزل سے

منزل کے قریب جب پہونچا میں، اور میرے پاؤں اُکھڑنے لگے
نومید نہ ہو میں آتی ہوں، نصرت نے پکارا منزل سے
تیرا وصل ہے جب سے نصیب ہوا میں ہوں ہستی کو اپنی کھو بیٹھا
کیا حاصل حاصل رہتا ہے جب برق سے ملتی حاصل سے
اے محو بلا توست گھبرا ساحل کو نہ ہر دم دیکھتا جا
کشتی ہی تری خود ساحل ہے تو دور نہیں ہے ساحل سے
محفل میں تری کیوں جائیں ہم کیوں تیرے ناز اٹھائیں ہم
ہم خلوت کے شیدائی ہیں ہم کو کیا مطلب محفل سے
کیا ان کو خبر کیا ان کو پتہ امواج کی لطفِ کشاکش کا
جو بیٹھے ہوئے ہیں ساحل پر جو دیکھ رہے ہیں ساحل سے
ہم فرد نہیں ہیں محفل کے ہم ایک مجسّم محفل ہیں
محفل نہ رہے گی تحفل پھر ہم کو جو اُٹھا یا محفل سے
امید بہ دل ہیں ہم اور وہ امید کے کیف سے ناواقف
ہم دیکھا رہے ہیں ساحل کو وہ دیکھ رہے ہیں ساحل سے
یہ نانا جادۂ عالم کے ہیں منتظر نادان! کیف آگیں
تو بھول نہ جا اس منزل کو آیا ہے تو جس منزل سے
معلوم نہیں شائد تجھ کو اے چاند ہے تیری ہستی وہ
اس آن جو پیدا ہوتی ہے جب حق ملتا ہے باطل سے

دیگر

نہ بلائیں ان کو جب تک تری فتنہ گر نگاہیں
مرے دل سے آرزوئیں مری کیوں نکل کے جائیں
کبھی شدتِ جفا سے گھٹتی ہیں کیا وفائیں
مرے دل کو آپ پرکھیں مجھے لاکھ آزمائیں

وہ نگاہوں سے ملائیں مری کس طرح نگاہیں
جو چرا چکے ہیں دل کو وہ نظر نہ کیوں چرائیں
نہیں تابِ دید اے دل یہ ہے بے بسی کا عالم
انھیں کس نظر سے دیکھیں وہ اگر ہمیں بلائیں
ہے یقیں یہ پھونک دیں گے ترا خرمن تغافل
میرا عشقِ شعلہ افگن میری شعلہ بار آہیں
جسے بادِ سرد مہری نے بجھا دیا ہو اکثر
بھلا کس امید پر ہم وہ چراغِ دل جلائیں
مری کشتیٔ محبت کو بھنور میں لا کے چھوڑا
نہیں نا خدا کا شکوہ کہ تھیں تند خو ہوائیں
مرے عشق کا ہے فرماں وہ نظر کے روبرو ہوں
ہے جنوں کا یہ تقاضا رہیں ڈھونڈتی نگاہیں
اگر ایک شاہراہ ہو میرا کارواں نہ بھٹکے
میں کروں تو کیا کروں ہیں کئی زندگی کی راہیں
ہو وہ تابِ دید یارب مری چشم کو میسّر
کہ ہو روبرو تجلی تو خجل نہ ہوں نگاہیں
یا بدل ہماری قسمت یا وہ اختیار دے دے
کہ گھڑھیں ہم اپنی قسمت نئی زندگی بنائیں
ہیں وہ چاند ہم مغنّی کہ ہو موم سنگِ خارہ
کبھی عین وجد میں ہم کوئی نغمہ گر سنائیں

دیگر

آئی جو اُن کی یاد تو آتی چلی گئی
دل میں نگاہِ ناز سماتی چلی گئی
بے جان دل میں جان سی آتی چلی گئی

"آئی جو اُن کی یاد تو آتی چلی گئی"
خوابیدہ ولولوں کو جگاتی چلی گئی

"آئی جو اُن کی یاد تو آتی چلی گئی"
اور آرزو سے دید بڑھاتی چلی گئی

تدبیر اپنے نقش جماتی چلی گئی
تقدیر ہے کہ اُن کو مٹاتی چلی گئی

ظاہر ہوئی وہ شیون و فریاد و اشک میں
حسرت حدیں اثر کی بڑھاتی چلی گئی

پیدا کیا نفاق ہے الفت وہ فتنہ خیز
میرے دل و خرد کو لڑاتی چلی گئی

سادہ دلی مری کہ میں پھنستا چلا گیا
دنیائے دَوں دام بچھاتی چلی گئی

میں شمع امید جلاتا چلا گیا
بادِ سموم یاس بجھاتی چلی گئی

منزل کی فکر تھی کسے اسے شورشِ حیات
عمرِ رواں کو یاد دلاتی چلی گئی

وائے آگہی کہ میں سب بھولتا گیا
فطرت کو اپنے راز بتاتی چلی گئی

تھی خیرگی نظر کی مری پردۂ نظر
تکمیلِ حسن پردہ اُٹھاتی چلی گئی

اب مٹ گئی ہے چاند تصوّر کی تشنگی
آئی جو ان کی یاد تو آتی چلی گئی

غزل جناب محمد حمید رضا خاں صاحب خمارؔ بارہ بنکوی

عشق جو پائے حسن پر جانِ حزیں گنوا گیا
زندگی جھوم جھوم اُٹھی۔ موت کو وجد آگیا

ساقیِ نازنیں مجھے آج یہ کیا پلا گیا!
حال کو نیند آگئی۔ ماضی کو ہوش آگیا

عالمِ جبر و اختیار دیکھ لیا حضورِ یار
بات بھی کر سکے نہ ہم چپ بھی نہیں رہا گیا

کر گئے پرسشِ مزاج وہ بھی خوشا نصیب آج
غم پہ خدا کی رحمتیں۔ اُن کو بھی پیار آگیا

بارے داستانِ غم کر نہ سکے بیان ہم
سعیِ بہت جو کی کبھی چہرے پہ رنگ آگیا

اُف یہ عرقِ جبیں۔ آہ یہ خشک خشک لب
بس بس اب اضطرابِ دوست۔ مجھکو قرار آگیا

رہ گئی حسرتِ کلام۔ بات نہ ہو سکی تمام
ناصح ختمِ سلام۔ پھر کوئی یاد آگیا

یار سے آنکھ لڑتے ہی زندگی یوں نکھر اُٹھی
عمرِ گم شدہ کوئی جیسے کہ ہاتھ آگیا

آس لگائے رہ گئے بتکدہ و حرم غریب
ایک نشانِ پا کہیں سجدوں سے جگمگا گیا

سحر بیانیِ خمار۔ ہو گئی نذرِ غیبِ یار
جو مجھے سہلے ہزار بار پھر بھی نہ کچھ کہا گیا

غزل نتیجۂ فکر (اعتبار الملک) حضرت دل شاہجہانپوری

دل اب وہاں ہے جہاں خود ہی مدعا ہوں میں
ہجومِ شوقِ تمنا میں گم ہوا ہوں میں

اس اضطراب پہ قربان اک جہانِ سکون
کوئی سنبھال رہا ہے تڑپ رہا ہوں میں

حریمِ ناز سے پیہم صدا یہ آتی ہے
کہ اس حجاب پہ بھی عالم آشنا ہوں میں

مری خموشیِ مجبور پر بھی ایک نظر
زباں سے جو نہ ادا ہو وہ ماجرا ہوں میں

اک آہ سرد نے صدہا کئے ہیں حشر بپا
ابھی تو دردِ محبت کی ابتدا ہوں میں

دلِ تباہ کا اب تک کہیں نشاں نہ ملا
ہر ایک ذرّہ کو حیرت سے دیکھتا ہوں میں

نشان دو مجھے اے کوئے یار کے ذرّو
یہیں کہیں کوئی شے آج کھو چکا ہوں میں

مشاہدہ کا تقاضہ ہے اب حجاب نہیں
حدودِ طور سے شاید گزر چکا ہوں میں

سنبھال اپنے دلِ مطمئن کو اے ناصح
کہ سرگزشتِ محبت سنا رہا ہوں میں

اسی سے کیجئے رفتار کا کچھ اندازہ
نظامِ دہر بدلتا ہوا اُٹھا ہوں میں

حباب بحر کی سمجھو مجھے نمود اے دل
اگر یہ وہمِ نظر ہے تو اور کیا ہوں میں

غزل نتیجۂ فکر عالیجناب صاحبزادہ راحت سعید صاحب چھتاری

کیا یاد ہیں تم کو وہ راتیں جو کٹ گئیں آنکھوں آنکھوں میں
میں بھول گیا ہوں بتلا دو کیا ہوتا تھا ان راتوں میں!

پیغامِ محبت جو تم نے نظروں سے دیا تھا مجھکو کبھی
اک بار ذرا پھر دہرا دو الفاظ کے سادہ فقروں میں،

اے میری محبت کی دنیا اے جانِ تمنا راہزنِ سحر
کیوں چھین لی مجھ سے میری نظر اندھیر ہے دنیا آنکھوں میں

جب دل سے کبھی تنہائی میں بس آپ کی باتیں ہوتی ہیں
کچھ اب بھی ہمیں مل جاتا ہے ان بھولی بسری باتوں میں

وہ میرے جنوں کا اِک قصّہ ترتیب دیا تھا تم نے جسے
ہاں اُس کو بھی شامل کر ڈالو ماضی کے حسین افسانوں میں
وہ مٹ گئی دنیا جس میں کبھی پیمانِ محبت ہوتا تھا
اب بھول بھی جاؤ چھوڑ بھی دو کیا رکھا ہے ان باتوں میں
ہاں میرے جنوں کی وسعت کو نظروں میں چھپا لو شرما کر
اور یاد جو میں آ جاؤں کبھی ہنس ہنس کے بھلا دو باتوں میں
کیا تم بھی کہو گے لاؤ میں پی کر اس کو بھی پورا کر ڈالوں
زہر آبِ مقدّر دیکھ رہا ہوں آج تمہاری باتوں میں
پروردۂ غم کی نوحہ گری سے تھک جاؤ تو کہہ دینا
کچھ مکر و فریب ملا دے گا غمناک سے ان افسانوں میں

غزل نتیجۂ فکر عالی جناب سید رفیق حسین صاحب رفیقؔ ایم اے بی۔ اے (آنرز) ڈی لٹ اسکالر اردو ڈپارٹمنٹ الہ آباد یونیورسٹی و سکریٹری نشر و اشاعت کمیٹی انجمن روح ادب

تجھکو دیکھا بھی نہ دیکھا بھی تماشائی نے
سحر کا کام کیا ہے تری رعنائی نے

اتنا مجبور کیا عالم تنہائی نے
اپنی دنیا ہی بدل دی ترے سودائی نے

ہو گئی ترک تمنا سے تمنا پوری
اُن کو بیتاب کیا میری شکیبائی نے

بے محل ہو گئے سجدے کئی لے جوش نیاز
مجھکو شرمندہ کیا شوق جبیں سائی نے

جس کو دیکھو وہی کہتا ہے بہار آئی ہے
مجھکو دیوانہ بنایا ہے "بہار آئی" نے

قاصدِ شوق تو عالم کا ہر اک ذرّہ تھا
خود گوارا نہ کیا میری شکیبائی نے

کثرتِ نور سے ہر جلوہ بنا ایک حجاب
تجھکو پوشیدہ کیا تیری خود آرائی نے

ظرفِ عشاق کا معیار بنا قصّۂ طور
سب کو بدنام کیا ایک تماشائی نے

جا کے اُس محو تغافل سے کوئی کہہ دے رفیقؔ
وحشت کیا دیر کو چھوڑا ترے سودائی نے

پنڈت امرناتھ مدن صاحب تحصیلدار ریٹائرڈ ساحرؔ دہلوی

صفات حجاب ذات

حسنِ ازل صفات میں جب جلوہ گر ہوا — آئینۂ جمالِ وجودِ بشر ہوا
ترکیبِ وجود سے جو فنا میں گذر ہوا — نورِ بقا تجلّیِ تارِ نظر ہوا
کونین ہے جو نورِ تجلّی کی جلوہ گاہ — "کن" سے فروغِ حسنِ ازل جلوہ گر ہوا
نیرنگِ حسن و عشق میں ذات و صفات ہے — اک شاہدِ ازل مرا مدِّ نظر ہوا
اس کی نظر میں ہستیِ عالم ہے نورِ ذات — نیرنگیِ صفات سے جو بے اثر ہوا
کیوں حسن پردہ دار کی ہیں لن ترانیاں — منصورِ عشق راز کا جب پردہ در ہوا

صورتِ نزول

ہے ذاتِ پاک نورِ علیٰ نور بے نشاں — وہمِ خودی تعینِ علمِ خبر ہوا
وہ عینِ علم نورِ تجلّی میں ہے علیم — جو عالمِ صفات میں جب جلوہ گر ہوا
معلوم و علم و عالم و عرفاں میں نورِ ذات — اشراق و ہوش و صوت میں رنگِ اثر ہوا
صرفِ وجودِ کُل میں ہوا حسنِ کائنات — اور حیز میں عینِ علم وجودِ بشر ہوا
جو نورِ ذات مرکزِ عینِ صفات تھا — اپنی تجلّیوں میں نہاں عمر بسر ہوا
پنہاں شجر میں تخم ہوا تخم میں شجر — روشن ہے یہ مثال کہ دانہ شجر ہوا
قائم ازل سے دورِ تسلسل ہے تا ابد — ہنگامہ مرگ و زیست کا وہمِ نظر ہوا
جاں جسم ہو کے جلوۂ پیدا سا بن گئی — جاں بستہ ہوئی تو یہ جلوہ خبر ہوا

مرکز ہے نقطہ، نقطہ ہے خط، خط ہے دائرہ
ساحرؔ قدم حدوث میں حسنِ نظر ہوا

غزل جناب ابوالعظم نواب سراج الدین خان صاحب سائل دہلوی

حسن کے جلووں سے دل عشاق کے پر نور ہیں
شیشہ ہا لمعۂ برق و چراغ طور ہیں

میکدے ہیں شرم عصیاں سے بھی دستور ہیں
سے ادھر پی جس نے اس کے قرابت ادھر شیب ہیں

عشق کی دنیا میں دل اس لئے یہ دو مشہور ہیں
دشت کے اک پاسباں ہیں در کے اک مزدور ہیں

منفعت سے کی کیا کرتے ہیں منبر پہ بھی آپ
ہم پیالہ پیر میخانہ کے بھی مشہور ہیں

نرگس و گل حسن میں تجھ سے کریں کیا ہمسری
ایک صاحب کر ہیں ان میں ایک حضرت کور ہیں

کچھ عرق فروشگی ہیں کچھ ساختۂ شیخ زماں
مے نہیں پر سب زلال دانۂ انگور ہیں

ہم اسیر دام الفت وہ شہ حسن و جمال
مختصر یہ ہے کہ وہ مختار ہم مجبور ہیں

باز دار درد الفت لب ہلا سکتے نہیں
اشک ریزی کے لئے معذور ہیں مجبور ہیں

مکتب عشق و محبت ہم نے دیکھا ہی نہیں
فارغ از گردان شکر و شاکر و مشکور ہیں

رد الفت اک اون سے معنی تو ہم سمجھے نہیں
آگے چل کر ہم نوا سے حضرت منصور ہیں

حضرت سائل سا ہستے منکسر دیکھا نہیں
لوگ کہتے تھے ادب میں وہ بہت مغرور ہیں

غزل جناب سحر صاحب رام پوری

سنے زمانہ کہ عشق کی رفعتوں کو ممکن زوال بھی ہے
میری نظر میں کسی حقیقت کی بے ثباتی محال بھی ہے
غموں کی تاریکیوں سے گھبرا کے رونے والے خیال بھی ہے
غموں کی تاریکیوں سے پیدا مسرتوں کا جمال بھی ہے
زہے محبت، یہ یک تغیر، خلش بھی ہے اندمال بھی ہے
ملال کہتے ہیں اُن کو میری تباہیوں کا خیال بھی ہے
سکوں سے گذری ہوئی جوانی کی یاد میں زندگی کے لیے
سکوں سے گذری ہوئی جوانی کی یاد خواب خیال بھی ہے
رہ طلب میں خرد سے بیگانگی کی لذت پہنچنے والے
رہ طلب کے اسی فسانے کا دوسرا نام حال بھی ہے
میری خموشی پہ خود پرستی و خود پسندی کی تہمتیں کیوں
نوازیئے تو میری خموشی کی ہر تڑپ میں سوال بھی ہے
تیرا تصور گلوں کی دلکش جوانیاں رنگ و بو کی موجیں
تیرا تصور جمیل بھی اور کائنات جمال بھی ہے
یہ دیکھتا ہوں کہ لٹنے والی ہے پھر دل مطمئن کی دنیا
وہی جنوں آفریں مناظر وہی بہار اب کہ سال بھی ہے
حسین تارے، حسیں کلیاں لیے ہوئے داستان ماضی
سحر یہ جذبات ہیں۔ تو حالات کا بدلنا محال بھی ہے

غزل جناب سیماب صاحب اکبرآبادی

عمر دراز سے کہ نہ ہوسکے یہاں بنا | جو زندگی ملی ہے اُسے جاودان بنا
کیوں کھو رہا ہے وقفۂ بربادیٔ چمن | یہ وقت مغتنم ہے نیا گلستاں بنا

شبنم میں نیرے اشک ہوں جگنو میں تیرا سوز
فطرت کو اپنے درد کا یوں ترجماں بنا

ذرّوں میں ہے صلاحیتِ اوج و ارتقا
ان کو سمیٹ اور نئے آسماں بنا

اللہ رے میرے ضبطِ نہاں کی گرفتگی
کہتی ہے ہر کلی کہ مجھے رازداں بنا

ایسے بھی ہم نے دیکھے ہیں دنیا میں انقلاب
پہلے جہاں قفس تھا وہیں آشیاں بنا

راہِ وفا میں سجدوں کی ترویج عام کر
نقشِ قدم مٹا کے جبیں کے نشاں بنا

ہستی کو نیستی پہ تقدم ضرور ہے
کچھ بھی نہ تھا یہاں - تو یہ عالم کہاں بنا

آزادیِ زباں ہے نہ آزادیِ خیال
سیماب کیوں میں شاعرِ ہندوستاں بنا

غزل جناب سید محمد شاہد محمدی فاخری المتخلص بہ شاہد عفی عنہ
سجادہ نشین دائرہ حضرت شاہ محمد اجمل قدس سرہ الہ آباد

کب حسن کو بے پردہ و عریاں نہیں دیکھا
کب عشق کو حیران و پریشاں نہیں دیکھا

بے سود ہوا مر کے مرا مٹی میں ملنا
جب خاک کو وابستۂ داماں نہیں دیکھا

سو مرتبہ مرنا بھی مرا کام نہ آیا
آنکھوں سے کبھی ان کو پشیماں نہیں دیکھا

اللہ ری محویت انوار توحش
وحشی نے کبھی حسنِ بیاباں نہیں دیکھا

ہے سایۂ گیسو میں وہ شمعِ رخِ انور
کیا تم نے چراغِ تہِ داماں نہیں دیکھا

کیا خاک وہ سمجھے رخ و گیسو کے فسانے
جس نے کبھی روز و شبِ ہجراں نہیں دیکھا

ہے کشمکشِ زیست میں ہر ذرۂ ہستی
اس دل کو شکارِ غم و حرماں نہیں دیکھا

ہر لمحۂ احساس ہے اک زیست کا پیغام
بے حس میں کبھی جینے کا ارماں نہیں دیکھا

اک حرف غلط ہے یہ رہائی کا فسانہ
کھلتے کبھی قفلِ درِ زنداں نہیں دیکھا

یہ طوق و سلاسل ہیں علاماتِ شجاعت
زنجیر دل میں کیا شیرِ نیستاں نہیں دیکھا

کیوں طوق و سلاسل سے ہو الجھن مرے دل کو
کیا تربیتِ عشق کا ساماں نہیں دیکھا

سہنے دو مجھے بے خبرِ کیفیتِ دل
احساس کا تم نے ابھی طوفاں نہیں دیکھا

اندوہ و الم حسرت و ارماں ہیں جلو میں
شاہد کو کبھی بے سر و ساماں نہیں دیکھا

غزل از نتیجۂ فکر جناب علامہ شفق صاحب عماد پوری

پھر ماتمِ بہار کا ساماں کئے ہوئے
شاخوں پہ گل ہیں چاک گریباں کئے ہوئے

پھر رنگ لائی ہے خلشِ پا برہنگی
صحرا میں آبلوں کو گل افشاں کئے ہوئے

پھر لے چلا ہے سوزِ دروں سوئے لالہ زار
پہلو میں داغِ دل سے چراغاں کئے ہوئے

پھر مردہ آرزوؤں پہ حسرت ہے نوحہ خواں
سینے میں دل کو گورِ غریباں کئے ہوئے

آنکھوں کو پھر ہے حسرتِ نظارۂ جمال
دل اک نگاہِ ناز پہ قرباں کئے ہوئے

پھر چلمنوں کی آڑ سے گرتی ہیں بجلیاں
مدہوش جلوۂ تہِ داماں کئے ہوئے

پھر آ کے بسی ہے خانۂ دل میں کسی کی یاد
آباد گھر کو جاتی ہے ویراں کئے ہوئے

پھر چشمِ تر ہے تشنہ لبِ پاسِ آبرو
اشکوں سے پاک دامنِ مژگاں کئے ہوئے

پھر دیر کو چلا ہوں لیے سجدۂ نیاز
رخ سوئے قبلۂ درِ جاناں کئے ہوئے

بکھرائے زلفیں پھر کوئی آیا ہے خواب میں
شیرازۂ خیال پریشاں کئے ہوئے

اے تیغِ ناز پھر ترے قرباں ہوئی ہے مے
گردن پہ سرفروشوں کی احساں کئے ہوئے

پھر ڈھونڈھتی ہے کھوئے ہوش بیخودی
آنکھوں کو مستِ ساغرِ عرفاں کئے ہوئے

اے چارہ گر ہے پھر مجھے ذوقِ جفائے ناز
زخموں کو بے نیازِ نمکداں کئے ہوئے

پھر پرسشِ گناہ سے بے غم ہیں حشر میں
دیوانے تیرے چاک گریباں کئے ہوئے

مجبورِ ضبطِ عشق ہے پھر چشمِ تر شفق
کوزے میں بندِ نوح کا طوفاں کئے ہوئے

غزل نتیجۂ فکرِ عالی جناب پنڈت جگموہن ناتھ صاحب رینہ شوق شاہجہانپوری

ظاہر ہوں مگر جلوۂ کثرت سے جدا ہوں
خود جلوہ ہوں اور پیکرِ خاکی میں چھپا ہوں

نیرنگیِ عالم ہے کہ مرمر کے جیا ہوں
اک ہستیِ موہوم بقا ہوں کہ فنا ہوں

پروا نہیں اس کی کہ میں بے برگ و نوا ہوں
پھر بھی ہے مجھے ناز کہ اُس در کا گدا ہوں

دنیائے تصور میں ہوں آئینۂ عالم
آئینۂ تمثالِ ہمہ تصویر بقا ہوں

گمنام ہوں بدنام ہوں دیوانہ ہوں اے عشق
کرتے تو ہیں وہ یاد بُرا ہوں کہ بھلا ہوں

ہستی و عدم دونوں کے ہوں راز سے واقف
پھر بھی نہیں کھلتا ہے کہ میں کون ہوں کیا ہوں

اندیشہ کے متوالو تمھیں کچھ بھی ہے
منزل ہے ابھی دور اُٹھو بانگِ درا ہوں

عاصی ہوں خطاوار ہوں عصیاں مرا شیوہ
جو کچھ ہوں مگر بندۂ اربابِ صفا ہوں

وہ قطرۂ ناچیز کہ ہوں گوہرِ نایاب
حیرت یہ ہے کیوں دامنِ دریا سے جدا ہوں

مدت ہوئی ہے جلوہ گزیں وہ مرے دل میں
کیا کہیے خود آئینہ ہوں آئینہ نما ہوں

مٹنا تو ہے مٹ جاؤں گا جب چاہو مٹا دو
مٹ کر بھی رہِ عشق میں نقشِ کفِ پا ہوں

ہو جائے گا مقبول اسی امید پہ لے شوق
سجدے کو میں سنگِ درِ جاناں پہ جھکا ہوں

غزل جناب پنڈت پرتھی ناتھ عرف صاحب شوق دہلوی

آہ کیوں مائلِ اثر نہ ہوئی ۔ اور کچھ ہے جو کارگر نہ ہوئی
دل کو آنکھیں دکھاکے برمایا ۔ نوک پیکاں ہوئی نظر نہ ہوئی
دیکھتا حسن کو بقدر ذوق ۔ آنکھوں میں وسعتِ نظر نہ ہوئی
میری ہستی کا ہی شندا وہ ہے ۔ جس کی ابتک کوئی خبر نہ ہوئی
قطع کرتا رہا رہِ الفت ۔ طے مگر پھر بھی عمر بھر نہ ہوئی
ایک در پر کیا کئے سجدے ۔ بندگی ہم سے در بدر نہ ہوئی
ہند کی سے لے کسی پہ دنیا میں ۔ کون سی آنکھ ہے جو تر نہ ہوئی

شوق ہم دل سے اپنے ہار گئے
یہ مہم دردِ سر سے سر نہ ہوئی

غزل جناب شوکت تھانوی صاحب

کچھ اور بھی بڑھ جاؤ اگر برق و شرر سے ۔ تم بچ کے کہاں جاؤ گے پروازِ نظر سے
ساقی یہ تجھے کیفیتِ مستی میں ڈبو دے ۔ پانی وہی پانی ہے گذر جائے جو سر سے
صحرا کے لئے گھر مرا ویران ہوا تھا ۔ صحرا نے لیا درسِ بصیرت مرے گھر سے
جس راہ میں جانے کی اجازت نہیں ملتی ۔ سو بار گذر جاتے ہیں خیالات اُدھر سے
دیکھا ہے تجھے اور دیکھنے کی طرح سے دیکھا ۔ یہ پہلی خطا تھی جو ہوئی میری نظر سے
تم ہو گئے گلرنگ ہوئیں ہولیں جو ہو ۔ پھر ابرِ بہاری جو نہ برسے تو نہ برسے
گردش ہے تو گردش کی یہ صورت ہو الٰہی ۔ میں جاؤں اِدھر سے تو وہ آنے ہوں اُدھر سے

مستقبلِ تاریک و فنا دیکھ رہا ہوں
شوکت مجھے مرنا نہ پڑے زیست کے ڈر سے

غزل جناب عبدالمجید صاحب خواجہ شیدا بیرسٹر ایٹ لا الہ آباد ہائی کورٹ

میں تجھکو دیر و ان میں ڈھونڈتا ہوں
گماں مٹ رہا ہے یقیں ڈھونڈتا ہوں

بہت ہوچکی اب تگ و پوئے ہستی
میں مرگ سکوں آفریں ڈھونڈتا ہوں

سمجھتا ہوں میں ایک دیر و حرم کو
مکاں سے غرض کیا مکیں ڈھونڈتا ہوں

مجھے مسجد و دیر سے کیا میں تجھکو
جہاں کوئی کہدے وہیں ڈھونڈتا ہوں

جو گہرائیوں میں سماجائیں دل کی
نگاہیں وہی شرمگیں ڈھونڈتا ہوں

ہو قبلہ نما جس کا اک ایک ذرہ
میں سجدہ کو ایسی زمیں ڈھونڈتا ہوں

جو سجدے میں جاکر ابد تک نہ اُٹھے
تری یاد میں وہ جبیں ڈھونڈتا ہوں

مبارک ہو زاہد کو صبر قیامت
میں بیتاب تجکو یہیں ڈھونڈتا ہوں

جلادے جو سارے یہ خاشاک ہستی
تبسم وہ برق آفریں ڈھونڈتا ہوں

قیامت میں شیدا یہیں سے اُٹھونگا
وطن کی ذرا سی زمیں ڈھونڈتا ہوں

غزل جناب رائے بہادر سوہن لال صاحب سرلو ایشنو شبقفتہ

گھبرا اُٹھو گے سن کر آغاز داستاں سے
سن لو مری کہانی کچھ کچھ یہاں وہاں سے

تسکین ہو تو کچھ ہو اب مرگ ناگہاں سے
آفت میں زندگی ہے اندیشۂ زیاں سے

دنیا رواں دواں ہے لیکن خبر کسے ہے
جاتے ہیں ہم کدھر کو آئے ہیں ہم کہاں سے

اے شاہد حقیقت دنیا کو ایک کر دے
دیر و حرم کا جھگڑا اُٹھ جائے اس جہاں سے

شان نزول دیکھو گھر ڈھونڈھتی ہے میرا
یہ برق جو سر اسر اُترتی ہے آسماں سے

اے ہمت شناور تم ہے بسیط دریا
بیڑے کو پار کر دے اس بحر بیکراں سے

دریا کشش سے اپنی قطرے کو جذب کرلے
پردہ دوئی کا جس دم اُٹھ جائے درمیاں سے

کیا ہو کوئی شبکسار اک سرنگوں سے کے آگے — دست سوال میرا اونچا ہے آسماں سے
آنکھیں کریں تو کر دیں کچھ دل کی ترجمانی — جو دل کی گفتگو ہے ہوتی نہیں زباں سے
نام تمکو رہیگا بعدِ فنا بھی باقی — حاصل یہی سبق ہے اس عمر رائگاں سے

اے شیفتہ ہمیں کیا رکھنا ہے ہر سخنور
تحسین کی توقع یارانِ نکتہ داں سے

دیگر

تو سُن پاتا کہاں سے سننے والے داستاں میری
بیانِ درد سے کٹ کٹ گئی منہ میں زباں میری
وہی تنا خیں کہ جن پر فصلِ گُل میں اپنا تکیہ تھا
بنی ہیں اب اسیری میں قفس کی تیلیاں میری
ہلا دیتی ہے جب بادِ بہاری مست جھونکوں سے
تو پہروں جھومتی رہتی ہے شاخِ آشیاں میری
قضا کے منہ میں گھر ہے برق اوپر باغباں نیچے
کنپا کرتی ہے ہر دم ڈر سے شاخِ آشیاں میری
خزاں آتے ہی اُڑ جاؤں گا دو دن کا مسافر ہوں
نہ ہے صحنِ چمن میرا نہ شاخِ آشیاں میری
کچھ اپنے دل کی ہیں کچھ اُن کی آنکھوں کی کراماتیں
انھیں ٹکڑوں سے مل کر بن گئی ہے داستاں میری
تری رحمت جلا بے آئیگی مجھکو تو پھر یا رب
کریں گے مخلد میں کیا ہمسری کرّوبیاں میری
مری درماندگی پر خاک کا بھی دل پگھلتا ہے
خبر لینے پلٹ آتی ہے گردِ کارواں میری

وہ مر کر چھٹ گیا میں زندگی مر مر کے کاٹوں گا

کہاں فرہاد کی آزردگی تھی اور کہاں میری
مجھے اے شیفتہ اتنی رسائی پر تعجب ہے
فلک سے بات کر لیتی ہے آہِ ناتواں میری

غزل لسان القوم جناب مولانا سید علی نقی صاحب صفی لکھنوی

تڑپ کے رات بسر کی کہ اک مہم سر کی / پچھری تھی میرے لیے جو شکن تھی بستر کی
ہوا گمان اُسی شوخ سست پیماں کا / اگر ہوا سے بھی زنجیر ہل گئی در کی
اسی طرف ترے قرباں نگاہِ شرم آلود / مجھی پہ تیز ہو یہ باڑھ کند خنجر کی
خرام وہ جو ہلا دے جگر فرشتوں کے / نگاہ وہ جو اُلٹ دے صفوں کو محشر کی
سجی ہے حضرتِ واعظ نے کس تکلف سے / متاعِ زہد و ورع سیڑھیوں پہ منبر کی
نشاطِ عمر گئی عالمِ شباب کے ساتھ / وہ دور ہے خوں کے یا گردشیں نہیں ساغر کی
ازل سے تا بہ ابد کیا سمائے نظروں میں / یہ انجمن ہے فقط ایک دورِ ساغر کی
عبورِ بحرِ حقیقت سے جب نہیں ممکن / کنارے بیٹھ کے لہریں گنو سمندر کی

کہے گا کون سُنی جائے گی صفیؔ کس سے
تمہاری رام کہانی یہ زندگی بھر کی

کپتان سید محمد ضامن علی صاحب ضامنؔ ام۔ اے صدر شعبہ اُردو

الہ آباد یونیورسٹی

و صدر مشاعرہ کمیٹی انجمن روحِ ادب الہ آباد

دل جگر داغ غمِ ہجر سے گل پوش رہے / فصلِ گل ہو کہ خزاں ہم چمن آغوش رہے
عید کا دن مجھے ہر روز ہو قسمت سے نصیب / سامنے میرے جو وہ صبح بناگوش رہے
یاد اب طرزِ فغاں ہے نہ تو گلبانگ بہار / اتنے دن خانۂ صیاد میں خاموش رہے

جل بجھی شمع سرِ بزم مگر اُف بھی نہ کی
یوں زباں رکھ کے نہ یارب کوئی خاموش رہے

پھولوں سے باغ تو سبزے سے ہو صحرا مخمور
کیا قیامت ہے کہ خالی مرا آغوش رہے

زندگی اسکی نصیب اسکے بہاریں اسکی
جس کے پہلو میں نگارِ چمن آغوش رہے

کیوں نہ خودبیں پہ تحیر میں ہو اک کیف خودی
صاحبِ آئینہ خانہ ہی جو روپوش رہے

مست آنکھوں کے تصور نے کیا خود رفتہ
نہ تو ہشیار رہے اور نہ بے ہوش رہے

داستاں غم کی سناتے انھیں کیونکر ضامن
قابلِ ذکر جو قصے تھے فراموش رہے

غزل جناب یوسف حسین صاحب طاہر

ہوئے ہم کس طرح گھائل اسے قاتل سمجھتے ہیں
تڑپنے لوٹنے ہی کے مزے بسمل سمجھتے ہیں

تمنا در بحر الفت کے تلاطم سے نہیں ڈرتے
ہر اک گرداب کے آغوش کو ساحل سمجھتے ہیں

مرے دل کے لہو کی بوند جو گرتی ہے آنکھوں سے
زمانے میں بس اس کی قدر دریا دل سمجھتے ہیں

نکل کر عالمِ ذرّے سے سرائے دہر میں آنا
ہم اپنے عشق کی پہلی یہی منزل سمجھتے ہیں

ترے محو تصور بزم میں بھی رہتے ہیں تنہا
بجو ہم یاس سے تنہائی کو محفل سمجھتے ہیں

فریب دہر فانی کے کرشموں سے جو ہیں واقف
حقیقت میں وہی کچھ منتہائے منزل سمجھتے ہیں

ٹپک پڑتے ہیں آنسو ٹوٹتا ہے جب کوئی چھالا
جو اہلِ درد ہیں ہر آبلہ کو دل سمجھتے ہیں

جہاں دم ٹوٹ جائے سالک راہِ طریقت کا
اسی کو اہل عرفاں عشق کی منزل سمجھتے ہیں

جو دُنیائے ادب میں ذی لیاقت ہیں وہ سب طاہر
ترے ہر شعر کو اس بزم کے قابل سمجھتے ہیں

غزل جناب رگھو راج بلی صاحب عشرت، ماسٹر کائستھ پاٹھشالہ الٰہ آباد

نالہ ہی شبِ غم اثر انداز نہیں ہے
یا خلقِ خدا گوش بر آواز نہیں ہے

ٹوٹے ہوئے دل کا کوئی انداز نہیں ہے
یہ ساز وہ ہے جس میں کچھ آواز نہیں ہے

پروانے کو اے شمع جلا دیتی ہے جل کر
ہے سوز مگر تجھ میں ذرا ساز نہیں ہے

دیتا ہے وہ کیوں ناپ سکے پیمانے سے بادہ
ساقی کو مرے ظرف کا انداز نہیں ہے

کیا پوچھتے ہیں آپ مرے غم کی حقیقت
انجام نہیں ہے کوئی آغاز نہیں ہے

سمجھا ہے نہ سمجھے گا کوئی شانِ حقیقت
وہ کون سا انداز ہے جو راز نہیں ہے

ہستی کی حقیقت کو مری موت نے کھولا
جو راز رہا عمر بھر اب راز نہیں ہے

جلووں سے ہر اک ذرّہ بنا آئینۂ حسن
عشرتؔ وہ کہاں شعبدہ پرداز نہیں ہے

جناب سید محمد حسن صاحب فائزؔ

قطعہ

جب گلشن مضموں کی ہوا آتی ہے
آواز عجیب خوش نوا آتی ہے

ہر برگ ہے گویا کہ زبانِ بلبل
پتوں سے بھی نغموں کی صدا آتی ہے

میں سمجھوں ذات تری میری جستجو کیا ہے
تو ہی بتا مرے مالک یہ ایک کو کیا ہے

سخن ہو ایسا پھڑک جائیں سب اہلِ زباں
مزا نہ جس میں ہو پیدا وہ گفتگو کیا ہے

عیاں ہے آنکھوں سے دوری دل کے چشم تر ہی سے
نہ ٹپکے تک جو رگ رگ سے وہ لہو کیا ہے

غزل جناب سید افتخار حسین صاحب خان بہادر ریٹائرڈ جج المتخلص بہ فخر غازی پور

وعدۂ فردا میں مضمر جانئے کیا راز ہے
مستعد مرنے پہ قبل از وقت ہر جانباز ہے

دہر میں فتنے اُٹھے نقشے اُٹھے محشر اُٹھا
کیا قیامت خیز اندازِ خرامِ ناز ہے

کیا کہوں حسرت ہوئی کھینچی تھیں آہیں قیس نے
دشت میں پُر درد اب تک گونجتی آواز ہے

حسن روز افزوں کا عالم میں کوئی محرم نہیں
آشکارا ذرہ ذرہ میں ہے پھر بھی راز ہے

خود یہ سمجھاتا ہے اُسکو اسکو سمجھاتا ہے جو
تیرے دیوانے کا دنیا سے نیا انداز ہے

کیا قیامت ہے وہ مجھکو ڈھونڈھتے ہیں حشر میں
بیخودی کو ہے ندامت اور مجھکو ناز ہے

دل سے ملتی بھی نہیں دل سے نکلتی بھی نہیں
کچھ عجب تیرا کرشمہ او نگاہِ ناز ہے

دیدۂ بد دور ہو میرے دلِ مفتوں کی خیر
چھان ڈالے جس نے سینے وہ نگاہِ ناز ہے

دیکھنے والے ہیں حیراں حالتِ بیمار پر
نبض ساقط سانس اُکھڑی ڈوبتی آواز ہے

ذرہ ذرہ میں عیاں ہے حسن صورت آفریں
اور ہر شے میں نہاں ہے یہ نیا انداز ہے

فخر کیا رازِ حقیقت کچھ بیاں کرنے کو ہے
اللہ اللہ ذرہ ذرہ گوش بر آواز ہے

غزل جناب رگھوپتی سہائے صاحب فراق گورکھپوری لکچرار یونیورسٹی الہ آباد

حیات بھی نہ ہو معراج آسمان فراز نہیں
مرا وجود بھی میرا وجود ہے کہ نہیں

نہ پوچھ کس کا ہے اب سامنا محبت کو
بغل میں قلب حزیں ہے نہ شاہد رنگیں

ہماری زندگی عشق کا وہ پہلا خواب
تمہیں بھی بھول چکا ہے مجھے بھی یاد نہیں

مزاج عشق کو اب چاہئے بدل جانا
کہ کچھ دنوں سے تو سنتے ہیں حسن بھی ہے غمیں

عمل تو وہ کہ قضا و قدر کو بس ہی کہئے
دعا تو وہ ہے کہ تقدیر بھی کہے آمیں

ہر انقلاب کے بعد آدمی یہ کہتا ہے
کہ اسکے بعد نہ پھر لیں گی کروٹیں یہ زمیں

انھیں فضاؤں میں تو انقلاب پلتا ہے | زمیں بھی پھری ہوئی سی فلک بھی چیں بہ جبیں
چہ خوش بود چوں برآید بیک کرشمہ دو کار | بس اک نگاہ سے کر دے جہاں کو شاد و غمیں
لبِ نگار رہیں یہ نغمۂ بہار کی تو | سکوتِ ناز ہے یا کوئی مطلبِ رنگیں
نگاہِ یار تری کافری کو پا نہ سکے | ہزاروں کعبۂ ایماں ہزاروں قبلۂ دیں
نگاہِ شاہدِ ہستی کی نیتیں ہیں کچھ اور | یہ رنگ ہو تو کوئی کیا ہو شاد یا غمگیں
بہت نہ بیکسیِ عشق کو کوئی روئے | کہ حسن کا بھی زمانے میں کوئی دوست نہیں
جو کامیاب ہیں دنیا میں ان کو کیا کہئے | ہے اس سے بڑھ کے بھلے آدمی کی کیا توہیں
خدا کے سامنے میرے قصور وار ہیں جو | برابر اُن سے نگاہیں مری نہیں ہوتیں
یونہی سا تھا کوئی جس نے مجھے مٹا ڈالا | نہ کوئی نور کا پتلا نہ کوئی زہرہ جبیں
ہوئے وہ جلوہ نما بھی تو کیا سے کیا ہو کر | پڑی نگاہ پریشاں بھی تو کہیں کی کہیں
ہنر تو خیر ہنر عیب سے بھی جلتے ہیں | فغاں کہ اہلِ زمانہ ہیں کس قدر کم بیں

تھی شہر شہر زمانے میں جن کی رسوائی
فراقؔ تھے وہی ناموسِ زندگی کے امیں

غزل جناب محمد علی صاحب قاصرؔ ہیڈ مولوی ماڈرن ہائی اسکول الٰہ آباد

محفل میں حسینوں کو وہ نشۂ نخوت ہے | حالِ دلِ غم دیدہ سننا ہی قیامت ہے
روشن ورقِ گل سے عرفاں کی حقیقت ہے | گلشن کا ہر اک پتہ آئینۂ وحدت ہے
سرمایۂ الفت بھی اک ثمرۂ محنت ہے | دنیا میں اسے کھو دوں کیا مفت کی دولت ہے
دل لے کے سرِ محفل اُس بت کا مکر جانا | باطن کو خدا جانے ظاہر تو خیانت ہے
افسانۂ شبِ غم کا کیوں مجھ سے کوئی پوچھے | چہرے سے نمایاں ہے جو کچھ مری حالت ہے
دل طالبِ الفت کا ہشیاروں کی محفل میں | آنکھوں سے چرا لینا اُس شوخ کی عادت ہے
گردن پہ حسینوں کی الزام نہ رکھ لے دل | جو کچھ بھی مصیبت ہے وہ تیری بدولت ہے
ظاہر جو نہ کرتا ہو خود اپنی شرافت کو | دنیائے نجابت میں وہ لائقِ حرمت ہے

کلمہ بھی اسی کا اب پڑھتی ہے زبان دل کی — جس کے رخِ روشن کی رگ رگ میں محبت ہے

آزاد گناہوں سے ہوگا وہ سرِ محشر
دنیا میں جو اے ناصر پابند شریعت ہے

غزل جناب سید محمد جعفر صاحب قدسی جائسی

حاصلِ کائنات ہیں اجڑے ہوئے دیار کے — شمع مرے مزار کی پھول مرے مزار کے
ختم ہوئے کسی طرح مرحلے انتظار کے — آنکھ خموش ہو گیا کوئی انہیں پکار کے
اس سے زیادہ اور کیا ہونگی بلا نصیبیاں — جیب مرا آشیاں جلا دن تھے بھری بہار کے
قیدِ قفس میں دل کا غم جسکو کیے ہو جاں بلب — دن گئے کس امید پر آتی ہوئی بہار کے
ملک عدم کے ساکنو ہم سے تو حال دل کہو — ہم بھی اسی دیار کے تم بھی اسی دیار کے
دست جنوں کے حوصلے مجھکو نکالتے ہیں پھر — چھوڑ رہا ہوں تار تار دامنِ تار تار کے
قدر وفا کے میں فدا شرم جفا کے میں نثار — بیٹھے ہوئے ہیں وہ اداس پاس مرے مزار کے
تونے یہ کیا ستم کیا مجھ سے چمن چھڑا دیا — آج ہی کل تو باغباں دن تھے بھری بہار کے
حسن نظارہ سوز ہے تاب نظارہ دیگا کیا — خیرہ کیے ہیں چشم شوق جلوے حجابِ یار کے
کیوں نہ ہو میری موت پر رشک مری حیات کو — آئے وہ لے کے شمع و گل پھر گئے دن مزار کے

کالی گھٹا کے ساتھ جام بکف اٹھا کوئی
نکلیں گے اب تو حوصلے قدسیِ مے گسار کے

غزل جناب پنڈت برجموہن صاحب دتاتریہ کیفی دہلوی

کیا ہوا مرکزِ ہستی اگر انساں نہ ہوا — آبرو خاک ہے قطرے کی جو طوفاں نہ ہوا
سخت مشکل ہے کہ ہمت یہ ہوئی سہل پسند — کام ٹھہرا وہی دشوار جو آساں نہ ہوا
خاک بھی حضرت موسیٰ کی نہ پھر ہاتھ آتی — شعلہ وہ طور پہ بھی پردے سے عریاں نہ ہوا
خیرہ آنکھیں ہوئیں اس کثرت جلوہ سے مری — کس لئے نور ترا پردے میں پنہاں نہ ہوا
پھر تعجب کیا ہے عدم سے جو ہوئی دلچسپی — درخورِ وسعت دل عالمِ امکاں نہ ہوا

کھیل سمجھا کئے عالم کے کرشموں کو ہم — دل خود رفتہ کبھی بات سے حیراں نہ ہوا
جامہ پہنے رہا پروانوں کی جانبازی کا — شعلۂ فانوس کے پردہ میں بھی عریاں نہ ہوا
ہیں مرے دل میں وہ آہیں نہ بنیں جو بجلی — میری آنکھوں میں وہ قطرہ ہے جو طوفاں نہ ہوا
حوصلہ کس کو ہے دل چیر کے دکھلائیں بھی — وہ شرر اس میں ہے جو سنگ میں پنہاں نہ ہوا
قید ہیں سبحۂ و زنار کی پھنستا کیونکر — حلقۂ در گوش رہا مرکز ایماں نہ ہوا
غم رہا اُن کا جو دوزخ میں پڑے جلتے ہیں — میرے خوش ہونے کا جنت میں بھی ساماں نہ ہوا

اب تو یہ حضرت گلشن کو شکایت نہ رہی
کیفیِ سحر نوا آج غزلخواں نہ ہوا

غزل جناب دیوان پنڈت رادھے ناتھ کول صاحب گلشن رئیس لاہور
و صدر استقبالیہ کمیٹی انجمن روح ادب الہ آباد

شوق سے بیخودی عشق ہم آغوش رہے — جستجو اُس کی جو کرتی ہو تو کچھ ہوش رہے
یادِ ہستی و عدم دل سے فراموش رہے — غمِ فردا رہے باقی نہ غمِ دوش رہے
سب کی سنتے رہے لیکن نہ دیا کوئی جواب — شمع ساں ہم تو ہر اک بزم میں خاموش رہے
در حقیقت ہے حقیقت سے وہی دل آگاہ — رہ کے دنیا میں جو دنیا سے سبکدوش رہے
بے نیازی میں بھی بیگانۂ اخلاص نہ بن — میں بھی بندہ ہوں ترا اتنا تجھے ہوش رہے
اس طرح دام میں دنیا نے پھنسا رکھا ہے — ہوش آیا بھی اگر ہم کو تو بے ہوش رہے
رہ کے میخانۂ دنیا میں کبھی پی نہ شراب — نہ رہے ہوش میں ہم اور نہ بیہوش رہے
بحرِ رحمت سے اُٹھیں سینکڑوں طوفان کرم — کچھ دنوں قلزمِ عصیاں میں اگر جوش رہے

کوئی عنوان تمنا ہو تو قائم نہ سہی
دل کو پہچان لوں گلشن یہ مجھے ہوش رہے

غزل جناب مولوی سید کلب احمد صاحب مائل جائسی
منیجر بلہرہ اسٹیٹ - بارہ بنکی

اے جنوں پھر اک نظر، دنیائے ویراں کی طرف
دن پھریں گلشن کے، میں جاؤں بیاباں کی طرف

جب نگاہِ شوق اُٹھ جاتی ہے پیکاں کی طرف
کھچ کے آجاتا ہے خود پیکاں رگِ جاں کی طرف

یہ اجل ہے یا حیات نو کہ وہ بالیں پہ ہیں
میرا دم آنکھوں میں ہے آنکھیں ہیں جاناں کی طرف

نعمتیں بخشیں، خطائیں بخشیں، اللہ رے کرم
اپنے کو دیکھوں کہ دیکھوں تیرے احساں کی طرف

رخصتِ فصلِ بہار اے ہم قفس میرا گناہ
آنکھ بھر کر میں نے کیوں دیکھا گلستاں کی طرف

پھاڑ دوں گا جامۂ ہستی بھی میں اے بخیہ گر
تو رخ گریباں کا نہ رکھ ظالم رگِ جاں کی طرف

موت ہیں نے نام رکھا داستانِ عشق کا
زندگی لکھی ملی، دیکھا جو عنواں کی طرف

بس بس اے جوشِ جنوں کھینچے لئے آتا ہوں میں
باغ کو زنداں میں، زنداں کو بیاباں کی طرف

زندگی ہی ختم ہے اے ہمتِ مشکل پسند
خیرباد اب جا رہا ہوں راہِ آساں کی طرف

ہوتی ہے وابستہ ادنیٰ سے بھی اعلیٰ کی غرض
دیکھئے پیغمبری اور چاکِ داماں کی طرف

اُف یہ امواجِ بلا مانی، یہ تیرا حوصلہ
اک نظر دل کی طرف ہے، ایک طوفاں کی طرف

غزل جناب مولوی محمد متین الدین صاحب متینؔ
مچھلی شہری یادگار حضرت داغؔ دہلوی

وہ خود نما حقیقتِ حسنِ مجاز ہے
خود آئینہ ہے، خود وہی آئینہ ساز ہے

سجدوں پہ آستاں سے ترے مجھکو ناز ہے
جنّت کا پھول، داغِ جبینِ نیاز ہے

محمود ہے غلام، تو آقا ایاز ہے
اُس کی نوازشیں ہیں جو بندہ نواز ہے

اک عکسِ دل رُبا ہے کمالِ جمال کا
اتنی فقط حقیقتِ حسنِ مجاز ہے

مشتاقِ دید سے ہیں یہ کیوں لن ترانیاں
برقِ جمال خود ہی تو نظارہ ساز ہے

کیسی شبِ وصال مؤذّن اذانِ صبح
ہنگامِ عیش ہے، کہ یہ وقتِ نماز ہے

ملتی ہے اس سے مجھ کو ہر اک آرزو کی داد
کتنا جمالِ یار بھی، حسرت نواز ہے

رہتی ہے دونوں کو مری بربادیوں کی فکر
مدت سے حسن و عشق میں یہ ساز باز ہے

ربِّ غفور اکس لئے سے خانہ بند ہو
جب تک ترے کرم سے درِ توبہ باز ہے

جس نے کیا جمالِ حقیقت کو منکشف
وہ اسے متبین جلوۂ حسنِ مجاز ہے

غزل جناب محمود علی خاں عرف آغا علی خاں محمودؔ الہ آباد

پردے ہیں جتنے مستتر اُن کے حریم ناز میں
دیکھو وہ اُٹھ رہے ہیں سب عشق کی اک نماز میں

بزم جہاں ہے مضطرب رقص میں ہیں تجلیاں
کس نے یہ روح پھونک دی جلوہ گہِ مجاز میں

حسن کی بارگاہ میں ہونگی دعائیں سرخرو
دل کے لہو کا ہو وضو عشق کی ہر نماز میں

پھول کھلے نیاز کے گلشنِ دل مہک گیا
کتنی تھیں قوتیں بھری اُن کی شمیم ناز میں

دل سے لبوں تک آ گئی صوتِ نشاط بیخودی
کس نے یہ نغمہ بھر دیا دل کے ہر ایک ساز میں

میری عبودیت کو ہو فخر نہ کیوں جہان پر
ہو گئی جذب دل کی روح سجدہ گہِ نیاز میں

سارے جہاں کی قوتیں تھوڑے لہو میں بھر گئیں
دل بھی عجیب راز ہے ہستی کارساز میں

دیکھیں عطا ہو اب کسے دل کا یہ جامِ انبساط
بادہ وہ بھر رہا ہے پھر مستِ نگاہِ ناز میں

چھیڑو نہ میرے دل کو اب تم کو بھی ہوگی برہمی
نغمۂ غم ہے مستتر دل کے ہر ایک ساز میں

غزل جناب خان بہادر نواب احمد حسین خاں صاحب مذاقؔ

او۔ بی۔ ای۔ آف پریاواں ضلع پرتاب گڈھ

فتنہ گر کو نہ کبھی نام وفا یاد پڑا — جب پڑا یاد تو بس طور جفا یاد پڑا
حق کو بھولے تھے تعیش کی تھی غفلت طاری — جب پڑی سر پہ مصیبت تو خدا یاد پڑا
کچھ نہ پوچھو سبب نالہ و آہ و زاری — کیا بتاؤں دلِ پُر درد کو کیا یاد پڑا

قدر ہر چیز کی ہے بعد میں اس شے کے مذاقؔ
پیری آئی تو جوانی کا مزا یاد پڑا

کیونکر ہو کوئی مثل ترا حور و پری میں — یکتائی کی ہے شان تری جلوہ گری میں
پرتو ترا ہر سمت ہے ہر شے میں تری شان — پردہ نہیں حائل ہے تری جلوہ گری میں
کس وجہ سے آخر یہ پریشان ہیں دونوں — کیا چھیڑ ہوئی زلف و نسیمِ سحری میں
حلقے میں آئمہ کے ہے پیغمبر ذیشاں — بیٹھا ہے شہنشاہ امم بارہ دری میں
صندل میری پیشانی پہ خود اس نے لگایا — تقدیر سے دولت یہ ملی دردسری میں

سمجھوں میں اسے جنت فردوس سے اعلیٰ
مدفن ہو مذاقؔ اپنا اگر ارضِ غری میں

ہر اک جا اس کا جلوہ اور نشاں معلوم ہوتا ہے — مگر با ایں ہمہ وہ لامکاں معلوم ہوتا ہے
حرم میں دیر میں مسجد میں مندر میں کلیسا میں — جہاں دیکھا اسی کا آستاں معلوم ہوتا ہے
اگر انساں کی چشمِ بصیرت صاف و روشن ہے — تو اپنے دل ہی میں سارا جہاں معلوم ہوتا ہے
بہار آئی ہے وہ توبہ شکن گلزار عالم میں — کہ ہر شیخ حرم پیرِ مغاں معلوم ہوتا ہے
فراقِ یار میں اتنا بڑھا ضعفِ تنِ لاغر — کہ اب یہ ضعف بھی بارِ گراں معلوم ہوتا ہے

جسے دیکھا ہے تم نے سر بصحرا صورت مجنوں
مجھے تو وہ مذاقِ ناتواں معلوم ہوتا ہے

ساقی پلا وہ بادۂ وحدت اثر مجھے — تیرے سوا رہے نہ کسی کی خبر مجھے
کیسی زمیں کہاں کا فلک کس کی ہست و بود — یہ سب فریب دیتی ہے میری نظر مجھے
آنکھیں کھلی ہوئی تھیں تو کچھ سوجھتا نہ تھا — جب بند ہو گئیں تو پڑا سب نظر مجھے
دامانِ اہلبیت نہ چھوڑوں گا اے مذاقؔ
ان کی ولا دلائے گی جنت میں گھر مجھے

غزل جناب آنسہ نجمہ تصدق ایم اے۔ بی ٹی

علی گڈھ

مٹی جا رہی ہوں بنی جا رہی ہوں — ترے عشق میں کیا ہوئی جا رہی ہوں
ابد تک جہاں موت آنے نہ پائے — لٹانے وہاں زندگی جا رہی ہوں
وہی گیت حاصل ہے شاید سفر کا — جسے گنگناتی چلی جا رہی ہوں
مجھے کھو دیا دردِ فرقت نے ایسا — خود اپنی نظر سے چھپی جا رہی ہوں
نہ اس بزم کا حال پوچھو جہاں میں — بصد ہوش و صد بیخودی جا رہی ہوں
تری جستجو میں بہت پھیر کھا کے — میں خود اپنی منزل ہوئی جا رہی ہوں
دلوں سے جہاں سے زمان و مکاں سے — میں رسم وفا ہوں اٹھی جا رہی ہوں
ترے عشق کی بن گئی ہوں کہانی — کہی جا رہی ہوں سنی جا رہی ہوں
محبت کی میں شام فرقت ہوں نجمہؔ
مصیبت سے کٹتی چلی جا رہی ہوں

غزل جناب لالہ دوارکا پرشاد صاحب نشاط رئیس الہ آباد

نالہ و فریاد کرنے کا نیا انداز ہے
درد اٹھا ہے تو اب بیٹھی ہوئی آواز ہے

پُر اثر کتنی دلِ مجروح کی آواز ہے
ٹوٹ کر بھی جو صدا دیتا ہے یہ وہ ساز ہے

کوئی جانے کوئی سمجھے کوئی کھوسے کس طرح
دل مرے پہلو میں ہے دل میں تمہارا راز ہے

کیوں کروں برباد اس کو یہ نہیں تو کچھ نہیں
دل ہی تک الفت میں سارا لطفِ سوز و ساز ہے

نالہ و شیون سے گو رسوائے عالم کر دیا
شکر کرتا ہوں کہ دل کا راز پھر بھی راز ہے

اور کوئی فرطِ غم میں پوچھنے والا نہیں
درد دل ہمدرد ہے سوزِ جگر دم ساز ہے

کیا کریں اہلِ محبت زندگی کا اعتبار
دم جسے کہتے ہیں وہ چلتا ہوا دم ساز ہے

خوش نوائی پر توجہ اے دلِ شیدا نہ کر
ہر صدائے حسن تیری موت کی آواز ہے

جو نہ ظاہر ہو کسی پر ہے وہی در اصل بات
جو نہ کھولے سے کھلے وہ فی الحقیقت راز ہے

کس لئے غمگیں ہوں غم سے اہلِ الفت اے نشاطؔ
سوز بھی ان کے سمجھ میں اک طرح کا ساز ہے

غزل جناب مولوی حکیم محمد یونس صاحب نظامی الہ آبادی

رشکِ صد لالہ زار ہیں دونوں　　دل جگر داغدار ہیں دونوں
دل بھی زخمی، جگر بھی ہے زخمی　　اِک نظر کے شکار ہیں دونوں
خاکِ پروانہ، تربتِ مجنوں　　عشق کی یادگار ہیں دونوں
رند دنیا میں خُلد میں زاہد　　الغرض بادہ خوار ہیں دونوں
شمع محفل میں، یار خلوت میں　　کس لئے اشکبار ہیں دونوں
دامنِ عشق، جامۂ ہستی　　اے جنوں تار تار ہیں دونوں
وہ جفاؤں میں، ہم وفاؤں میں　　صاحبِ اختیار ہیں دونوں
تیرا دیوانہ، اور بخیہ گر　　برسرِ روزگار ہیں دونوں
یاں نظامی، کلیم ایمن میں
طالبِ دیدِ یار ہیں دونوں

غزل جناب ناخدائے سخن تاج الشعرا فصیح العصر حضرت نوح ناروی

مراتب مساوی مدارج برابر نہ ان میں کوئی کم نہ کوئی زیادہ
ادا ہے جو اپنی جگہ شاہزادی تو اریاں ہے اپنی جگہ شاہزادہ
بُری یا بھلی آخری رائے اپنی وہ تحریر فرمائیں گے بالارادہ
مری عاشقی کی بیاضِ وفا میں پڑا ہے ابھی تک ورق ایک سادہ
اگر حسن سے کچھ نہ امداد پاؤں تو پائے طلب کیا سمجھ کر بڑھاؤں
کھڑا ہوں تردد میں پیشِ نظر ہے تمنا کی وادی محبت کا جادہ
شرارت کو نسبت متانت سے کیا ہے شرارت الگ ہے متانت جدا ہے
کبھی جو نہ بدلے وہ نیت ہماری جو دم بھر میں پلٹے وہ تیرا ارادہ

کبھی لطف کو تیرے ساقی نہ بھولوں نشاط و مسرت کے جھولے میں جھولوں
فزوں حس سے کچھ اور بدمستیاں ہوں اُٹھاؤں وہ ساغر پلا دے وہ بادہ

کوئی جانے کیا میرے دل کی حقیقت یہی رازِ قدرت یہی سرِ فطرت
نہ سمجھو تو سارے زمانے سے کم ہے جو سمجھو تو سارے جہاں سے زیادہ

سفارش گذارش بھی بے کار ٹھہری نہ پھر عہد ٹوٹا نہ پھر بات بدلی
جو انکار ملنے سے وہ کر چکے تھے کئے جا رہے ہیں اُسی کا اعادہ

بدلتی رہیں صورتیں میرے دل کی نئی چال شطرنج الفت کی دیکھی
کہ رُخ ہے یہی اور فرزیں بھی ہے یہی بادشہ ہے یہی ہے پیادہ

یہ ننھے سے پیکاں یہ چھوٹے سے ناوک جو نکلے تو فوراً ہی پہنچے جگر تک
مرے تجربے میں ہیں دونوں برابر کسی کی کماں اور تیر اکیادہ

محبت کے آداب کیا کوئی جانے نہیں ماننا خیر کوئی نہ مانے
ہمیں دل بھی پیارا بہت کچھ ہے لیکن یہ تم سے ہے کم تم ہو اس سے زیادہ

بہار آئی نکھری درختوں کی صورت سجی ڈالی ڈالی تر ہے حسن و زینت
ادھر نکہتِ گل بنی شاہزادی اُدھر رنگِ گلشن بنا شاہزادہ

چلے جائیں کعبے سے ہم بت کدے کو پھر آئندہ جو کچھ بھی تقدیر میں ہو
یہ ہے مستقل رائے محکم ہے نیت یہ مضبوط ہے قصد پختہ ارادہ

مجازی کے اسرار تک پانے والے حقیقت کے انوار سب سے جدا لے
الٰہی چلوں کون سی رہ گذر پر ادھر ایک رستہ اُدھر ایک جادہ

مسلسل جفاؤں سے گھبرا گیا میں زمانے کے ہاتھوں سے تنگ آ گیا میں
کوئی مجھ کو ایسا ٹھکانا بتا دے جہاں رنج کم ہو خوشی ہو زیادہ

کہاں تو ہے روپوش اے میرے ساقی کہ اچھی نہیں اس قدر بد مذاقی
اُٹھا رُخ سے پردہ دکھا اپنا جلوہ منگا جلد مینا پلا مجھ کو بادہ

ادھر کے اُدھر کے یہاں کے وہاں کے سما جائیں اسرار دونوں جہاں کے
کوئی تنگ تر میرے دل کو نہ سمجھے ضرورت سے یہ گھر سوا ہے کشادہ

ضرورت نہیں کچھ انھیں چھیڑ دینے کی سنبھل جائیگا دل بہل جائے گا جی
وہ جس التجا پر ہوں ناراض مجھ سے کروں کس لئے میں اسی کا اعادہ
نہ اس کو غرض غور و تاخیر سے کچھ نہ مطلب اسے فکر و تدبیر سے کچھ
جوانی کی ہر بات ہے بے تامل محبت کا ہر کام ہے بے ارادہ
بڑے شوخ باطن بڑے کج ادا ہیں ترحم نہیں ان کے دل میں ذرا بھی
بظاہر جو دیکھے تو کوئی یہ جانے خیالات سیدھے مزاج ان کا سادہ
طبیعت ہوئی رنج و ایذا کی خوگر مزا جب ہے پاؤں نہ آرام دم بھر
مجھے چاہئے کوئی معشوق ایسا کرے رحم کم قہر ڈھائے زیادہ
وسیلہ ہے لازم پئے اوج خاطر بغیر اس کے پہنچا نہ کوئی مسافر
حقیقت کی منزل نظر آئے مجھ کو اگر میں کروں طے مجازی کا جادہ
وفا و محبت کی دشوار راہیں کروں رنج و آزار پر کیوں نگاہیں
کہ ہر خار صحرا ہے مشتاق بے حد مناسب یہی ہے چلوں پا پیادہ
اٹھیں چرخ پر کالی کالی گھٹائیں چلیں یک بیک ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں
مشیت کو بھی آج مدنظر ہے کہ بھر جائیں ساغر چھلک جائے بادہ
وہی تیرا گریہ وہی تیری زاری کبھی اشک ریزی کبھی اشکباری
ہوا ہم کو اے نوح معلوم اس سے کہ طوفاں اٹھانے کا پھر ہے ارادہ

خمسہ بر غزل اعلیٰحضرت حضور پرنور عالی جناب نواب میر عثمان علیخاں صاحب خلد اللہ ملکہٗ
فرماں روائے حیدر آباد دکن و برار
از
حضرت نوحؔ ناروی

نشاطِ روح فزا جامِ خوشگوار میں ہے — سرور میں ہے جو عالم وہی خمار میں ہے
غرض ہوائے مسرّت اب اختیار میں ہے — عجیب نغمۂ بلبل بھی مرغزار میں ہے
گلوں کا رنگ بھی نکھرا ہوا بہار میں ہے

دمِ حیات کہاں تھا و فورِ غم سے چین — پسِ ممات رہا دور دل سے میرے چین
نہ کچھ سکون ملا اب مجھے نہ پہلے چین — یہ یاد آگئی کس کی کہ کر دیا بے چین
تڑپتی روح بھی کھنچتی ہوئی مزار میں ہے

سرور و کیفیت کے پرچے پڑے ہوئے ایسے — کبھی نہ جانے اگر کوئی جاننا چاہے
کہاں مجالِ تصور کہ فکر و غور کرے — ذرا تو پوچھ لے ساقی سے راز کو اسکے
عجیب لذّتِ مستی بھی جو خمار میں ہے

نظر کو دل کو طبیعت کو شوق و ارماں کو — یہ ٹیک وقت یہ خوش کن فضا مبارک ہو
اُٹھاؤ لطفِ نوازش بھی دادِ لطف بھی دو — نشاط و عیش کا جلوہ دکھا رہی ہے سنو
صبا جو محوِ خرام آج لالہ زار میں ہے

مقابلے کے لئے کوئی آئے کیا امکاں — اِدھر جو ایک ہے یشاں تو لاکھ اُدھر حیراں
اُٹھایا خون کی موجوں نے نوحؔ کا طوفاں — یہ قبضہ کہتا ہے سن لے تو آج اے عثماں
نویدِ فتح بھی پوشیدہ ذوالفقار میں ہے

غزل جناب سید اسمٰعیل حسین خاں نیّر اکبرآبادی

نالۂ و فریاد کا اے دل کہاں ہنگام ہے
سانس لیتا ہوں مگر وہ بھی برائے نام ہے
کیا تعجب عشق کا جذبہ اگر بدنام ہے
جو طریقِ خاص تھا اب وہ شعارِ عام ہے
دیکھنے آئے ہیں وہ جب نزع کا ہنگام ہے
میری جانب سے کوئی کہہ دے کہ اب آرام ہے
یادگارِ غم بس اک شوریدگی باقی ہے اب
در کسی کا ہو مجھے سر پھوڑنے سے کام ہے
راز رہ سکتا تھا کب تک ارتباطِ حسن و عشق
مرنے والے کی زباں پر آج اُن کا نام ہے
مختصر سننے میں آئی ہے یونہیں تاریخ عشق
واہ سے آغاز ہے اور آہ پر انجام ہے
کٹ رہی ہے ہستیِ فانی کی منزل اس طرح
پیچھے پیچھے ہے اجل آگے خدا کا نام ہے
عشق کا تھا ایک یہ بھی جذبۂ بے اختیار
آنکھ سے آنسو نکل آئے تو کیا الزام ہے
دل سے گرم و سرد کا احساس تک جاتا رہا
زندگی یہ ہے تو نیّر موت کس کا نام ہے

"غزل گو کا ملکی سیاسیات پر تبصرہ"

جناب سید احمد مجتبیٰ صاحب وامق ایڈووکیٹ جونپور

ویراں دل میں آکے وہ مہماں ہوا تو کیا
مرنے کے بعد زیست کا ساماں ہوا تو کیا

اپنا علاج تنگیٔ دل وہ نہ کر سکے
میرا علاج تنگیٔ داماں ہوا تو کیا

جب میرے واسطے درِ میخانہ بند ہے
صہبا میں غرق عالمِ امکاں ہوا تو کیا

جب بال و پر ہی نذرِ قفس ہو کے رہ گئے
صحنِ چمن میں شورِ بہاراں ہوا تو کیا

کرنے کے بعد چور مرے دل کا آئینہ
کوئی شعاعِ مہر درخشاں ہوا تو کیا

اک عمر رکھ کے روح مری تشنۂ نشاط
مطرب بہ ساز و نغمہ نمایاں ہوا تو کیا

ٹوٹے پڑے ہیں سازِ محبت کے تار تار
اب نغمۂ حیات پر افشاں ہوا تو کیا

جب شوق انبساط ہی باقی نہیں رہا
ویرانۂ حیات گلستاں ہوا تو کیا

عاشق کی تیرہ بختی کا عالم وہی رہا
ظلمت کدہ میں چشمۂ حیواں ہوا تو کیا

شاعر کے ساتھ بول اٹھے سازِ حسن بھی
وامق اکیلا تو ہی غزل خواں ہوا تو کیا

غزل جناب وحشی صاحب کانپوری

شتاب آکہ ابھی روح چشم زار میں ہے
ابھی ذرا سی جھلک چشم انتظار میں ہے

خود اضطراب کا عالم حریم یار میں ہے
نہ جانے سحر یہ کیا چشم اشکبار میں ہے

نہ کھینچ خلد بریں کی طرف مجھے واعظ
کہ میرے خلد کا نقشہ خیال یار میں ہے

وہ رند جرعہ کش ساغر رضا ہوں میں
کہ میرا جبر بھی میرے ہی اختیار میں ہے

کہاں مقیم ہوا جا کے کاروان عدم
یہ مرحلہ ابھی تک پردۂ غبار میں ہے

لرز رہا ہے جہنم بھی جس سے اے واعظ
وہ آگ عشق کے ہلکے سے اک شرار میں ہے

سنائیں آہ انھیں داستان دل کیونکر
شکستہ ساز کی آواز تار تار میں ہے

لگا دی آگ بیابان میں لالہ و گل نے
یہ کون شوخ نہاں پردۂ بہار میں ہے

بنا دیا مجھے وحشی یہ لغزش پا نے
کہ گام شوق مرا آج کوئے یار میں ہے

غزل جناب وزیر علی خاں صاحب وزیر دریاآباد الہ آباد

ہوش رہے نہ تا ابد ایسی مجھے پلائے جا
ساقیِ بزم آرزو شانِ کرم دکھائے جا

رنج و محن اُٹھائے جا چوٹ پہ چوٹ کھائے جا
درد اُٹھے تو اُف نہ کر دل کی کسک دبائے جا

روٹھیں اگر وہ ایک بار قدموں پہ گر ہزار بار
ہے یہی راز حسن و عشق جیسے بنے منائے جا

سینہ سے جب اُٹھے دھواں آنکھوں سے اشک ہوں رواں
خونِ جگر سے اپنے خود دل کی لگی بجھائے جا

ہمتِ دل کبھی نہ توڑ راہِ وفا سے منہ نہ موڑ
موت سے کھیلتا ہوا آگے قدم بڑھائے جا

جس میں گداز ہو نہ سوز ساز وہ ساز ہی نہیں
قلب و جگر میں آہ سے آگ سی اک لگائے جا

تابِ نظر نہیں سہی جذب و اثر نہیں سہی
اس کے حریم ناز کے پردے مگر اُٹھائے جا

لطفِ حیات اے حبیب مجھکو اسی میں ہے نصیب
مشقِ ستم سے روز و شب دل کو مرے دکھائے جا

سوز و گداز ہی سے ہے عیش و نشاطِ زندگی
تجھ کو قسم ہے شمعِ حسن دل کو مرے جلائے جا

عشق و فا صفات سے اپنے تصورات سے
شامِ فراق میں وزیر محفلِ دل سجائے جا

غزل جناب ہادی صاحب ہادیؔ ایڈوکیٹ مچھلی شہری

کہنے کو تو کیا کچھ ترے جلووں میں نہیں ہے
بیدرد بتا میری تمنا بھی کہیں ہے

اتنا تو سمجھتا ہوں کہ سجدے میں جبیں ہے
اب تیرے تصور میں نہ دنیا ہے نہ دیں ہے

سجدے کے لئے کیوں مری بیتاب جبیں ہے
ایسا تو نہیں منزلِ مقصود یہیں ہے

اک جلوۂ رنگیں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے
نادیدہ نگاہوں کو یہ دنیا ہے وہ دیں ہے

ہر ذرّے میں ہونے کا ترے مجھکو یقیں ہے
دنیا سے تو پنہاں ہے مگر مجھ سے نہیں ہے

تو ڈھونڈھ رہا ہے حرم و دیر میں جس کو
زاہد مرے ٹوٹے ہوئے دل میں وہ مکیں ہے

اللہ رے اس دیدۂ حیراں کی مصیبت
جس نے تجھے دیکھا بھی ہے دیکھا بھی نہیں ہے

اتنی بھی نہ مایوس شبِ غم ہو کسی کی
مرنا بھی میسر نہیں جس کا کہ یقیں ہے

کچھ منزلیں یہ بھی رہِ عرفاں میں تھیں شاید
اب دل کو خیالِ حرم و دیر نہیں ہے

ہاں بندگیِ شوق کے جوہر نہ مٹیں گے
ہر ذرّے میں پنہاں مری تصویرِ جبیں ہے

یہ ربط کہ بے تیرے نہیں مجھکو ذرا چین
یہ ضبط کہ گویا مجھے الفت بھی نہیں ہے

وعدے کا ترے عہد شکن وعدہ فراموش
تو جتنا سمجھ لے مجھے اتنا ہی یقیں ہے

یہ بعد کہ ہستی تری اب تک نہ میں سمجھا
یہ قرب کہ حائل رگِ گردن بھی نہیں ہے

فطرت کبھی وعدہ شکنی کی بھی ہے بدلی
تم پوچھتے ہو مجھ سے تو کہتا ہوں یقیں ہے

وہ پوچھتے ہیں مجھ سے میں کیا اُن سے بتاؤں
گویا مری امید کی صورت ہی نہیں ہے

سجدوں کی مرے شرم ہے اللہ ترے ہاتھ
ہر ذرۂ در اس کا طلبگار نہیں ہے

وارستگیِ دل کا ہو کیونکر مجھے دعوےٰ
کس طرح کہوں تیری تمنا بھی نہیں ہے

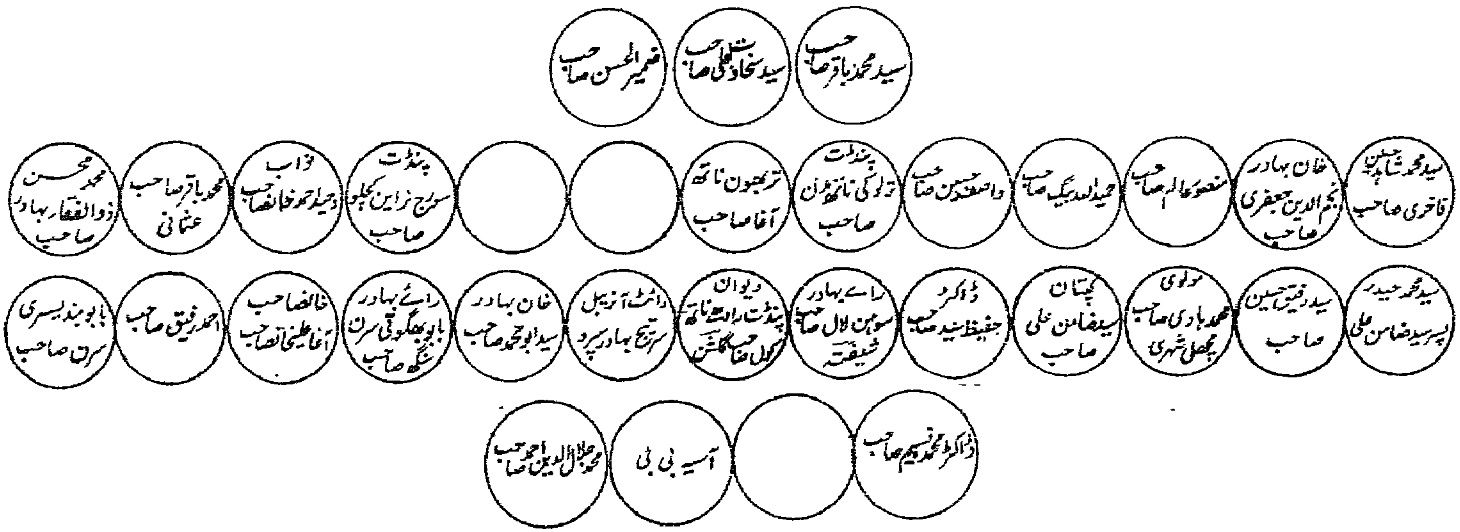
پیوست ہے رگ رگ میں مری تیری تمنا
تو ہاتھ جہاں رکھ دے ترا درد وہیں ہے

معلوم نہیں اب بھی حجابات ہیں کتنے
ہادیؔ مجھے کیا جلوۂ جاناں کا یقیں ہے

تمــــــــت بالخیــــــــر

اراکین و عہدہ داران جلسہ افتتاحیہ انجمن روح ادب (رجسٹرڈ)

منعقدہ ۲۱ دسمبر ۱۹۴۲ء بمقام زمیندار ایسوسی ایشن ہال۔ الہ آباد (یو پی)





گروپ اراکین و عہدہ داران انجمن روح ادب